جموں کی تمدنی تاریخ

کے ڈی مینی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

جموں کی تمدنی تاریخ

Jammu Ki
Tamaduni Tareekh

صوبۂ جموں کی تمدنی تاریخ

کے۔ڈی۔ مینی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

فہرست

......☆......

حرفِ اوّل

زندہ قوموں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ اپنے حال و مستقبل کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی سے جڑی زبان، رہن سہن، لباس، روایات، فنون لطیفہ، ادب غرض تہذیب و تمدن سے وابستہ ہر شئے کے تحفظ اور اسے دوسری نسل تک منتقل کرنے کے لئے مناسب انتظام و انصرام کرتی ہیں تا کہ ان کا ثقافتی ورثہ زمانے کے نشیب و فراز سے محفوظ رہ سکے۔ اسی نظریئے کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اکادمی کی ایڈوایزری سب کمیٹی میں یہ طے پایا تھا کہ ''جموں کی تمدنی تاریخ'' اور ''کشمیر کی تمدنی تاریخ'' مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

اس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر ''جموں کی تمدنی تاریخ'' لکھنے کا کام نامور محقق اور ادیب جناب کے۔ ڈی مینی کو تفویض کیا گیا۔ موصوف نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے ''جموں کی تمدنی تاریخ'' تالیف کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جموں کے خطے میں ڈوگری، گوجری، پہاڑی اور دیگر قومیں صدیوں سے آباد ہیں اور اپنے تہذیبی اور تمدنی کلچر کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور منفرد بھی۔ اس لئے ایک مورخ کے لئے یہ آسان مرحلہ نہیں تھا کہ وہ پورے خطے کی تہذیب و تمدن کا احاطہ کریں۔ لیکن یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر جناب کے۔ ڈی مینی اس پروجیکٹ کو ہاتھ میں نہیں لیتے تو شاید اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے میں ابھی ایک طویل عرصہ لگتا۔

کے ڈی مینی نے ''جموں کی تمدنی تاریخ'' کے اہم گوشوں پر مفصل روشنی ڈالتے

ہوئے مستقبل کے محققین کے لئے راہیں روشن کی ہیں جس کے لئے موصوف کی کاوشوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اگر چہ انہوں نے کئی انگریزی اور اردو کتابیں جموں و کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے لکھیں ہیں لیکن ''جموں کی تمدنی تاریخ'' ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر چہ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ مذکورہ پروجیکٹ شائع ہونے میں قدرے تاخیر ہوئی بقول مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

ہم شکر گزار ہیں سیکریٹری اکادمی جناب بھرت سنگھ منہاس کے جنہوں نے اکادمی کا چارج سنبھالتے ہی اکادمی کی مطبوعات کو شائع کرانے میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ان کی ہدایات کی بدولت ہی اکادمی کی مطبوعات سلسلہ وار منصۂ شہود پر آرہی ہیں۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لئے شعبہ اردو کے اراکین سلیم ساغر، ڈاکٹر محمد اقبال لون اور امتیاز احمد شرقی نے کڑی محنت کی، جس کے لئے یہ تینوں شاباشی کے مستحق ہیں۔

مدیر شیرازہ اردو
محمد سلیم سالکؔ

پیش گفتار

سطحی طور پر دیکھا جائے تو کسی بھی علاقے کے ماضی کے تعارُف کے لئے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ کسی بھی علاقے کے لوگوں کے بارے میں جاننے کے لئے وہاں کی روایات، لوک رنگ، جینے کے ڈھنگ، فکری رجحانات اور عوام کی سوچوں، وطیروں اور اُمنگوں کو سمجھنا اور وہاں کی تمدنی میراث کے آئینے میں جھانکنا ضروری ہوجاتا ہے۔ وہاں کی تہذیب و ثقافت کی آگہی لازمی ہوجاتی ہے، جو مکینوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ تاریخ اگر بادشاہوں اور درباریوں سے وابستہ ہے تو بادشاہ کی قلمرو میں رہنے والی رعایا جن میں کسان، مزدور، تاجر، فنکار، امیر، غریب، اچھے، بُرے یعنی سماج کے تمام طبقوں اور فرقوں کی سوچوں کی خوشبو کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے اور عوام کی خوشیوں اور غموں، دُکھ اور سُکھ، عروج اور زوال کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔

تمدن اُن پودوں کی طرح نہیں ہوتا جو کسی باغ یا مخصوص جگہوں پر لگائے جاتے ہیں بلکہ یہ اُن خودرو پودوں کی مانند ہوتا ہے جو پہاڑوں، جنگلوں، بستیوں، گھاٹیوں، شہروں اور قصبوں میں اُگتے ہیں اور سدا بہار رہتے ہیں۔ تمدن محلوں کی بجائے جھونپڑیوں اور غریبوں کے گھروں میں پنپتا ہے جس سے عوام کی زندگی، گیت سنگیت، کھیل کود، شادی غم اور رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ اگر جنگ و جدل، فتح و شکست کا نام ہے تو تمدن عوامی خوشیوں، مسرّتوں، میلوں، تہواروں، لوک رنگ، لوک ورثے، محبت اور مُروّت جیسے

جذبوں سے لبریز شے ہے جس سے سکونِ قلب اور روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ تہذیب وتمدن وہ شعور ہے جو صدیوں کی سوچوں اور تجربوں کے بعد زندگی کو خوبصورت بنانے میں مددگار اور معاون ثابت ہوتا ہے۔ تمدن کی جڑیں زمین کی سطح پر نہیں ہوتی جنہیں اکھاڑا جا سکے بلکہ تمدن عوام کے دِلوں سے ہمکتا ہے، روح میں پیوست ہوتا ہے اور اُن کی ذات میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

صوبۂ جموں کا تمدن بھی عوامی افکار وتجربات کا نتیجہ ہے جس میں عوامی زندگی بولتی اور سانس لیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ 1947ء کے تقسیم کے حادثے نے صوبۂ جموں کو دوحصوں میں بانٹ دیا ورنہ کنٹرول لائن کے آر پار وہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے ہمسائے، نگہبان، دوست اور مربّی ہوا کرتے تھے۔ آج بھی آر پار لوگوں نے اپنی تمدنی میراث کو اُسی طرح سنبھال کر رکھا ہوا ہے جیسے پرانے زمانے میں لوگ چاندی کے سکّوں کو لکڑی کے صندوقوں میں سنبھال کر رکھتے تھے۔ کیونکہ علاقوں کا جغرافیہ تو بدلا جا سکتا ہے لیکن مشترکہ تمدنی میراث کو نہیں بانٹا جا سکتا۔ صوبۂ جموں کا تاریخی پسِ منظر، تمدنی ورثہ، ثقافتی تشخص، تہذیبی علامتیں، بول چال، کھانا پینا، آرائش وزیبائش، معاش، مشغلے، میلے، تہوار اور زبانیں آج بھی کنٹرول لائن کے دونوں طرف عوام کی سانجھی میراث ہیں۔ صوبۂ جموں میں کنٹرول لائن کے اُس پار بھی پہاڑی، ڈوگری اور گوجری زبانیں بولی جاتی ہیں اور اِس طرف بھی عوام یہی زبانیں بولتے ہیں۔

اِدھر بھی اور اُدھر بھی درگاہیں اور خانقاہیں ایسی ہیں جن کے عقیدت مند آر پار بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی اور وہاں بھی چھنج، بینی، بگدر، کبڈی اور کُشتیاں جیسے کھیل مقبول ہیں۔ آج بھی دونوں طرف کے عوام کے پہناوے، آرائش، زیبائش، عادات، مشغلوں اور ذائقوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ لوک گیت، باریں، ٹپے اور شادی بیاہ کے گیت ایک جیسے ہیں۔ کھڑی شریف، میرپور کے حضرت میاں محمد بخشؒ کا صوفیانہ کلام صوبہ جموں کے آس پاس حصے میں اُتنا ہی مقبول ہے جتنا اُس پار ہے۔ اسی طرح حضرت میاں

نظام الدین لاروئیؒ، خدا بخش زار، سائیں قادر بخش اور سائیں فقیرالدین کا صوفیانہ کلام کنٹرول لائن کے اُس پار عوام کے دلوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ صوبہ کے اِس طرف اگر پدما سچدیو، رام ناتھ شاستری اور جوبن سنگھ جیسے ڈوگری شاعر اور ادیب، اقبال ملنگامی، راشد جہانگیر، غلام نبی ڈول وال جیسے عوامی صداکار ہیں، راجہ نذر بونیاری جیسا محقق ہے، اقبال عظیم، امتیاز نسیم ہاشمی جیسے گوجری اور پہاڑی کے شاعر ہیں، تو کنٹرول لائن کی دوسری طرف علی عدالت جیسا پہاڑی ناول نگار اور فلم کار، شمس الرحمان جیسا دانشور، رانا فضل راجوروی جیسا گوجری اور پہاڑی شاعر، محمد رزاق پچھنگ جیسا گائک ہمیں ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں۔ اُدھر ملکہ پکھراج کے گائے ہوئے پہاڑی اور ڈوگری گیت ہماری تمدنی میراث میں شامل ہوتے ہیں۔

2000ء کے بعد جب پونچھ راولاکوٹ شاہراہ سے لوگ آر پار آنے جانے لگے تو ایسا لگا کہ ہمارے درمیان کچھ بھی تو نہیں بدلا، کیونکہ آج بھی ہماری مشترکہ تمدنی میراث ہمیں آپس میں جوڑتی ہے۔ تمدن کا راستہ امن وسکون کی طرف جاتا ہے۔ پُرخلوص جذبوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ تسکینِ قلب کا سبب بنتا ہے۔

یہ تہذیبی اور تمدنی رشتے ہمیں جوڑتے ہیں، پیچھے سے آواز دیتے ہیں۔ آج بھی ہمارے درمیان جنگلی پھولوں کی مہک بکھیرتے ہیں۔ اس لئے کتاب ''صوبۂ جموں کی تمدنی تاریخ'' مرّتب کرتے وقت صوبہ جموں کے آر پار دونوں حصوں کی مشترکہ تمدنی میراث کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں کشتواڑی، بھدرواہی، ڈوگری، پہاڑی، گوجری اور سدھنتی کلچر اور تمدن پر تحقیق کر کے شیرازہ بندی کی گئی ہے اور جس قدر ممکن ہو سکا ان علاقوں کے قلم کاروں سے رابطے کر کے اور اُن کی تمدن پر تحریروں سے استفادہ کر کے یہ کتاب مرّتب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ جموں کی تمدنی میراث کسی ایک کلچر کا نام نہیں بلکہ یہ میراث مختلف تمدنی اکائیوں کے باہمی میل سے اُبھرتی ہے۔ جہاں ڈوگری تہذیب اپنی

پہچان رکھتی ہے وہیں پہاڑی، گوجری، پوگلی، بھدرواہی، کشتواڑی اور گدی تمدن بھی اپنی منفرد شناخت کے ساتھ پنپ رہے ہیں۔ کیوں کہ تمدن ٹکراؤ کی نہیں جوڑنے کی علامت ہے۔ایک دوسرے سے مل کر رہنا،سوچ اورادراک کو سمجھنا، بلاامتیاز و مذہب وملت خوشیاں اورغم بانٹنا،ایک دوسرے کا ساتھ دینا،ساتھ جینا اور ساتھ والے ہمسائے کی تمدنی میراث سے مسرور ہونا ہی صوبۂ جموں کا وہ مخلوط اور رنگا رنگ تمدنی ورثہ ہے جو سینکڑوں برسوں کی سوچوں اور تجربوں کا ثمرہ ہے۔

صوبۂ جموں کی مختلف تمدنی اکائیوں پر اگرچہ علاحدہ علاحدہ سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جبکہ کنٹرول لائن کے اُس پار بھی ڈاکٹر صغیر خان، محسن شکیل، ظفر حسین ظفر اور علی عدالت نے اچھا کام کیا ہے لیکن وہ ایک مخصوص زبان والے خطے تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ پورے صوبۂ جموں کی تمدنی تاریخ پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں مختلف سمتوں سے تہذیب کے آثار ملتے ہیں اور یہ کتاب صوبہ کی تمدنی وراثت کے اُس گلدستے کی مانند اُبھرتی ہے جس میں مختلف رنگوں کے پھول سجے ہوئے ہیں اور ہر پھول اپنی زیبائی، رنگت اور مہک سے اس گلدستے کو خوبصورت بنا رہی ہے۔ کتاب میں صوبۂ جموں کے ہر خطے کے تمدنی ورثے پر تفصیل سے اور تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ جہاں تک زبانوں اور بولیوں کا تعلق ہے اس کتاب میں صرف اُن ہی زبانوں اور بولیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی جڑیں اس صوبے کے تمدنی ورثے کے اندر پیوست ہیں۔امید ہے کہ صوبۂ جموں کے مجموعی تمدن کو سمجھنے میں یہ کتاب سنگِ میل ثابت ہوگی۔

خوش دیو مینی (کے ڈی مینی)
پونچھ
جموں وکشمیر

صوبۂ جموں کی تشکیل

1846ء سے قبل صوبۂ جموں کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ یہ خطہ بائیس چھوٹی بڑی جاگیروں، راجواڑوں اور ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جیسے ریاست بھمبر، کھڑ کریانی، بسوہلی، بھدرواہ، سمرتھا، لکھن پور، سانبہ، منکوٹ، باہو، جسر وٹہ، چینی، کشتواڑ، تری کٹا، اکھنور، انبالا، ریاسی، میرپور، راجوری، بدھل اور ریاست پونچھ۔ یہ نیم آزاد علاقے تھے جہاں کے راجے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومتیں چلاتے تھے۔ نہ تو ان ریاستوں کے ایک دوسرے کے ساتھ روابط تھے اور نہ ہی مرکزی انتظامیہ والی کوئی سوچ تھی۔

اُنیسویں صدی میں پنجاب میں برٹش حکومت اور خالصہ سرکار کے درمیان ایک فیصلہ کُن جنگ کے بعد جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے بیچ بچاؤ کر کے دونوں کے درمیان ایک معاہدہ کروایا جس کے تحت پنجاب سرکار کو ڈیڑھ کروڑ روپے تاوان دینا مقصود تھا لیکن اتنی رقم موجود نہ تھی۔ چنانچہ کچھ علاقے پنجاب سرکار نے انگریزوں کو دے دیئے جن میں جموں و کشمیر بھی شامل تھا اور پھر یہ علاقہ انگریز حکومت نے جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ 16/مارچ کو امرتسر معاہدے کے تحت 75/لاکھ نانک شاہی روپے میں دے دیا اور گلاب سنگھ کو نئی ریاست جموں و کشمیر کا مہاراجہ تسلیم کر لیا۔ یہ ریاست جموں خطہ، وادیٔ کشمیر، لداخ، گلگت اور بلتستان پر مشتمل تھی۔

اقتدار میں آنے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر کو انتظامی طور پر دو صوبوں میں تقسیم کر دیا (یعنی صوبۂ جموں اور صوبۂ کشمیر) اور صوبہ جموں کی اُن تمام

ریاستوں، راجواڑوں اور جاگیروں کو نئے صوبہ میں شامل کرلیا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔لہٰذا ریاست پونچھ، جاگیر بھدرواہ اور چینینی کو چھوڑ کر باقی سب راجواڑوں اور جاگیروں کو تحلیل کر کے صوبہ جموں کا حصہ بنادیا۔

صوبۂ جموں نئی ریاست جموں و کشمیر کے 14.1 فی صد رقبے کو محیط تھا اور ریاست کی 49.02 فی صد آبادی یہاں مکین تھی۔

اگر ریاست کے علاقہ گلگت، بلتستان اور لداخ کو باہر رکھا جائے تو صوبہ جموں کا رقبہ وادیٔ کشمیر کے مقابلے میں 59.9 فی صد بنتا ہے۔

1947ء سے قبل صوبۂ جموں کا رقبہ 12430 مربع میل تھا۔اس صوبے کے شمال اور شمال مغرب میں پیر پنجال کی دوسری جانب وادیٔ کشمیر واقع ہے۔شمال مشرق میں صوبہ کی سرحدیں ہماچل پردیش کے ضلع چمبا سے ملتی ہیں جبکہ شمال کی جانب لداخ کا زانسکار علاقہ پڑتا ہے۔جنوب میں مغربی پنجاب کا علاقہ گُجر خان کی سرحدیں میر پور اور کوٹلی سے ملتی ہیں اور جموں کٹھوعہ کی سرحدیں سیال کوٹ اور شکر گڑھ علاقے سے ملتی ہیں۔اُدھر مغرب کی طرف سے دریائے جہلم صوبۂ جموں کے علاقہ پونچھ کی تحصیل باغ اور سدھنتی سے میر پور کی طرف نکل جاتا ہے جس کے پار مغربی پنجاب کا علاقہ پوٹھوہار اور ضلع راولپنڈی واقع ہے۔

1901ء میں صوبۂ جموں چار وزارتوں یعنی جموں، جسر وٹہ (کٹھوعہ)، اودھمپور بمبھر اور جاگیر بھدرواہ، چینینی اور ریاست پونچھ پر مشتمل تھا۔ان علاقوں کے حکمران اور جاگیردار مہاراجہ کی حکومت کی زیرِ نگرانی کام کرتے تھے اور اُن کے ریاست کے ساتھ تعلقات رنبیر فیملی کوڈ کے تحت وضع کئے گئے تھے۔

1904ء میں صوبۂ جموں کی از سرِ نو تشکیل ہوئی تو ضلع بھمبر ختم کردیا گیا اور دو نئے اضلاع یعنی میر پور اور ریاسی وجود میں آئے اور پھر آگے چل کر 1920ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بھدرواہ جاگیر کو بھی صوبۂ جموں میں تحلیل کر کے اُسے ضلع اودھمپور کا حصہ بنادیا۔ 1901ء کی مُردم شماری کے مطابق صوبۂ جموں کا رقبہ 12378 مربع میل تھا اور

آبادی 1981433 افراد پر مشتمل تھی۔

1947ء کے واقعات کے بعد صوبہٴ جموں دو حصوں میں بٹ گیا اور درمیان میں کنٹرول لائن حائل ہوگئی۔ اس صوبے کے شمالی اور مشرقی علاقے یعنی کشتواڑ، ڈوڈہ، رام بن، اودھمپور، ریاسی، سانبہ اور کٹھوعہ کنٹرول لائن کے اِس طرف برقرار رہے۔

اُدھر پرانی ریاست پونچھ کی تحصیل باغ، سدھنتی آدھی تحصیل حویلی، راولاکوٹ، کہوٹہ اور تھکیالہ علاقہ کنٹرول لائن کے اُس پار آگیا جو 969 مربع میل علاقے کو محیط ہے جبکہ تحصیل مینڈھر اور آدھی تحصیل حویلی بشمول پونچھ شہر کا 658 مربع میل علاقہ سرحد کے اس طرف واقع ہے۔ اسی طرح کوٹلی بھمبر اور میر پور کے علاقے جو 1443 مربع میل پر پھیلے ہوئے تھے کنٹرول لائن کے پار رہ گئے اور ان علاقوں کے درمیان 203 کلومیٹر حدِ متارکہ حائل ہوگئی۔ اس طرح میر پور، بھمبر اور کوٹلی کے علاقے، راجوری، نوشہرہ اور سُندر بنی سے جُدا ہوگئے جبکہ اکھنور سے آگے 198 کلومیٹر انٹرنیشنل بارڈر ضلع جموں، سانبہ اور کٹھوعہ کو پاکستان کے علاقہ سیال کوٹ اور شکر گڑھ سے علاحدہ کرتا ہے۔

اس طرح صوبہٴ جموں کے 12439 کل مربع میل علاقے میں سے 2412 مربع میل علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ جبکہ موجودہ صوبہ جموں 10073 مربع میل علاقہ پر مشتمل ہے۔ اس تقسیم کے بعد صوبہٴ جموں کی تین بار تشکیل نو ہوئی اور اس وقت یہ صوبہ دس اضلاع یعنی ضلع کٹھوعہ، سانبہ، اودھم پور، جموں، کشتواڑ، ڈوڈہ، رام بن، ریاسی، راجوری اور پونچھ پر مشتمل ہے۔ اُدھر کنٹرول لائن کے اُس پار صوبہ جموں کے جو علاقے پاکستان کے کنٹرول میں آگئے تھے وہ اس وقت سات اضلاع پر مشتمل ہیں یعنی ضلع بھمبر، میر پور، کوٹلی باغ، سدھنتی، راولاکوٹ اور کہوٹہ فارورڈ۔

......☆......

جموں کی وجہِ تسمیہ *

تاریخِ ڈوگرہ دیس کے مطابق کسی زمانہ میں جموں کے علاقہ پر سورج بنسی خاندان کے راجہ حکومت کیا کرتے تھے۔ان میں راجہ اگنی گرب بھی تھا جس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا باہولوچن تخت پر بیٹھا اور دریائے توی کے بائیں کنارے اپنا قلعہ تعمیر کیا، جو'' باہوقلعہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔قلعہ کے ساتھ ایک نگر بھی بسایا گیا جو باہونگر کہلایا۔ باہولوچن ایک لڑائی میں مارا گیا تو اس کا چھوٹا بھائی جامبولوچن علاقے کا حکمران بنا۔اُس زمانے میں موجودہ جموں شہر کا علاقہ جنگل اور جھاڑیوں پر مشتمل تھا اور یہاں کوئی آبادی نہ تھی،البتہ شکار کے لئے جنگلی جانور بہت ملتے تھے۔ایک دن راجہ جامبولوچن شکار کھیلنے کے لئے اس ویران علاقے میں نکلا ہوا تھا کہ اچانک اس کی نظر پانی کے ایک تالاب پر پڑی جہاں شیر اور بکری ایک ساتھ پانی پی رہے تھے۔ بکری کو شیر سے کوئی خوف نہیں تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر راجہ جامبولوچن شکار کا خیال بھول گیا اور تالاب پر آیا اور اپنے ہمراہیوں کو بُلا کر کہا کہ یہاں شیر اور بکری نے اکٹھے پانی پیا ہے۔اس لئے یہ جگہ امن کی دھرتی ہے اور میں اپنا محل اسی جگہ بنوانا چاہتا ہوں اور ایک شہر بسانا چاہتا ہوں ۔چنانچہ کام شروع ہو گیا۔جنگل جھاڑیاں صاف

* جموں کی مختلف تاریخوں کے مطابق راجہ جامبولوچن تین ہزار سال پہلے ہوا تھا لیکن جموں کا ذکر کسی پرانی تاریخ میں نہیں ملتا ماسوائے اس کے کہ 1398ء میں تیمور لنگ نے جب حملہ کیا تو وہ جموں کے راجہ مل دیو کا پیچھا کرتے ہوئے جموں بھی آیا تھا۔اس کے بعد جموں کا ذکر مختلف تاریخوں میں ملتا ہے۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں علاقہ جموں میں تین اہم راجہ تھے جنہوں نے محمود غزنوی کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ راجے جو تین بھائی تھے جامبولوچن، بہولوچن اور تری لوچن تھے۔تری لوچن نے پونچھ میں محمود غزنوی کا مقابلہ کر کے اُسے واپس لوٹنے پر مجبور کیا تھا۔ممکن ہے کہ اس وقت جموں پر باہولوچن یا جامبولوچن کی حکومت کرتے ہوں۔

کر کے یہاں جامبوشہر آباد کیا گیا اور محلات تعمیر کرائے گئے۔ پھر وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے جامبونگر "جموں" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

دھیرے دھیرے جموں شہر پھیلتا چلا گیا۔ اس کے باسی بڑے بہادر اور جفاکش لوگ تھے جنہوں نے بہت سے علاقے فتح کر کے جموں کے ساتھ ملا دیئے۔ 1822ء میں جموں کا علاقہ جب راجہ گلاب سنگھ کو ریاست کے طور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا کیا تو گلاب سنگھ نے جموں کے گردونواح اور دھلا دھار و پیر پنچال کے دامن میں واقع تمام ریاستوں اور راجواڑوں کو مضبوط کر کے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور لداخ تک کے علاقوں کو جموں کے ساتھ ملا لیا تو گلاب سنگھ کے تصرف والا سارا علاقہ جموں کہلانے لگا۔ 1846ء میں جب ریاست جموں وکشمیر وجود میں آئی تو علاقہ جموں کے ساتھ ریاست جسر وٹہ رام نگر، راجوری، بھمبر اور پونچھ مدغم کر دی گئیں اور اس نئے خطے کا نام صوبۂ جموں رکھا گیا۔ اس طرح ڈوگرہ عہد میں جموں شہر کے تعلق سے پورے صوبے کا نام صوبۂ جموں رکھ دیا گیا جو اب تک رائج ہے۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ 1846ء سے پہلے صوبۂ جموں 22 ریاستوں، راجواڑوں اور جاگیروں پر مشتمل تھا، جہاں کے رہنے والے لوگ تمدنی ورثے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اگرچہ جموں، اودھم پور، رام نگر، کٹھوعہ اور سانبہ میں ڈوگرہ تمدن اور ثقافت کے بیل بوٹے پھل پھول رہے تھے تو میر پور، راجوری، بھمبر اور پونچھ میں گُجر قبائل اور پہاڑی بولنے والے لوگ کئی صدیوں سے اپنے منفرد تمدنی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اسی طرح بھدرواہ میں واسکی ناگ شرائن کا عوام کی تمدنی زندگی پر اثر ہے اور یہاں کے میلے تہوار اس مندر سے جڑے ہوئے ہیں جبکہ اس علاقے کے گدی اور سپی قبائل تمدنی طور پر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اُدھر کشتواڑ کی مسلمان اکثریت ایک طرف شیخ العالم حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی تعلیمات سے فیضان حاصل کرتی آ رہی ہے تو دوسری جانب حضرت سید شاہ محمد فریدالدینؒ اور حضرت شاہ اسرارالدینؒ کی درگاہوں کا اُن کی تمدنی

زندگی پر گہرا اثر رہا۔صوبۂ جموں کسی خاص تمدنی میراث کی علامت نہیں بلکہ مختلف تمدنی ورثوں کی اکائی ہے۔اس لئے صوبۂ جموں کی تمدنی تاریخ جموں اور اس کے گردونواح میں رہنے والے ڈوگرہ نسل کے لوگوں پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں پونچھ، راجوری، بھمبر اور میر پور کے گُجر قبائل اور پہاڑی بولنے والے لوگوں کا تمدن بھی شامل ہے۔اس میں بھدرواہ کے میلے اور یاترائیں بھی آتی ہیں اور کشتواڑ کے آستانوں کی روحانی مہک بھی ملتی ہے۔

......☆......

صوبۂ جموں کے لوگ

ڈوگرااورڈوگرے

دریائے راوی اور چناب کے درمیان واقع علاقہ کو''ڈوگر دیس'' کہا جاتا ہے اور یہاں کے مکینوں کو''ڈوگرے'' کہا جاتا ہے۔''ڈوگر'' لفظ سنسکرت کے لفظ دیوی گراٹ دیش سے نکلا ہے، جس کے معنی دو جھیلوں کے درمیان کا علاقہ ہے۔ جموں کے تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ ڈوگرہ قبائل کا اصلی وطن جموں کی دو جھیلوں سُروِیں سر اور مان سر کے درمیان کا علاقہ تھا جہاں سے پھیل کر وہ پورے ڈوگرہ دیس میں آباد ہوئے۔ آج بھی اس تمام علاقے کو علاقہ ڈوگر کہا جاتا ہے جبکہ یہاں کے باشندوں کو ڈوگرے کہا جاتا ہے۔ سُروِیں سر اور مانسر کے درمیان کا علاقہ جسے سنسکرت میں دیوی گراٹ دیش Devi Grat Desa کہا جاتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ بدل کر درگارہ ہوا۔ درگارہ کے بارے میں ریاست چمبہ میں ایک شیلا لیکھ مِلا ہے جس پر لکھا ہے کہ چمبہ کے راجہ نے 930-910 کے درمیان درگارہ کے راجہ کو مطیع کیا تھا۔ پرانے زمانے سے ہی ہماچل کی ریاست چمبہ اور جموں علاقے کی سرحدیں ملتی تھیں اور دونوں ریاستوں کے راجے ایک دوسرے پر حملہ کر کے مُہم جوئی میں مشغول رہتے تھے۔ اس لئے''درگارہ'' علاقہ جموں کے باشندوں کے لئے ہی استعمال ہوا ہے جو آگے چل کر بدلتے بدلتے درگارہ سے ڈگر ہو گیا اور جس کے باشندے ڈوگرہ کہلائے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ آج بھی سُروِیں سر اور اُن جھیلوں کے آس پاس پرانے زمانہ کی ڈوگر تہذیب وتمدن کے آثار ملتے ہیں۔ جیسے ان جھیلوں کے قریب واقع پرانا شہر

''بھبھور'' * جسے جموں کی پرانی راجدھانی بتایا جاتا ہے۔ پُرمنڈل، اتر بنی کے مقدس مقامات اور دیوک ندی بھی اسی علاقے میں ہے جو ہندوؤں کے لئے مذہبی طور پر نہایت اہم مقامات ہیں۔ مشہور انگریز سیاح فریڈرک ڈریو نے اپنی کتاب ''دی ناردرن بیریر آف انڈیا'' کے صفحات نمبر 37/38 پر مندرجہ بالا علاقوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جموں سے 30 کلومیٹر شمال کی طرف دریائے توی کے بائیں کنارے پر ایک قدیم شہر ''بھبھور'' کے آثار ملتے ہیں۔ یہ شہر ایک کلومیٹر کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے اور ڈنسال کی بھوری جھاڑیوں والے علاقے میں واقع ہے۔ یہاں پرانے زمانے کے تین مندروں کے آثار ملتے ہیں۔ اگر چہ ان مندروں کی تعمیر کا وقت متعین نہیں ہوسکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان مندروں کی تعمیر وادیٔ کشمیر میں وانگت کے مندروں سے ملتی جلتی ہے جو راجہ للتادتیہ کے دور میں تعمیر ہوئے تھے۔ ان مندروں کی فنِ تعمیر، بناوٹ، مضبوطی، خوبصورتی اور فن سنگ تراشی عہد قدیم میں ڈوگروں کے عظیم تہذیبی اور تمدنی ورثے کی علامت ہے۔ ''بھبھور'' کو جموں کا پرانا دارالخلافہ مانا جاتا ہے جو مان سر اور سُروین سر جھیلوں کے قریب واقع ہے۔ اُدھر پُرمنڈل، اتر بنی اور مقدس دیوک ندی بھی ان جھیلوں کے آس پاس واقع ہیں۔ پُرمنڈل ہندوؤں کا مقدس ترین تیرتھ ہے جو درمیانی پہاڑی سلسلے کے آخر میں دیوک ندی کے کنارے واقع ہے۔ پُرمنڈل سے کچھ دوری پر اتر بنی کا مقدس استھان ہے۔ پُرمنڈل اور اتر بنی پرانے زمانے سے ہی تیرتھوں میں شمار ہوتے رہے ہیں جہاں لوگ پُن دان کرنے کے لئے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔''

پُرمنڈل سے ایک مشکل ترین پہاڑی راستہ سروین سر اور مانسر کی طرف جاتا ہے۔ ان دونوں جھیلوں کا درمیانی فاصلہ پندرہ کلومیٹر ہے۔ یہ جھیلیں سطح سمندر سے دو ہزار فُٹ اور 2200 فٹ کی بلندی پر درمیانی پہاڑی ٹیلوں کے درمیان واقع ہیں۔ سروین سر 800

* بیپور جموں سے 30 کلومیٹر شمال میں دھار روڈ پر منوال گاؤں کے قریب واقع ہے جہاں ایک کلومیٹر علاقے میں پھیلے ہوئے شہر کے کھنڈر ملتے ہیں۔ یہاں بہت سے مندروں کے آثار ہیں لیکن تین مندر قابل ذکر ہیں۔

میٹر لمبی اور چار سو میٹر چوڑی جھیل ہے جس کے کناروں کو آم اور پلم کے درختوں اور جھرمٹوں نے خوبصورت بنایا ہوا ہے۔ جبکہ جھیل کے درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ نُما قطعہ واقع ہے اور ارد گرد کے پہاڑ جھاڑیوں اور چیڑ کے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ مانسر، سرویں سر سے بڑی جھیل ہے جس کی لمبائی پونا میل اور چوڑائی آدھ میل ہوگی۔ یہ جموں سے 64 کلومیٹر شمال میں اودھم پور سے 40 کلومیٹر جنوب میں درمیانی پہاڑی سلسلوں میں واقع ہے۔ جبکہ سانبہ سے اس کی دوری صرف 25 کلومیٹر ہے۔ روایات کے مطابق مان سر بھرت کے زمانے سے ہی قائم ہے اور یہ جھیل ارجن پانڈو کے تیر لگنے سے وجود میں آئی تھی جہاں ارجن نے شیش ناگ کو مارا تھا۔ جبکہ ارجن کے دوسرے تیر سے سرویں سر جھیل وجود میں آئی تھی۔ مان سر جھیل بھی چیڑ اور آم کے جنگلوں سے گھری ہوئی ہے۔ موسم بہار میں اس جھیل میں کنول کھلتے ہیں اور بطخیں تیرتی ہیں۔ یہاں ہندوؤں کے کچھ خاندان بچوں کا مُنڈن کرانے کے لئے بھی آتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ سرویں سر اور مان سر جھیلوں کے آس پاس کا علاقہ ڈوگرہ قبائل کا اصلی وطن تھا اور اس علاقے کو ڈوگر کہا جاتا تھا۔ ان ڈوگرہ قبائل نے یہاں بھبھور شہر آباد کیا جسے ڈگر دیش کا قدیمی دارالخلافہ مانا جاتا ہے۔ یہاں پرمنڈل اور اتر بنی جیسے تیرتھ استھان قائم کئے جہاں مذہبی رسومات ادا کی جاتی تھیں اور دیوک ندی کو چھوٹی گنگا کا نام دے کر لوگوں نے یہاں سے اشنان کا مہاتم (روحانی قاعدہ) حاصل کرنا شروع کیا۔

ڈوگروں کا قدیم تمدنی پسِ منظر

جموں شہر اور صوبۂ جموں کے نام سے قدیم تاریخوں اور رزمیہ کتابوں میں حوالے نہیں ملتے۔ حتیٰ کہ کلہن کی راج ترنگنی میں بھی سیدھے طور سے جموں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ابر مددرا، درگارہ، ڈگر، دراو ابھسیار (راجوری اور پونچھ) کالجر (کوٹلی) کیتھی اور (کٹھوعہ)

وغیرہ کے بارے میں کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ اگر چہ ویدوں میں علاقہ جموں کو قدیم ملک بتایا گیا ہے لیکن تفصیلات نہیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جموں خطہ کے بارے میں ویدک رشیوں کو علم تھا اور پرانوں میں بھی اس علاقے کا ذکر آیا ہے لیکن معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں۔

سامبھر کو جموں کا سب سے پرانا حکمران مانا جاتا ہے جو پہاڑی علاقوں کے بالائی حصوں میں پاروشی (راوی) کا راجہ تھا۔ یہ آریاؤں سے پہلے کے مقامی باشندے تھے جنہوں نے سامبھر کی قیادت میں چالیس برس تک مضبوطی کے ساتھ آریاؤں کا مقابلہ کیا تھا۔ سامبھر کالی جلد والے لوگوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نسل کے کچھ لوگ آج بھی کشتواڑ میں آباد ہیں۔

عہدِ قدیم میں یہ لوگ ششنا کے پجاری تھے جسے وششٹ رشی نے ششنا دیو لکھا ہے۔ ششنا یعنی یہ قبائل شِولِنگ کی پوجا کرتے تھے۔ سلاوہ اور مدرہ سب سے پرانے قبائل مانے جاتے ہیں جو علاقہ جموں میں آباد تھے۔ یہ لوگ ویدک زمانے میں اپنی پہچان رکھتے تھے۔ مہا بھارت کے زمانے میں کورو پنچال کا ذکر ہے جس کے راجہ کا نام پنچال نریش تھا اور جس کی بیٹی دروپتی کو پانچالی کہا جاتا تھا۔ پانچالی کی شادی پانڈوؤں سے ہوئی تھی۔ جموں کے محققین پانچالی، پانچال نریش اور کورو پانچال کو موجودہ پیر پنچال ہی بتاتے ہیں جس کے دامن کے پہاڑی علاقوں میں پنچال نریش کی حکومت تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بن باس کے دوران پانڈو پنچال نریش کے علاقے میں آئے تھے اور یہاں انہوں نے اپنی یادگاریں قائم کی تھیں، جن میں پانڈو مندر کالا کوٹ، پانڈو محل مینڈھر، پانڈو پہاڑ اور تقریباً علاقہ پونچھ راجوری کے ہر گاؤں میں پانڈوؤں کے وقت کی باولیاں آج بھی موجود ہیں۔ مان سر اور سروین سر کی جھیلیں ارجن کے تیر پھینکنے سے وجود میں آئی تھیں۔ پونچھ شہر میں پانڈوؤں کے زمانے کے پتھر کے تیر آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ حقائق پانڈؤں کی علاقہ جموں کے ساتھ وابستگی کا اشارہ کرتے ہیں۔

اتھر وید اور اَپنشد میں مدرا قبائل کا ذکر ملتا ہے جو علاقہ جموں کے باشندے تھے۔

جبکہ اتر مدرا قبائل کا ذکر پانانی (Panini) کی کتاب اشٹ ادھیائے میں آیا ہے، جو سات سو سال قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔ پانانی نے مدرا قبائل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی مشرقی مدرا قبائل جو راوی اور چناب کے درمیان آباد تھے اور اتر مدرا جو چناب اور جہلم دریاؤں کے درمیان قیام کرتے تھے۔ اسی طرح پانانی نے جموں خطے کے دریاؤں اور علاقوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسے انجلی کل، دیوکا، اودھا (اُجھ) بدھیا، بین اراونی (راوی)، کالا کوکڈ (کالا کوٹ) ترکا کڈا وغیرہ۔ ویدک زمانے کے ترِی کا کڈا کو آجکل ترِی کٹا پہاڑی سلسلہ کہا جاتا ہے۔ مدرا ریاست (جس کا جموں خطہ ایک حصہ تھا) کا ذکر مہا بھارت، نیل مت پران، پدم پران وغیرہ میں ملتا ہے۔ اسی طرح دراوابھیسار (علاقہ پونچھ راجوری) اور مقدس دیوکا دریا کا ذکر بھی رزمیہ کتابوں میں آیا ہے۔ ویشنو پران کے ایک دوہے میں پُرمنڈل استھان کا ذکر ہے جو دیوکا کے کنارے پر واقع ہے۔

سکندر کے حملے کے وقت اُس کے ہمراہ تاریخ دان سٹربیو (Strabo) اور ڈیوڈرس نے ابھیسار کا ذکر کیا ہے۔

یونانی مورخوں نے ریاست کیتھی اولی (یعنی موجودہ کٹھوعہ) کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ دراوابھیسار علاقہ پونچھ راجوری کو کہا جاتا تھا جہاں کے دراو اور ابھیساری قبائل نے حملے کے وقت سکندر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جبکہ جموں کی دوسری ریاست کیتھی اولی تھی جو دریائے راوی کے کنارے آباد تھی اور اس کا دارالخلافہ سانگل (سیال کوٹ) تھا۔ سٹربیو نے کیتھی اولی کو عظیم جمہور یہ قرار دیا ہے۔ کیتھی اولی کے بہادروں نے دوسری چھوٹی ریاستوں سے مل کر سکندر کا مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ لیکن یہاں کے قبائل نے سمجھوتہ کیا نہ ہار مانی۔ یہ قبائل مردانہ وار جنگ میں لڑتے رہے اور شہید ہوئے۔ سکندر نے راوی کے ساتھ ساتھ شمال کے ان قبائل کو اپنی طاقت کا نشانہ بنایا اور باس لولی (بسوہلی) شہر کے قریب لوگوں نے میدان جنگ میں کود کر جان دے دی۔ عورتوں نے شہر کو آگ لگا دی اور بچوں سمیت آگ میں کود گئیں۔ کچھ تاریخ دان باس لولی شہر کو موجودہ بسوہلی بتاتے ہیں

جہاں کیتھی اولی کے قبائل نے سکندر کا مقابلہ کیا تھا۔

517 برس قبل مسیح میں دارا اوّل نے ایک یونانی جرنیل سکائی لیکس کی قیادت میں ایک مُہم ہندوستان روانہ کی تھی تا کہ فارس کے سمندری راستہ کا پتہ لگایا جا سکے۔ سکائی لیکس بڑھتے بڑھتے چندر بھاگا (دریائے چناب) کے ساتھ پہاڑی علاقوں اور میدانوں میں داخل ہوا۔ اس علاقے میں بہت سانپ تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک لاش جلائی جا رہی ہے اور ایک بڑھیا زار و قطار رو رہی ہے۔

سکائی لیکس : تم کیوں رو رہی ہو؟

بڑھیا : میرے اکلوتے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا ہے۔

سکائی لیکس : یونان میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔

بڑھیا : ہمارے گاؤں میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہاں زہریلے سانپ ہیں۔ پہلے میرے سُسر کو کاٹا، وہ مر گیا، پھر میرا شوہر سانپ کے کاٹنے سے مرا اور اب میرا بیٹا سانپ کے زہر سے چل بسا۔

سکائی لیکس : تو تم اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

بڑھیا : اس لئے کہ یہاں جنتا کا راج ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنا راجہ آپ ہے۔ سب لوگ مل کر قانون بناتے ہیں اور اُس پر عمل کرتے ہیں۔

سکائی لیکس : مگر یہ سانپ۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟

بڑھیا : ایک نہ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ لیکن اپنی باگ ڈور کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں دے کر بھیڑ بکریاں بن جانا تو عمر بھر کا روگ ہے۔ ہمیں آمریت پسند نہیں۔ ہمیں اپنا جمہوری نظام پسند ہے جہاں کسی کو محکوم نہیں بنایا جاتا۔

سکائی لیکس یہ سُن کر حیران رہ گیا اور اُس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے مورخ سے کہا کہ لکھو ''آمریت سے زہریلے سانپ بہتر ہیں''۔

سکندرِ اعظم خود سورج کا پجاری تھا۔ ہندوستان میں اس کا آخری معرکہ دریائے

راوی کے کنارے کیتھی اولی ریاست میں سُورج کے عقیدت مندوں سے ہی ہوا تھا جہاں سے سکندر نے ہندوستان سے واپس وطن کُوچ کیا تھا۔

جموں علاقے میں وادئ بھدرواہ کی قدیم تہذیبی جھلکیاں ہرش کا ناگا نندم مہیا کرتا ہے۔ ناگا نندم میں جتنے بھی اہم کردار پیش کئے گئے ہیں اُن کی مورتیاں بھدرواہ کے پُرانے مندروں میں دستیاب ہیں۔ ان میں جیموت واہس، جیموت کیتو اور واسکیہ ناگ قابل ذکر ہیں۔ ناگاؤں کے ودیا دھر اور سدھ وش کے راجاؤں کے زیور، برتن اور اُن کا اسلحہ آج بھی بھدرواہ کے کچھ مہاجن خاندانوں کے پاس موجود ہے جن کے اجداد ناگ راجاؤں کے دیوان، وزیر اور سردار ہوا کرتے تھے۔

دراوابھیسار قبائل

علاقہ دراوابھیسار کے قبائل کو دراو اور ابھیساری کہا جاتا تھا جو علاقہ پونچھ اور راجوری میں سکونت کرتے تھے۔ اس قبیلے کا ذکر مہا بھارت برہم سنگھتا و دیگر پرانوں میں پنجاب کے دوسرے قبائل کے ساتھ آیا ہے۔ پرانوں کے مطابق دراو قبیلے کا بانی چندر ونشی راجہ اوسین (Usinana) تھا جس کی رانی کا نام دراو تھا اور بیٹے کا نام دراون تھا۔ دراون بڑا بہادر اور جنگجو تھا جس کی نسل سے جنگجو قبائل وجود میں آئے۔ دراون نے ہی اس علاقے کا نام دراون رکھا تھا جو دراون سے بدلتے بدلتے دراو ہوگیا۔ مہا بھارت کے پنچال نریش (علاقہ پنچال کا بادشاہ) کے بیٹے کا نام دراونت تھا جبکہ بیٹی کا نام دراوپتی تھا جس کی شادی ارجن پانڈو سے ہوئی تھی۔ ان ناموں سے پنچال نریش کی دراو قبائل کے ساتھ وابستگی واضح ہوجاتی ہے۔ مورخوں کا خیال ہے کہ دراو قبائل علاقہ راجوری میں سکونت کرتے تھے جہاں پنچال نریش کی حکومت تھی۔ آگے چل کر دراو قبیلے کے ساتھ ابھیساری بھی مل گئے۔ ابھیساری علاقہ پونچھ میں قیام کرتے تھے۔ ان دونوں قبائل کے باہمی اشتراک سے جہلم

اور چناب کے درمیان کے تمام بالائی پہاڑی علاقے پر مشتمل مملکت دراوابھیسار کی بنیاد پڑی۔ دراواور ابھیسار قبائل علاقہ پونچھ اور راجوری کے ابتدائی قبائل میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے متعدد جنگوں میں جواں مردی کے مظاہرے کئے تھے۔

دراوابھیسار کا دارالخلافہ

مشہور مورخ بیلے کو پنجاب میں تانبے کا ایک دائرہ نما سکہ حاصل ہوا تھا جس پر کھروشتی میں کشہا وشٹی ترپا سیواسین کا نام درج ہے جس کی راجدھانی کا نام ابھیسار پرست لکھا ہے۔ ظاہر ہے سیواسین دراوابھیسار کا راجہ تھا جس کا دارالخلافہ ابھیسار پرست تھا۔ مورخ سیواسین کو پہلی صدی عیسوی کا راجہ بتاتے ہیں۔ ابھیسار پرست کون سا شہر تھا اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن سکندر کے ساتھ آنے والے مورخین نے خطۂ دراوابھیسار میں قصبوں کا ذکر کیا ہے۔ ابھیسار پرست بھی اُن میں سے ہی کوئی ایک ہوسکتا ہے۔

کشپ رشی کا راجوری آنا

کہتے ہیں کہ جب ظُلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو اس کے خاتمے کا انتظام بھی قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے جب ستی سر کے راکھشس جل دیو کے ظلم کی انتہا ہوئی تو کشپ رشی اپنے بھائی پلست رشی کے ساتھ معابدوں کی زیارت کرتے کرتے دراوابھیسار بھی آئے۔ جب وہ راجوری سے آگے کچھ فاصلے پر پہنچے تو ایک گاؤں بونیر میں قیام ہوا۔ وہاں علاقہ راجوری پونچھ اور اطراف واکناف کے لوگ کشپ رشی کے روبرو پیش ہوئے اور ستی سر کی جھیل پر تیرنے والے راکھشس جلد بھوم کے ظلم کی داستانیں سُنائیں جو ان

علاقوں کے لوگوں کو اپنا نشانہ بناتا رہتا تھا۔ نیل مت پُران کے مطابق راجہ نیل بھی اس مقام پر کشپ رشی سے ملاقی ہوا۔ سب نے درخواست کی کہ انہیں جلد بھوم سے نجات دلائی جائے۔ کشپ رشی * صاحب کرامات بُزرگ تھے۔ انہیں عوام پر رحم آ گیا اور انہوں نے اپنے بھائی پلست رشی کو پونچھ میں چھوڑ کر خود کشمیر کا رُخ کیا اور روحانی طاقت سے جلد بھوم کو ختم کر کے بارہ مولہ کے مقام سے ستی سر کا پانی نکال کر وادی کو قابل رہائش بنایا اور عوام کو راحت دی۔

ابھیسار کشمیر کی راجدھانی

راج ترنگنی کے مطابق 1241 ق۔م کے آس پاس کشمیر پر راجہ بھگونت کا لڑکا اور گودھر خاندان کا چشم و چراغ ابھیمنیو کشمیر کے تخت پر وارد ہوا جو برہمنوں کی معاونت سے کشمیر کا حکمران بنا تھا۔ اس کے عہد میں ہندوستان کے عالموں نے کشمیر آ کر تبلیغ کے کام کو آگے بڑھایا تھا۔ چنانچہ ایک برہمن کے کہنے پر راجہ ابھیمنیو نے دوسری قوموں کو اپنی عتاب کا نشانہ بنانا شروع کیا اور مقامی گرنتھ نیل مت پُران سے بھی منحرف ہو گیا۔ جب ناگوں کو راجہ نے حسب معمول نذر و نیاز دینا بند کر دیا تو انہوں نے اپنی کرامات کے ذریعے بے حد برفباری شروع کر دی۔ اتنی برف گرنے لگی کہ لوگوں کا کشمیر میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ جب کئی برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور برفباری سے لوگ مرنے لگے تو راجہ ابھیمنیو نے راج درباریوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ آئندہ کے لئے موسم سرما کے چھ ماہ کشمیر سے باہر گزارے جائیں۔ اس نقلِ مکانی کے لئے دراوابھیسار کا علاقہ چُنا گیا۔ اب راجہ ابھیمنیو زمستان کے آغاز میں اپنے عوام اور امراء و وزراء کے ساتھ دراوابھیسار آ جایا کرتا تھا اور اس علاقے میں جب کشمیر کا راجہ چھ ماہ کے لئے دراوابھیسار آتا ہو گا تو ظاہر ہے

* کشپ رشی کو پرجاپتی بھی کہا جاتا ہے۔ مہابھارت کے مطابق ناگ اور گرُرڑ کشپ رشی کی سنتان تھے۔ لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ کشپ کا تعلق کیپین تھا جس کی نسبت سے کشپ مشہور ہوا۔

کہ اس کے ساتھ اہم شخصیتیں وزراء، اُمراء، درباری، لشکر، شاہی خزانہ وغیرہ بھی ہوگا۔ یہ کاروان ایک ایسے شہر میں اترتا ہوگا جس میں اتنے لوگوں کے رہنے اور کھانے کا انتظام ہوسکے۔ راج ترنگنی میں کلہن نے یہ نہیں بتایا کہ ابھیمنیو نے دراوابھیسار کے کس علاقے اور کون سے شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا، البتہ منشی محمد الدین فوقؔ رتناگر کے حوالے سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ابھیمنیو نے ابھی پور شہر بسایا تھا۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے آس پاس دراوابھیسار علاقے کا نام ابھیسار پرستھ تھا۔ یہ نام راجہ ابھیمنیو کے نام سے ملتا جلتا ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں راجہ لوگ اپنے نام پر شہر بسایا کرتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس نے ہی ابھیسار پرست بسایا ہو اور علاقے کا نام بھی اپنے نام پر ابھیسار رکھا ہو جو پونچھ کا پرانا نام ہے۔

تاریخی واقعات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ 1241ق۔م تا 1228ق۔م میں علاقہ دراوابھیسار کشمیر کے راجہ ابھیمنیو کی مملکت کا حصہ تھا جہاں وہ سردیوں میں اپنے دربار کے ساتھ رہائش کرتا ہوگا۔ اُس وقت یہاں جو قبائل رہتے تھے انہیں ابھیساری اور دراو قبائل کہا جاتا تھا۔ یہ قبائل بڑے بہادر اور جفاکش تھے اور مردِ میدان مانے جاتے تھے۔

ہیون سانگ کے مطابق علاقہ دراوابھیسار

دراوابھیسار قبائل صوبہ جموں کے جنوب مغربی حصہ یعنی خطۂ پیر پنچال میں آباد تھے۔ اس علاقے میں یہ پہلے قبائل ہیں جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے لیکن یہ قبائل ساتویں صدی عیسوی تک آتے آتے ناپید ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ ساتویں صدی میں چین کے سیاح ہیون سانگ کشمیر جاتے ہوئے علاقہ پونچھ راجوری سے گُزرتے تھے۔ انہوں نے یہاں کے عوام کے بارے میں اپنی کتاب ''ٹریولر آف یانگ سُو'' میں بڑی اہم معلومات

درج کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پونچھ میں جہاں لوگ گھروں کے ساتھ انگور کے باغ لگاتے تھے، وہیں گنے کے کھیت اُگاتے تھے۔ گندم کی کاشت کرتے تھے۔ بڑھیا قسم کی چائے کا استعمال کرتے تھے۔ لوگ بڑے ذہین، بہادر اور سلجھے ہوئے تھے۔ سوتی دھاگے کے کپڑے پہنتے تھے اور عقیدے کے لحاظ سے بُدھ مت میں یقین رکھتے تھے۔ ہیون سانگ نے یہاں بُدھ وِیہاروں کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ شہر کے تیس میل شُمال میں ایک بُدھ وِیہار سارے علاقے میں مشہور ہے جو ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔

ہیون سانگ نے راجوری کو اپنی کتاب میں 'ھولوشی پولوٗ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ لوگ لب و لہجے کے لحاظ سے سخت واقع ہوئے ہیں اور ہندو دھرم میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

ہیون سانگ کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ راجوری اور پونچھ کے دراوابھیسار قبائل تہذیبی لحاظ سے بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے لیکن آٹھویں صدی کے بعد اس علاقے میں کھش قبائل کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ کلہن کے مطابق 850 عیسوی میں پونچھ میں گھوڑوں کے سوداگر 'نسر' نے یہاں کھش قبائل کی حکومت کی داغ بیل ڈالی جنہوں نے تقریباً پانچ سو سال تک نہ صرف علاقہ پونچھ راجوری پر اپنا تسلط قائم رکھا بلکہ وادیٔ کشمیر میں بھی لوہرکوٹ پونچھ کے کھش قبائل کی ایک شاخ نے کئی سو سال تک حکومت کی۔ کھشوں نے راجہ پرتھوی پال کی قیادت میں 1003ء میں راجوری پر حکومت قائم کی اور راجوری کا نام راج پوری رکھا۔ اسی دور میں راجہ بدھ پال نے علاقہ بدھل میں اپنی عمل داری قائم کی اور علاقے کا نام بدھی واس رکھا جو آگے چل کر بدھی واس سے بدھل ہو گیا۔ اُدھر کوٹلی پر گیارہویں صدی عیسوی میں راجہ پدماوت کی حکومت تھی جس نے اپنی بیٹی کی شادی کشمیر کے راجہ سُسل سے کی تھی جو کھش قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس طرح صوبۂ جموں کے حصہ راوی اور چناب میں اگر ڈوگرا آباد تھے تو چناب اور جہلم کے درمیان پہلے دراوابھیسار اور پھر کھش چودھویں صدی عیسوی تک آباد رہے۔

صوبۂ جموں کے کھش قبائل

ایم۔اے۔سٹین جنہوں نے کلہن کی راج ترنگنی پر تحقیق کی تھی، ایک نوٹ میں لکھتے ہیں کہ کھش قبائل سلسلہ ہائے کوہ پیر پنچال کے دامن میں واقع علاقے کے بڑے حصے پر قابض تھے اور پیر پنچال کے بیرونی پہاڑی سلسلوں میں سکونت کرتے تھے۔ ان قبائل کا عروج دراوٗ اور ابھیساری * قبائل کے مغلوب ہونے کے بعد آٹھویں صدی کے آس پاس ہوتا ہے۔ یہ قبائل علاقہ جموں کے ڈوگرہ قبائل سے علاحدہ تھے جو پونچھ، راجوری، میرپور اور بھمبر تک آباد تھے اور جن کا منفرد تاریخی، ثقافتی اور تمدنی پسِ منظر رہا ہے۔

کھش قبائل بانہال سے پونچھ تک پورے پہاڑی خطے میں آباد تھے۔ اُن کا آبائی وطن بُدھل کی وادیاں اور ڈھلوان تھیں۔ دسویں صدی عیسوی میں راجوری کے حکمران اور لوہر کوٹ پونچھ کے راجے کھش قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ راجوری کے مشرق میں دریائے اَنس کے کنارے کنارے کھش قبائل کی بستیاں اور گاؤں تھے۔ بعد میں ان کی حکومت نے کئی سو برس تک علاقہ پونچھ اور وادیٔ کشمیر پر حکم رانی کی۔

آج کل یہ لوگ کھکھ کہلاتے ہیں۔ کھکھ پہاڑی زبان کا لفظ ہے جبکہ کشمیری میں کھکھ کو کھاکھ کہتے ہیں۔ علاقہ مظفر آباد اور پونچھ میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں کھکھ قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ کھش کے لفظی معنی بھی جنگ وجدل کے ہوتے ہیں۔ راجوری اور پونچھ میں بولی جانے والی پہاڑی اور گوجری زبانوں میں کھش لفظ ہو بہو موجود ہے اور ان زبانوں میں کھش گلا کاٹنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اکثر پہاڑی مائیں بچوں کو ڈرانے کے لئے ''کھش کرنا'' لفظ استعمال کرتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہزاروں برس کے بعد بھی

---

* دراو ابھیسار سنسکرت کا لفظ ہے جو دو الگ الگ لفظوں یعنی دراو اور ابھیسار کا مرکب ہے۔ دراو کے معنی جنگجو اور آسانی سے قابو میں نہ آنے والے قبائل کا نام تھا جبکہ ابھیسار کے معنی بھی جنگ وجدل کے ہوتے ہیں۔ دراو قبائل علاقہ راجوری اور اس کے نواحی علاقوں میں سکونت کرتے تھے جبکہ ابھیساری علاقہ پونچھ میں آباد تھے۔ دونوں قبائل نے مل کر اپنی ریاست دراوابھیسار بنائی تھی جس کا ذکر ہندو مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔

لفظ ''کھش '' نے اپنا مفہوم نہیں کھویا اور آج بھی یہ لفظ اُسی تناظر میں استعمال ہوتا ہے۔

جموں وکشمیر کے نامور تاریخ دان آنجہانی موتی لال ساقی نے کھش قبیلے کے تاریخی سفر کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کشمیر کی تاریخ میں کھشوں کا ذکر 550 عیسوی میں مہر کل کے حملے کے وقت ہوا ہے جب وہ کشمیر سے ہندوستان پر قابض ہونے کے لئے علاقہ پونچھ راجوری کے کھش قبائل کے علاقوں سے گزرتا ہے۔ راج ترنگنی کے مطابق مہر گل کی کوششیں کھشوں کی طاقت کو کم کرنے کے لئے تھیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کھشوں نے دراوابھیسار کے مقامی دراواور ابھیسار قبائل پر قابو پا کر کشمیر کو بھی اپنے حملوں سے بیزار کیا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں کھش بانہال سے پونچھ تک تمام علاقے میں چھائے ہوئے تھے اور راجوری ان کا دارالخلافہ تھا۔

کھش قبائل کون تھے؟

کس طرح پونچھ راجوری میں آباد ہوئے؟ اس کے بارے میں موتی لال ساقی لکھتے ہیں کہ سنسکرت میں کھش نام سے موسوم یہ وہی لوگ ہیں جن کا تاریخ میں مختلف ناموں سے ذکر آیا ہے۔ کچھ مورخین نے کھشوں کو کیسائٹ (Kassite) لکھا ہے۔ بابل کے لوگ انہیں نشو اور سریانی نشی لکھتے تھے۔ ان لوگوں کے اصل وطن کے بارے میں محققین کی آرا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ دانوں کے ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ کھشوں کا اصل وطن ایران ہے اور وہاں یہ لوگ زگرس کے پہاڑی علاقے کے باشندے تھے۔ مگر ڈاکٹر گمبوٹس کی رائے میں یہ قوم ہند یورپی آریائی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور ان کا اصل وطن کیسائٹ تھا۔ یہ قبیلہ دو ہزار سال قبل مسیح میں بابل میں داخل ہوا اور بالآخر وہاں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس قبیلے کا اولین باشندہ گنداش تھا جو اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں بادشاہ بنا۔ اُن کی اصل زبان کیا تھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن

کھشوں کے کچھ نام اصلی صورت میں محفوظ رہ گئے۔ ان کے کچھ دیوتا ہند یورپی دیوتاؤں سے ملتے تھے۔ ان کے ایک دیوتا کا نام بورش تھا جو یونان میں بوریس کہلاتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور دیوتا شریا تھا جو اب سوریہ کہلاتا ہے۔

کھشوں کا پہاڑی علاقوں کو اپنا مسکن بنانا اس بات کا غماز ہے کہ کھش ویدک آریاؤں کے بعد برصغیر میں مغرب کے راستے داخل ہوئے۔ مہابھارت میں ان کو خونخوار فوجی کہا گیا ہے۔ مارکنڈے پران میں کھش قبیلے کی بہادری کی داستانیں ملتی ہیں۔ وشوامتر اور منو کو بھی کھش قبیلے کی واقفیت تھی۔ اگر چہ انہوں نے ان قبائل کا ذکر دراوڑ قبیلے کے طور پر کیا ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں کھش وادئ سوات میں آباد تھے۔ جدید تاریخ دانوں کے ایک طبقے کی رائے میں کھش تاریخ کے پہلے دور میں وادئ سندھ سے پیر پنچال کے پہاڑوں میں داخل ہوئے۔ کچھ تاریخ دان تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ کشمیر کا نام کھشوں کے نام پر کھشمر پڑا جو آگے چل کر کھشمر سے کشمیر ہو گیا۔ 550 عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک علاقہ پیر پنچال میں کھشوں کا زور رہا اور اس زمانے میں راجوری پونچھ کے کھش قبائل کا کشمیر میں حکومتیں بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ہوا کرتا تھا۔

خطۂ پیر پنچال میں مُسلمان راجپوتوں کا عروج

کھش قبائل کا صوبۂ جموں کے خطۂ پیر پنچال کے علاقے راجوری، پونچھ، میر پور اور بھمبر پر تیرہویں صدی تک دبدبہ رہا اور کھش ہندو راجاؤں کی حکومتیں قائم رہیں۔ لیکن 1339 عیسوی میں کشمیر پر سلاطین کا دورِ حکومت شروع ہوا تو وادئ کشمیر کے جنوب میں واقع خطہ پیر پنچال کے لوگ مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ تبدیلی مذہب کے بعد یہاں مُسلمان راجپوت خاندانوں کی حکومتیں وجود میں آنے لگیں اور سولہویں صدی عیسوی تک سارے علاقے پر چھوٹی چھوٹی مُسلم ریاستیں اور راج واڑے قائم ہوتے چلے گئے اور

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں خطۂ پیر پنچال میں چودہ چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں جن میں بھمبر کے چِب، راجوری کے جرال، میر پور کے گکھڑ اور پونچھ کے راٹھور و سانگو راجاؤں کی حکومتیں قابلِ ذکر ہیں۔

بھمبر کا ذکر راج ترنگنی میں نہیں ملتا۔ ایم۔اے سٹین نے، جنہوں نے کلہن کی راج ترنگنی کا ترجمہ کیا ہے، بھمبر کو پرانے زمانے میں ریاست دراو اور ابھیسار کا حصہ بتایا ہے۔ اومکار ناتھ چب تاریخ چبال میں لکھتے ہیں کہ صدیوں پہلے کانگڑہ کے کٹوچ راجپوت خاندان نے یہاں آ کر سکونت اختیار کی اور تیرہویں صدی عیسوی میں نارائن چند کٹوچ نے اپنے بیٹے چب چند کی شادی مقامی تھکیال راجہ سری پت کی بیٹی سے کی۔ سری پت کے بعد بھمبر کا وارث چب چند ہوگیا جو کٹوچ راجپوت تھا جبکہ سری پت گکھڑ تھا۔ چنانچہ مکالمے کے بعد طے پایا کہ آئندہ خاندان چب چند کے نام پر چلے گا اور علاقے کا نام چبال ہوگا اور جو زبان (پہاڑی) وہ بولتے تھے اسے چبالی نام دیا گیا۔ آگے چل کر راجہ بھوم چند نے اپنے نام پر شہر آباد کیا جس کا نام بھوم پور رکھا جو وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے بھوم پور سے بھمبر ہوگیا۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے مغل شہنشاہ جب بھمبر شہر میں قیام کرنے لگے تو مغلیہ دور کی تہذیب و ثقافت کا یہاں کے عوام پر گہرا اثر ہوا۔ مغل شہنشاہوں نے بھمبر میں سرائیں، مساجد اور آرام گاہیں تعمیر کر کے رونق بخشی۔ بعد میں ڈوگرہ عہد حکومت میں بھمبر کو ریاست کا دروازہ کہا جاتا تھا اور مہاراجہ گلاب سنگھ نے یہاں آرام گاہیں بھی تعمیر کروائی تھیں۔ بھمبر کے عوام میں اکثریت پہاڑی راجپوت اور ٹھوکر لوگوں کی ہے اور جبکہ گجر اور جاٹ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندوؤں کی بھی اچھی خاصی تعداد آباد تھی۔ چونکہ بھمبر کا علاقہ مغربی پنجاب کے علاوہ گجرات سے ملتا تھا اس لئے یہاں کی تہذیبی شناخت پر مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

میر پور کا علاقہ دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ روایت ہے کہ میر پور کو گکھڑ سردار میران خان نے 1051ھ ہجری میں آباد کیا جبکہ میر پور شہر کی ایک معزز

ہستی جسٹس ملک کے مطابق کسی زمانے میں میر پور میں میران خان درویش اور پوری خاندان کے ایک ہندو جوگی رہا کرتے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی اور اکثر ملاقاتیں کیا کرتے تھے لیکن دونوں مانی ہوئی روحانی ہستیاں تھیں اس لئے ان کی وفات کے بعد لوگوں نے اس جگہ کا نام میراں اور پوری کو جوڑ کر میران پوری رکھ دیا جو آگے چل کر میر پور ہو گیا۔ آزادی سے قبل میر پور ریاست کا تیسرا بڑا شہر تھا جس کی گلیاں اور بازار چوڑے پتھروں کی سلوں سے بنائے گئے تھے۔ شہر کے قریب بارہ دری تھی اور جنوب میں قلعہ رام کوٹ واقع تھا۔ یہ شہر تجارت کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ یہاں تین سوڈ کانیں تھیں۔ عوام کی دل جوئی کے لئے ڈھول والے اور میراثی ہوا کرتے تھے اور یہ علاقہ مسلمان گکھڑ راجپوتوں کا علاقہ مانا جاتا تھا جو پوٹھوہار علاقے سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ لیکن پنجاب میں افراتفری کے بعد علاقہ میر پوران کا نشانہ بنا اور یہاں انتشار پھیل گیا۔ پھر 1846ء عیسوی میں جب یہ علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو ملا تو گکھڑ یہاں سے پہاڑوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ گکھڑوں نے ایک عرصے تک اپنے تشخص اور تمدن کو سنبھال کر رکھا۔ ان کے اپنے راجہ ہوتے تھے اور قلعے ہوا کرتے تھے۔ قلعہ رام کوٹ بھی ٹلگو گکھڑ نے تعمیر کرایا تھا۔ آزادی کے بعد پرانا میر پور اگر چہ منگلا ڈیم میں ڈوب گیا ہے لیکن آج بھی میر پور میں رگھوناتھ مندر کے کلس علاقے کی قدیمی تہذیب کی گواہی دیتے ہیں۔

اقتصادی لحاظ سے راجوری کو سونے کی لنکا کہا جاتا تھا۔ وہیں خوبصورتی کے لحاظ سے اسے نئی نویلی دُلہن سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ پیر پنچال کے دامن میں واقع راجوری شہر کو تہذیبی اور تاریخی حیثیت رہی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملوں سے پسپا ہو کر پال راجاؤں اور ان کے خاندان والوں نے اس علاقے میں پناہ لی اور پھر دھیرے دھیرے یہاں کے خدوخال بدلنے لگے۔ 1001ء میں راجہ پرتھوی پال نے یہاں اپنی حکومت قائم کی اور علاقے کا نام راج پوری رکھا جو بدلتے بدلتے راجوری ہوا۔ پال خاندان کے بعد 1192ء میں نومسلم نور الدین عرف تیل شپہ نے یہاں جرال مسلمان

راجپوت راجاؤں کی داغ بیل ڈالی جنہوں نے 1846ء تک حکومت کی۔ راجوری کا شہر ایک عرصے تک گہما گہمی اور تہذیب وتمدن وثقافت کا مرکز رہا۔ کبھی یہاں دراوقبائل آباد تھے۔ پھر کھش قبائل کی عملداری ہوئی۔ پھر جرال، ٹھکر، ملک اور گجروں نے اس علاقے کو اپنے ثقافتی ورثے سے زرخیز کیا۔ راجوری کبھی راجور بنا تو کبھی رام پور کہلایا۔ مغلیہ شہنشاہوں کے قافلوں نے اس شہر میں تہذیب وثقافت کی نئی روح پھونک دی۔ یہاں کئی کئی دن شاہی کارواں ڈیرے ڈالتے تھے تو تمدنی سرگرمیاں عروج تک پہنچی تھیں۔ 1660ء میں اورنگ زیب کی شادی راجوری کے تاج الدین کی بیٹی راج بالی سے ہوئی تو راجوری کا سیدھا دہلی سے رشتہ قائم ہوگیا جس کا اثر یہاں کے تہذیب وتمدن پر بھی پڑااور یہ شہر پھلنے پھولنے لگا۔

پونچھ کا علاقہ کئی صدیوں سے ملی جلی تہذیبی اور ثقافتی وراثت کا علمبردار رہا ہے۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب مختلف ذاتوں، فرقوں، قوموں، مذہبوں اور قبیلوں کے آپسی میل ملاپ کا نتیجہ ہے اور مختلف رنگوں کے گلدستے کی طرح ہے جس کا ہر پھول اپنی رنگت، خوشبو اور زیبائی کے لئے اہم اور ضروری ہے۔ اس علاقے میں مذہبی میل ملاپ اور بھائی چارے کی بنیاد 87-1760ء کے درمیان مقامی راجہ علی گوہر عرف رستم خان نے رکھی تھی جس کے دور میں مسلمانوں کے علاوہ دور دور سے ہندو تاجر، صنعت کار، قلم کار، حکیم، فنکار، میراثی اور زراعت پیشہ افراد آ کر آباد ہوئے تھے کیونکہ یہ علاقہ امن وسکون کا گہوارہ مانا جاتا تھا اور راجہ بلا امتیاز مذہب وملت سب سے برابری کا سلوک روا رکھتا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کشمیر میں انتشار تھا اور دوسری جانب پونچھ علاقے کے ساتھ لگنے والا علاقہ پنجاب یلغاروں کے باعث افراتفری کا شکار تھا۔ پنجاب کے کھتری تاجروں اور برہمنوں نے یہاں آ کر سکونت اختیار کی۔ اُدھر گلیر ہماچل کے ہندو فنکار اور پینٹر یہاں آ کر سکون کے ساتھ اپنے فن کو فروغ دینے لگے اور ایسی تصویریں بنائیں جو خوبصورتی اور فن کے لحاظ سے دور دور تک مشہور ہوئیں۔ یہ تصویریں آج بھی لاہور کے میوزیم میں موجود ہیں اور پونچھ قلم کے نام

سے جانی جاتی ہیں۔ راجہ رستم خان کے دارالخلافہ پونچھ شہر میں ہندو آبادی اکثریت میں تھی اور راجہ نے ایک ہندو فقیر کے کہنے پر پونچھ میں ایک مندر تعمیر کروایا اور جاگیر عطا کی جسے آج کل دشنامی اکھاڑہ پونچھ کہا جاتا ہے۔

1802ء میں جب ایک اہم روحانی شخصیت سنت بھائی میلہ سنگھ جی راولاکوٹ سے پونچھ تشریف لائے تو اُس وقت یہاں سانگو گجر خاندان کی حکومت تھی اور گجر راجہ امیر خان نے سنت جی سے استدعا کی کہ راولاکوٹ کا علاقہ انتشار کا شکار ہے اس لئے آپ پونچھ شہر میں سکونت کریں۔ چنانچہ سنت جی نے ننگالی صاحب کے مقام پر گوردوارہ تعمیر کروایا اور رہائش اختیار کی۔ آج یہ گوردوارہ ریاست بھر میں سکھ دھرم کے پرچار اور فروغ کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور پونچھ کی تہذیبی وراثت کا اہم حصہ ہے۔ یہاں بیساکھی کے دن بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ریاست بھر سے ہندو اور سکھ شرکت کرتے ہیں اور مقامی مسلمان بھی حصہ لیتے ہیں۔

ڈوگرہ عہد میں (1947-1852) آپسی میل ملاپ اور مذہبی رواداری کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں میاں نظام الدین جیسی شخصیت کو ریاست پونچھ کا وزیراعظم بنایا گیا تھا جو پونچھ کے پہلے اور آخری وزیراعظم تھے۔ میاں صاحب نے اپنے والد کی یاد میں ایک خوبصورت ترین مسجد تعمیر کی جو ریاست بھر میں اپنی نوعیت کی پہلی مسجد تھی۔ اسی طرح مسجد رتو وزیرنی بھی ڈوگرہ عہد کی دین ہے۔ اس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے عقیدوں کے احترام کے جذبوں سے سرشار تھے۔

آزادی کے بعد بھی علاقہ پونچھ میں ملے جلے تہذیبی ورثے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں ایسے بھی گاؤں ہیں جہاں ایک فی صد اقلیت ننانوے فیصد اکثریت میں نہ صرف محفوظ رہے بلکہ باوقار زندگی گزار رہے ہیں۔ اکثریت نے کبھی اقلیت کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ غیر ہیں یا پرائے ہیں۔

پونچھ کی تحصیل منڈی میں ہندوؤں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے

باوجود ہندوؤں کا سب سے بڑا مذہبی مقام سوامی بدھ امرناتھ کئی صدیوں سے یہاں قائم ہے اور عقیدت واحترام کا مرکز ہے۔ یہاں شراون پُورنما کے دن بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور دو دن پہلے دشنامی اکھاڑہ پونچھ سے چھڑی مبارک یاترا شروع ہوتی ہے اور پیدل سفر کر کے بُڑھا امرناتھ منڈی پہنچتی ہے۔ راستے میں چنڈک اور منڈی کے مقام پر مسلمان بھائی استقبال کے لئے آگے آتے ہیں اور پھر رکھشا بندھن کے موقعے پر بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان اور سکھ بھائی بھی شرکت کرتے ہیں۔

علاقہ پونچھ میں صدیوں سے پیروں، فقیروں، درویشوں اور صوفیوں کے محبت کے جذبات سے لبریز اقوال کے باعث لوگ میل جول اور یگانگت کے رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے عقیدوں کی عزت کرنا، تہواروں کو مل جُل کر منانا، خوشیاں اور غم بانٹ لینا صوفی بُزرگوں کی تعلیمات کا ہی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی بزرگوں اور پیروں فقیروں کی درگاہوں اور آستانوں پر مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی حاضری دینے آتے ہیں۔ ان درگاہوں میں زیارت سائیں میر بخش گونتریاں، زیارت سائیں الٰہی بخش بٹل کوٹ منڈی، زیارت سائیں فقر دینؒ دیگوار، زیارت حضرت سمنانی صاحبؒ بہرام گلہ، زیارت حضرت سید پیر حبیب اللہ شاہ بُخاریؒ یمبر وٹ اور حضرت پیر مقبول شاہ بخاریؒ یمبر وٹ سُرنکوٹ، زیارت پیر چھوٹے شاہ مینڈھر اہم زیارتوں میں شامل ہوتی ہیں، جہاں ہر روز زائرین کی آمد رہتی ہے جبکہ عرس کے موقعے پر لوگ دور دور سے آکر شرکت کرتے ہیں جن میں ہندو اور سکھ مذہب کے لوگ بھی احترام کے طور پر آتے ہیں۔ زیارت سائیں الٰہی بخشؒ بٹل کوٹ لورن میں عرس کے ایام میں ایک دن سکھ تنظیم پریتم سپر یچول ٹرسٹ کی طرف سے باضابطہ لنگر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

علاقہ پونچھ میں پہاڑی زبان بولنے والے لوگوں کی اکثریت ہے جبکہ گجر بکروال قبائل بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ لوگ اپنے مخصوص ثقافتی ورثے کے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں۔ ان کی زیبائش، آرائش، مشغلے، میلے، تہوار، عرس، خوراک اور زبان علاقہ کے

دوسرے لوگوں سے الگ ہوا کرتی ہے۔

علاقہ پونچھ میں ایل او سی کے اُس پار صوبۂ جموں کے حصہ سدھنتی، راولاکوٹ، باغ کوٹلی اور تھکیالہ میں سدھن قبائل کا دبدبہ رہا ہے۔ یہ قوم اگر چہ اپنے آپ کو سدھنتی قبائل سے جوڑتی ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسی سدھنتی اور راولاکوٹ میں آزادی سے پہلے مسلمان سدھنوں کے ہمسائے ہندو سودن ہوا کرتے تھے جو 1947ء کے واقعات کے بعد سرحد کے اس طرف آ گئے لیکن آج بھی وہ اپنے نام کے ساتھ سودن ذات لکھتے ہیں۔ اُن کے مطابق ہندو سودن اور مسلمان سدھن قبائل کسی زمانے میں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں کچھ قبائل نے اسلام قبول کیا اور سدھن ہو گئے۔

سدھنتی راولاکوٹ کی سدھن قوم نہایت باشعور، ذہین اور جفاکش واقع ہوئی ہے اور اپنی جواں مردی اور سرکشی کے لئے مشہور رہی ہے۔ یہ وہی قبائل ہیں جنہوں نے راجہ شمس خان کی قیادت میں 1837ء میں پنجاب دربار کے خلاف زبردست بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حُکم پر جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو بھاری لشکر لے کر پونچھ آنا پڑا۔ چار ماہ تک لڑائی جاری رہی اور 12 سدھنوں کی زندہ کھالیں اُتروالی گئیں لیکن راجہ شمس خان اُن کے ہاتھ نہ لگا تو علاقے میں شمس خان کا پتہ دینے والے کو بہت بڑا انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ تب ایک سازش کے تحت پونچھ شہر کے قریب گاؤں دیگوار میں محمد خان تیڑویں اور اگر خان نے شمس خان کو اپنے گھر دعوت دی۔ پھر کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا اور شمس خان اور اُس کے بھتیجے راج ولی کا سر کاٹ کر راجہ گلاب سنگھ کے پاس بھیج دیا۔ آج بھی سارا علاقہ پونچھ میں راجہ شمس خان کی 'بار' (Ballad) نہایت مقبول ہے۔ وہ مقام جہاں راجہ شمس خان قتل ہوا تھا اور اس کے جسم کا ایک حصہ دفن کیا گیا تھا وہ دیگوار تیڑاں میں ایک ٹیلے پر موجود ہے جسے اب ایک میموریل کی شکل دی گئی ہے۔ سدھنتی تہذیبی لحاظ سے منفرد تشخص کا حامل علاقہ ہے۔ وہ زبان جو اس علاقے میں بولی جاتی ہے اسے 'سدھنی' کہا جاتا ہے۔ سدھنی پہاڑی کا ایک بدلا ہوا روپ ہے لیکن اسے صرف سدھنتی

میں ہی بولا جاتا ہے۔

سدھنوں کے علاوہ علاقہ باغ کوٹلی اور تھکیالہ میں جوایل۔او۔سی کے اُس پار واقع ہیں جرال تھکیال، منگرال، گکھڑ، ڈمال دولی، پیروزال سید، خواجے، گُجر اور بکروال اور جٹ قومیں بھی آباد ہیں۔ یہ لوگ دریائے جہلم کے ساتھ والے علاقوں میں آباد ہیں۔ اس لئے ان کے روابط جہلم کے اُس پار علاقہ راولپنڈی سے رہا ہے۔ اس لئے ان کی تہذیب و ثقافت پر پوٹھوہاری رنگ کی آمیزش رہی ہے۔

......☆......

ڈوگرقوم

ڈوگرہ عوام

ڈوگرہ لفظ عام طور پر دریائے راوی اور چناب کے درمیانی خطہ کے لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ڈوگرے آریائی نسل کے لوگ کہلاتے ہیں۔ جب آریہ ہندوستان میں وارد ہوئے اور شہر، قصبے اور بستیاں بساتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تو اُن میں سے ایک جماعت پنجاب کے ساتھ لگنے والے پہاڑی علاقوں میں بھی مقیم ہوئی۔ وہ لوگ جنہوں نے چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں میں سکونت اختیار کی اور برفانی پہاڑی سلسلوں سے دُور رہے، آگے چل کر ڈوگرے کہلائے اور جس خطے میں انہوں نے سکونت اختیار کی وہ ڈوگر کہا جانے لگا۔ ڈوگرے۔ ڈوگر علاقے میں ہمیشہ حاوی رہے۔

اگرچہ ڈوگرہ کی اکثریت ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے لیکن ڈوگرہ علاقے میں آباد مسلمان لوگوں کا ایک طبقہ جو ڈوگری زبان بولتا ہے وہ بھی ڈوگرے کہلاتے ہیں۔ ڈوگرہ علاقے میں عوام کی مادری زبان ڈوگری ہے جس کا ماخذ سنسکرت میں ملتا ہے۔

ڈوگرہ علاقے کے ہندو بھی ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہندوؤں کی طرح ذاتوں اور برادریوں میں منقسم ہیں جیسے برہمن، راج پوت، کھتری، جاٹ، ٹھاکر، دلت وغیرہ۔

ڈوگرہ سماج میں برہمن برادری بڑی تعداد میں آباد ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت ہندومت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔ جسمانی طور پر برہمن دوسری ذاتوں سے مختلف نہیں ہوتے لیکن یہ قوم زیادہ تعلیم یافتہ، ذہین اور سوجھ بوجھ والی مانی جاتی ہے۔ اس قوم کو اپنے صدیوں پرانے تہذیبی ورثے پر ناز ہے۔ برہمنوں میں جو مقدس کتابیں

پڑھتے اور پڑھاتے ہیں وہ پنڈت کہلاتے ہیں۔ پنڈتوں اور پجاریوں کا کام مندروں کی دیکھ بھال کرنا اور مذہبی رسومات ادا کرنا ہوتا ہے۔ لوگ برہمنوں کو شرادھ اور دوسرے دن تہواروں پر گھروں میں دعوت پر بُلاتے ہیں جو کھیر، پوری، حلوہ، چاول، راجماش، امبل وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ پنڈت برہمن شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

ڈوگرہ علاقوں میں برہمنوں کی اکثریت زراعت اور زراعت سے جُڑے ہوئے پیشوں سے وابستہ ہے۔ ان کے پاس زمینیں زیادہ نہیں ہوتی لیکن خود کاشت کرتے ہیں اور اچھی محنت کر کے روزی کما لیتے ہیں۔ ان کی اکثریت چھوٹے زمین داروں کی ہے۔ آج کے دور میں برہمنوں نے اپنے تدبر اور حُسن اخلاق سے دوسرے شعبوں پر بھی اپنی دھاک جمائی ہے اور فوج میں بھی نام کما رہے ہیں۔

راج پوت

ڈوگرہ راجپوت جنگجو اور حکمران طبقہ مانا جاتا ہے۔ ڈوگرہ خطے میں راجپوت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور صدیوں سے علاقے کے دفاع اور فتوحات میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے جسم چھریرے مگر پھرتیلے ہوتے ہیں اور قد ساڑھے پانچ فٹ سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لوگ لڑائی کے لئے لمبے سفر پر جاتے رہے ہیں اور ان کا شمار مطیع نہ ہونے والے قبائل میں ہوتا ہے جو دلیر، بہادر اور مرد میدان واقع ہوئے ہیں۔ ان کی ایک ذات میاں کہلاتی ہے جو اپنے آپ کو اعلیٰ ترین نسل سے بتاتے ہیں۔ ڈوگرہ راجپوتوں میں زورآور سنگھ اور میاں ڈیڈو کے نام قابل ذکر ہیں جبکہ گلاب سنگھ بہادری اور تدبر سے پوری ریاست جموں وکشمیر کا مہاراجہ بنا اور ڈوگرہ راج کو دور دور تک پھیلایا۔

زورآور سنگھ جموں کے راجہ گلاب سنگھ کا وزیر تھا۔ اس نے پانچ ہزار فوج کے ساتھ

لداخ پر 1839ء میں چڑھائی کر کے اُسے فتح کیا اور اپنی جنگی مُہم کو جاری رکھا۔ 1841ء میں زورآور سنگھ نے ڈوگرہ فوج کے بل بوتے پر تبت پر یلغار کر دی لیکن علاقہ تبت میں تکلاکوٹ کے مقام پر اس کی فوج برفباری میں گھر گئی اور زورآور سنگھ لڑائی میں مارا گیا۔ لداخ میں زورآور سنگھ کا قلعہ ڈوگروں کی لداخ مہم کی گواہی دیتا ہے۔ میاں ڈیڈو جو کہ ریاسی کے راجپوت خاندان سے تھا، انیسویں صدی میں ایک بہادر جرنیل کے طور پر اُبھرا۔ میاں ڈیڈو اپنے علاقے کے تشخص کے لئے ایک عرصے تک جموں کے راجہ گلاب سنگھ اور پنجابی فوج کے ساتھ نبرد آزما ہوتا رہا۔ راجوری کے لچھمن سنگھ راجپوت نے دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کے حکم پر پنجاب میں ظلم و جبر کے خلاف لڑائی شروع کی اور ایک عرصے تک بندہ بیراگی کے نام سے مغلوں کے ساتھ لڑتا رہا اور آخر شہید ہوا۔ 1947ء، 1965ء اور 1971ء کی ہند و پاک لڑائیوں اور 1962ء کی چین بھارت لڑائی میں جموں کے ڈوگرہ راجپوتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نام کمایا۔ ڈوگرہ راج پوتوں نے اپنی بہادری اور جواں مردی کے باعث جموں اور اس کے اردگرد سترہ ریاستوں پر صدیوں تک حکومت کی جنہیں آخر کار ڈوگرہ راجپوت راجہ گلاب سنگھ نے معاہدۂ امرتسر کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں مدغم کیا۔

جموں کے راج پوت ڈوگری بولتے ہیں۔ قد و قامت میں خوبصورت اور بانکے لگتے ہیں اور شہ زور مانے جاتے ہیں۔ لیکن اخلاق میں سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ جب یہ تھوڑے ہوش سنبھالتے تھے تو انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں خاندانی تمکنت اور تکبر بہت ہوتا تھا۔ اس چیز نے بہت میاں راجپوتوں کے وطیرے خراب کئے ہیں۔ راج پوت یا تو دربار سے جڑے ہوتے ہیں یا پھر فوج میں نوکری کرتے ہیں۔ پرانے زمانے کے راجپوتوں میں چلن تھا کہ وہ سپہ گری کو ہی اپنا پیشہ بناتے تھے اور کوئی دوسرا کام نہیں کرتے تھے۔ راجپوت دو حصوں میں منقسم ہیں یعنی میاں اور پیشہ ور راجپوت۔ میاں نہ تو تجارت کرتے تھے نہ زراعت۔ اِن میں سے زیادہ تر کے پاس اچھی زمین تھی جو انہیں مفت ہاتھ آئی تھی یا پھر اس پر کوئی ٹیکس نہ لگایا جاتا تھا۔ زمین

دوسروں سے کاشت کراتے تھے اور خود شکار کھیلتے تھے۔ مہاراجہ کی نوکری کرتے تھے۔ اچھے فوجی بھی تھے۔ اچھے درباری بھی تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن میں ہاتھ سے محنت نہ کرنی پڑے۔ چھرا ان کا من پسند ہتھیار ہوتا تھا۔ پیشہ ور راجپوت وہ جماعت ہے جو زراعت سے جڑی ہے اور وہ خود محنت کرتے ہیں۔ اس لئے میاں راجپوت انہیں اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ آزادی کے بعد حالات بدل چکے ہیں۔ میاں لوگوں کی زمین ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہے اور وہ روزگار کمانے کے لئے ہر قسم کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔

ٹھاکر یا ٹھکر

ٹھاکر یا ٹھکر جموں کے پہاڑی علاقوں میں اعلیٰ اور زرخیز زمینوں اور جاگیروں والے خاندان ہوتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس گاؤں میں بڑے بڑے زمینی خطے ہوتے تھے اور ٹھاکر جاگیرداروں کا گاؤں میں ایک جال پھیلا ہوا تھا اور مہاراجہ کے جاگیردارانہ نظام میں ٹھاکروں کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جموں میں ٹھکروں کو وہی مقام حاصل تھا جو پنجاب میں جٹ برادری کو ہے۔ یہ لوگ اپنے وسیع زمینی قطعات پر خود بھی کام کرتے ہیں اور کاشت کے لئے مزارعے بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ غریب کاشت کاروں کو زمین چوتھے حصے پر دیا کرتے تھے اور کسان کی کمائی کے تین حصوں کو خود حاصل کر لیا کرتے تھے اور عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ ٹھکر عوام اور حکومت کے درمیان ایک کڑی کے طور پر کام کرتے تھے اور حکومت کے کارندوں سے مل کر عوام کا استحصال کیا کرتے تھے۔ ٹھکر آسودہ، خوشحال اور کھاتے پیتے قبائل تھے۔ انہیں اپنے بزرگوں اور عہد رفتہ کی عظمت پر ناز رہا ہے۔ ٹھکر دراصل راجپوتوں کا ہی ایک طبقہ ہے جو زمین دار اور جاگیر دار نظام کا حصہ رہا تھا۔ انہیں سرکار اور دربار میں عزت اور احترام ملتا تھا۔ چونکہ وہ مشقت کرنے کے عادی نہیں ہوتے اس لئے ان کے جسم خوبصورت اور نازک دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد

جب زرعی اصلاح لاگو ہوئی تو اس کا سب سے زیادہ نقصان ٹھکر برادری کو ہوا، جن کی فالتو زمینیں ان کے ہاتھ سے نکل کر مزدوروں کو مل گئیں اور وہ مالک بن گئے۔ آج کل ٹھکر لوگ اپنی محنت اور سوجھ بوجھ سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ 1953ء اور 1971ء کی زرعی اصلاحات کے بعد ٹھکر جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کا نظام ختم ہو گیا۔ ان کی فاضل زمینیں چھن گئیں اور اب یہ طبقہ اپنا جاہ و جلال کھو کر عوام کا حصہ بن چکا ہے۔

کھتری

جموں خطے کی آبادی میں کھتری قوم کو بڑی کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ لوگ اصل میں مغربی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے جو مختلف ادوار میں علاقہ جموں میں آ کر مقیم ہوئے۔ کھتری قوم کا پیشہ شروع سے ہی تجارت اور ساہوکاری رہا ہے۔ اسی پیشے کے فروغ کے لئے وہ جموں کی طرف آئے۔ یہ لوگ جہاں شہروں میں تجارت پر حاوی رہے وہیں گاؤں میں ان کی ساہوکاری کا نظام ایک عرصے تک قائم رہا۔ جموں شہر میں کھتریوں کی ایک شاخ آڑھت کے کام سے بھی وابستہ رہی ہے یعنی وہ جموں سے اپنا مال گاؤں کے چھوٹے دُکانداروں کو سپلائی کرتے اور اپنا منافع کماتے رہے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں پنجاب میں فسادات نے جب علاقوں کو تہہ و بالا کرنا شروع کر دیا اور لوٹ مار ہونے لگی، تو کھتریوں کے خاندان جو تجارت سے وابستہ تھے اور جنگ و جدل سے ہمیشہ دور رہتے تھے، افراتفری سے تنگ آ کر جموں کے پہاڑی علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ جناب ڈبلیو۔ سی۔ آرچر اپنی کتاب پینٹنگز آف ہمالیہ میں لکھتے ہیں کہ 87-1760ء میں جب رستم خان کی حکومت تھی تو پونچھ شہر میں تجارت ہندو تاجروں (کھتریوں) کے ہاتھ میں تھی۔ اسی دور میں جموں اور اس کے گاؤں میں بھی کھتریوں کی آمد شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے انہوں نے جموں کے گرد و نواح اور گاؤں

کی تجارت پر اپنی پکڑ مضبوط کر لی۔ عام طور پر کھتری بھاری ڈھیل ڈھول والے ہوتے ہیں۔ قد کے درمیانے، رنگت گیہوں سی ہوتی ہے۔ کئی کھتریوں کی ایک جگہ بیٹھنے کے باعث توند نکل آتی ہے۔ یہ لوگ تجارت کے سوائے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اس لئے جسمانی طور پر راجپوتوں، برہمنوں اور دلت لوگوں سے کمزور گنے جاتے ہیں۔ ان کے خدوخال اور چال ڈھال بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ لیکن دماغی طور پر یہ لوگ بڑے تیز طرار اور دور نظر رکھنے والے قبائل ہیں۔ یہ لوگ جموں معاشرے کے کھاتے پیتے اور آسودہ حال گنے جاتے تھے۔ سروں پر پگڑی، قمیض، پاجامہ اور واسکٹ پہنتے ہیں جبکہ عورتیں پنجابی طرز کی شلوار، قمیض اور ڈوپٹے کا استعمال کرتی ہیں۔ عورتیں سونے کے گہنے پہنتی ہیں اور مرد کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ ان کے گھر پکے اور خوبصورت ہوتے تھے۔ کپڑے سفید اور اُجلے پہنتے تھے۔ گھروں میں پکوان اور مٹھائی عام بنتی تھی۔ گاؤں میں کھتری شراب کی کشید کرتے اور دوستوں رشتہ داروں میں بیٹھ کر پیتے ہیں۔ طبیعت کے لحاظ سے کھتری بڑے روادار اور میل ملاپ رکھنے والے لوگ رہے ہیں۔ یہ جہاں بھی رہے اقلیت میں رہے چاہے وہ مذہبی ہو یا نسلی ہو۔ لیکن ہر جگہ انہوں نے اکثریتی فرقہ کی جیب پر راج کیا کیونکہ اخلاق، شرافت، متین طبیعت، میٹھی زبان اور گھل مل جانے والے لوگ رہے ہیں جس کے باعث کھتری خاندان آزادی سے پہلے بڑے آسودہ حال ہوتے تھے۔ راج دربار تک جن کی رسائی ہوتی تھی وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ گاؤں میں پکی حویلیاں ہوتی جن کی ٹین والی چھت ہوتی تھی۔ یہ طبقہ آزادی کے بعد دھیرے دھیرے اپنا تجارتی وقار کھوتا چلا گیا اور مختلف وجوہات کی بنا پر کھتریوں کے پاؤں کاروبار سے اُکھڑتے چلے گئے۔ اب کھتری ایسے خاندانوں کا گروہ بن چکا ہے جن کی پکڑ نہ تو تجارت پر ہے نہ انتظامیہ میں ان کی کوئی حیثیت رہی ہے۔ لیکن یہ لوگ بڑے ذہین اور اہل دانش رہے ہیں۔ اس لئے ہاتھ پاؤں مار کر مختلف شعبہ جات میں اپنا مقام بنا کر رہے ہیں۔

گپتا

جموں شہر اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں گپتا مہاجن خاندانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے پنجاب میں جب آریہ سماج کی بنیاد رکھی تو اس فرقے میں شامل ہونے والے افراد پہلے شہروں تک محدود تھے اور دکانداری کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ لوگ پنجاب سے علاقہ جموں میں وارد ہوئے اور تجارت پر حاوی ہوتے گئے۔ آزادی سے پہلے گپتا خاندانوں کے تقریباً تمام لوگ تجارت سے ہی وابستہ تھے اور اُن کا مقابلہ کھتریوں سے ہوتا تھا۔ لیکن اپنی محنت، لگن اور رسوخ کے باعث گپتا برادری نہ صرف جموں کی عوامی زندگی کا حصہ بن گئی بلکہ جموں کی تجارت میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ آزادی کے بعد تجارت کے ساتھ ساتھ گپتا خاندان کے بچے تعلیم کی طرف بھی راغب ہوگئے اور اپنی محنت اور زرخیز دماغ کے باعث تعلیم میں پیش پیش ہیں۔ آج علاقہ جموں میں گپتا خاندان کے لوگ کھاتے پیتے اور خوش حال مانے جاتے ہیں۔

دلت

علاقہ ڈوگر میں دلت برادری بڑی تعداد میں سکونت کرتی ہے اور پورے ڈگر علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے سماجی عدم مساوات اور ناانصافیوں کے شکار رہے ہیں۔ اس کے باوجود دلت لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ حوصلہ نہیں چھوڑا۔ محنت کرنے کی خُو ترک نہیں کی اور نامساعد حالات کا سامنا کرتے رہے اور ہر دور اور ہر حال میں یہ برادری اپنی محنت اور جفاکشی کے بل بوتے پر پنپتی رہی۔

آزادی کے بعد دلت برادری کو جب درجہ فہرست ذاتوں کے زُمرے میں لایا گیا تو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح جموں علاقے کی دلت برادری بھی مراعات سے

نوازی جانے لگی اس طرح یہ لوگ بھی ترقی کی دوڑ میں شامل ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ستر برسوں میں دلت برادری کی زندگی میں سماجی، سیاسی، اقتصادی اور معاشی طور پر انقلاب رونما ہوا ہے اور اب یہ لوگ نئے جوش وخروش، ولولے اور خوداعتمادی کے ساتھ دوسرے طبقوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

مسلمان

ڈگر خطہ میں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو ڈوگری بولتا ہے اور ڈوگروں کی طرح ہی زندگی گزارتا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو ڈوگرے کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دودھی گجر لوگ بھی یہاں سکونت کرتے ہیں۔ یہ لوگ جموں، کٹھوعہ، سانبہ اور اودھمپور کے شہروں کے آس پاس بھینسیں پالتے ہیں اور ان کا دودھ بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔ دودھی گُجر، گُجر قبائل کا ہی ایک حصہ مانا جاتا ہے۔ یہ لوگ پہناوے اور زبان کے لحاظ سے بھی گجر قبائل ہی کا حصہ ہیں۔ علاقہ جموں میں ان کے جھونپڑے شہروں کے نزدیک اور گاؤں کے کناروں پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ طبقہ جو وقت کی دوڑ سے پچھڑا ہوا تھا اب ریزرویشن کا فائدہ اُٹھا رہا ہے اور دھیرے دھیرے قومی دھارے میں شامل ہو رہا ہے۔

طرزِ زندگی

ڈوگرے شکل وصورت میں گندمی مائل ہوتے ہیں۔ مردوں کی رنگت بھوری اور عورتوں کی بادامی مائل ہوتی ہے جن کے نین نقش تیکھے ہوتے ہیں۔ان کے ماتھے فراخ، ناک ستواں اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔جسم کے چھریرے، پھرتیلے، جوشیلے، ہوشیار اور

بانکے ہوتے ہیں۔ مردوں کا قد لگ بھگ ساڑھے پانچ فٹ کے آس پاس ہوتا ہے جبکہ عورتیں پانچ اور ساڑھے پانچ فٹ کے درمیان ہوتی ہیں۔ مرد بالوں کو کاٹتے ہیں۔ مونچھیں رکھنے کا رواج اب جاتا رہا ہے۔ پرانے وقتوں میں ڈوگرے سروں پر پگڑی باندھتے تھے۔ واسکٹ پہنتے تھے۔ کھلی لہراتی ہوئی قمیض کا استعمال کرتے تھے اور گھٹنی پہنتے تھے جو کمر سے گھٹنوں تک کھلی اور گھٹنوں سے پاؤں تک جسم کے ساتھ جڑا ہوا لباس ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ لباس عام کپڑوں میں بدل گیا ہے۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ عورتیں جسم کے ساتھ جڑی ہوئی قمیض، شلوار اور دوپٹے کا استعمال کرتی ہیں اور رنگدار چھینٹ کے کپڑے پسند کرتی ہیں۔ مرد انگلیوں میں چھلے، کانوں میں مُندریاں پہنا کرتے تھے۔ یہ روایت اب بزرگوں تک محدود ہوگئی جبکہ عورتیں سونے کے زیور جیسے ٹیکہ، نتھ، جھمکے، ہار، مُرکیاں، چھاپ، چوڑیاں اور پازیب پہنتی ہیں اور کانچ اور ہیرے کے نگ والے گہنے زیادہ پسند کرتی ہیں۔

وطیروں کے لحاظ سے ڈوگرے سادہ طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کا عام پیشہ زراعت اور سپہ گری رہا ہے۔ یہ لوگ عزت اور آن پر جان دے دیتے ہیں۔ میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانا ان کی روایت رہی ہے اور آج کے دور میں بھی ڈوگرے ہندوستان کے بہترین فوجی دستوں میں شمار ہوتے ہیں اور بہت اچھے لڑاکو مانے جاتے ہیں۔ مطیع نہ ہونے والے ڈوگرہ قبائل نے ڈوگرہ دیس کو ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں سے بچائے رکھا اور اپنے وطن کی حفاظت کی ہے۔

ڈوگروں کی روزمرہ کی خوراک چاول، گندم کی چپاتی، دالیں اور سبزیاں ہیں جبکہ پہاڑی علاقوں میں مکئی بھی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ ہندو ڈوگروں کی اکثریت سبزی خور رہی ہے اور گوشت و مرغے سے دور رہے ہیں لیکن اب یہ دوری دھیرے دھیرے کم ہوتی جارہی ہے۔ ڈوگروں کے کئی مخصوص پکوان ہیں جو خالصتاً اسی خطے میں تیار ہوتے ہیں، جن میں اوہریہ قابل ذکر ہے۔ اوہریہ میں دہی، آلو، نمک، مرچ، ہلدی اور پسی ہوئی اوہر کا استعمال

ہوتا ہے۔ یہ ڈش چولہے پر نہیں پکائی جاتی ہے۔ پہلے تھوڑے سے دہی میں تیل، ہلدی اور اوہر ڈال کر اسے دھوپ میں دو دنوں تک پکایا جاتا ہے۔ جب اوہر ہلدی اور دہی اپنا اثر چھوڑ دیتے ہیں تو اس کو پھینٹے ہوئے دہی میں ملا کر پھر آلو ڈال کر اوہریہ تیار کیا جاتا ہے۔ اگر چہ اوہریہ کھانوں کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے لیکن ناشتے کے وقت پوری اور چھولے کے ساتھ اوہریہ بڑی لذت دیتا ہے۔ امبل ایک اور ڈوگرہ ڈش ہے۔ امبل کاشی پھل، گُڑ، املی، میتھی تیل اور نمک مرچ کے استعمال سے تیار ہوتا ہے۔ کھٹے اور میٹھے ذایقے والا امبل اکثر گھروں میں دال کے ساتھ دوسری سبزی کے طور پر پروسا جاتا ہے اور چٹخارے لے کر کھایا جاتا ہے۔ کھٹا مرغا یا شکاری مرغا ڈوگروں کی خاص ضیافت کا حصہ ہوتا ہے جن میں انار دانہ، گُڑ، میتھی اور پیاز وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ کھٹا مُرغا عام طور پر مہمانوں کی دعوت میں پروسا جاتا ہے۔ گھیور ایک اور پکوان ہے جو ڈگر علاقے میں مشہور ہے۔ یہ پکوان عام طور پر شام کی چائے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ گھیور پراٹھا نما پھُلکے پر چینی کا لیپ کر کے اُسے ایک طرف سے گھی میں فرائی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح 'مَن' ایک میٹھا پکوان ہے۔ 'مَن' گھروں میں آٹا، گُڑ، سوکھا پھل، اجوائن اور گھی ملا کر بڑے روٹ کی صورت میں پکایا جاتا ہے جو جسامت میں چوڑا اور حجم میں موٹا ہوتا ہے۔ مَن کو توے پر ڈال کر اسے دھیمی آنچ میں پکایا جاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑے کر کے پروسے جاتے ہیں۔ چلیٹھی ایک اور میٹھا پکوان ہے۔ چلیٹھی چاولوں کے باریک پسے ہوئے آٹے کا ڈور بنا کر اسے گھی کے تڑکے پر ڈالا جاتا ہے اور چینی اور سوکھا پھل ڈال کر دیر تک پکایا جاتا ہے۔ جب یہ پک کر حلوے کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسے پروسا جاتا ہے۔ کلاڑی پہاڑی علاقوں کی اہم ڈش ہے جو بھینس کے دودھ اور لسی کے ملاپ سے بنائی جاتی ہے اور روٹیوں کی صورت میں تیار کی جاتی ہے۔ کلاڑی کو کچا بھی کھایا جاتا ہے اور گھی میں فرائی کر کے بھی کھایا جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں روایتی ڈوگرہ گھر جھونپڑیوں کی شکل کے ہوتے تھے جن کی چھت سیدھی ہوتی تھی۔ دیواریں مٹی کی، فرش مٹی کا اور چھت پر بھی مٹی ڈال کر لیپ کیا جاتا

تھا۔ دیواروں اور فرش کو گائے کے گوبر سے پوت دیا جاتا تھا۔ چھتیں لکڑی کی چال سے بنائی جاتی تھیں جنہیں لکڑی کے کھمبے لگا کر کھڑا کیا جاتا تھا۔ ان کھمبوں کو 'تھم' کہا جاتا ہے۔ درمیان کا تھم نہایت خوبصورت بنایا جاتا ہے اور تھم کو چھت کے ساتھ جوڑنے کے لئے لکڑی کے ایک ٹوپ نما حصے کا استعمال کیا جاتا ہے جس پر کشیدہ کاری بھی کی جاتی ہے۔ کمروں میں روشنی کم ہوتی ہے۔ جو روشنی آتی ہے وہ کُھلے دروازے سے ہی داخل ہوتی ہے۔ مٹی کے یہ مکان گرمی اور سردی کے بچاؤ کے لئے بہترین ہوتے ہیں۔ گھر کے سامنے ایک کھلی جگہ ہوتی ہے جسے بیڑا کہا جاتا ہے۔ بیڑا کو خوبصورت اور صاف رکھا جاتا ہے جہاں چار پائیوں پر گھر کے لوگ دن کے وقت بیٹھتے ہیں۔ بیڑا اور مکان کے درمیان ایک کونے میں رسوئی ہوتی ہے جو مکان کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور ایک کھڑکی سے اس کا رابطہ اندر کے کمرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگ اپنے گھروں کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ لیکن دور جدید میں اب یہ طرز زندگی بدل رہا ہے۔ کچے مکانوں کی جگہ پکے مکانوں نے لے لی ہے اور آسودگی نے گھروں کو جدید طرز پر تعمیر کرنے کی طرف راغب کر دیا۔ البتہ ڈوگروں کو اپنے قدیم تہذیبی ورثے پر ناز ہے۔

ڈوگروں کو فن مصوری سے بہت لگاؤ رہا ہے۔ بسوہلی کے فن کاروں نے اپنی تصویروں کے فن سے ڈوگرہ آرٹ کو شمالی ہندوستان میں متعارف کرایا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہاں کے فنکاروں نے اپنے کارہائے نمایاں سے ہندوستان کے بادشاہوں کو اپنی طرف راغب کیا اور بسوہلی کو فن مصوری کا مرکز بنایا۔ بہت سی تصاویر میں بھگتی لہر کا اثر ملتا ہے لیکن یہاں کی سب سے مشہور تصاویر رادھا اور کرشن کی زندگی پر مبنی ہیں، جن کے موضوعات رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا سے لئے گئے ہیں۔ ان تصاویر میں شوخ اور دلکش رنگ استعمال ہوئے ہیں جیسے کسی نے تصویر میں شاعری کی ہو۔

ڈوگروں کو اپنے علاقے سے گہری محبت رہی ہے۔ اُن کے لوک گیتوں کا بڑا حصہ رزمیہ ہے جو فتوحات اور کہاوتوں سے لبریز ہے اور یہاں کے مذہبی مقامات سے جڑا ہوا ہے۔ مذہب کی وساطت سے علاقہ ڈگر میں رام لیلا منعقد کرنے کا رواج صدیوں پرانا

ہے۔ دسہرہ سے کچھ دن قبل رام لیلا منڈلیاں بھگوان رام کی زندگی پر رام لیلا کھیلتے ہیں جن کو دیکھنے کے لئے تمام آبادی جمع ہو جاتی ہے۔ رام لیلا کھیلنے والوں میں ہندوؤں کے علاوہ اکثر مسلمان فنکار بھی حصہ لیتے ہیں۔ اسی طرح ڈوگرہ قصبوں اور گاؤں میں راس منڈلیاں بھی ہوتی ہیں جو عوام کی دل جوئی کے لئے پروگرام کرتے ہیں۔ اُدھر نوراتروں کے دنوں میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں مذہبی رسومات کے علاوہ ہندوستان بھر کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دورِ جدید میں جب سے ٹی۔ وی گھروں میں داخل ہوا ہے اور ٹی۔ وی پر تمام قسم کے دلجوئی کے سامان بہم رکھے جانے لگے ہیں جن میں مذہب اور تمدن سے جڑے ہوئے پروگرام بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے راس دھاریوں اور ناچ گانا کرنے والوں کی طرف لوگ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔

ڈوگروں کے مشغلے

ڈوگرہ لوگوں کے مشغلے بڑے دلچسپ، لبھاونے اور انوکھے ہوتے ہیں۔ یہ مشغلے عوامی زندگی کا حصہ ہوا کرتے تھے اور جب بھی لوگوں کو فرصت کے لمحے میسر آتے تو وہ مشاغل سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ یہ مشغلے ڈوگرہ زندگی کے ساتھ ہزاروں سال سے جڑے ہوئے ہیں۔

ڈوگرہ علاقے میں مینڈھے لڑانے کا رواج بہت پرانا ہے۔ لوگ شوق سے اپنے گھروں میں مینڈھے پالتے ہیں اور لڑاکے مینڈھوں کو اعلیٰ قسم کا چارہ اور خوراک دی جاتی تھی۔ اُن کی تربیت کے لئے استاد رکھے جاتے تھے جو ہر روز مینڈھوں کو کُھلے میں لے جا کر انہیں لڑائی کے لئے تیار کرتے تھے۔ گاؤں میں فصلوں کی کٹائی کے بعد لوگ اپنی دل جوئی کے لئے مینڈھے لڑانے کا اعلان کرتے اور یہ مقابلے برادریوں اور گاؤں کی سطح پر منعقد ہوتے تھے۔ لوگ علاقے کے کُھلے میدان میں آ جاتے۔ ڈھول کی آواز دور دور تک گونجتی

جسے سُن کر عوام اکٹھے ہو جاتے پھر دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے مینڈھوں کو لے کر آجاتے اور لڑائی شروع ہو جاتی۔ مینڈھے زور زور سے ٹکریں مار کر ایک دوسرے سے لڑتے اور لوگ شور ڈال کر اپنے اپنے مینڈھوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ یہ لڑائی تب تک جاری رہتی جب تک کہ ایک مینڈھے کی ٹانگ نہ ٹوٹتی یا سر نہ پھٹتا۔ پھر جیتنے والے مینڈھے کے گلے میں ہار ڈال کر لوگ اسے اپنے گاؤں لے جاتے تھے۔

مُرغے لڑانا بھی ڈوگرہ سماج کا اہم مشغلہ رہا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں لڑائی کے لئے مرغے الگ سے پالتے۔ ان کے لئے اعلیٰ چوگ اور دانے کا اہتمام ہوتا اور ایسی خوراک کھلائی جاتی جس سے ان کی کلغی زیادہ لمبی اور سُرخ ہو جائے۔ پھر ان مرغوں کو گھروں میں لڑائی کی تربیت دی جاتی اور ہر روز انہیں دانہ پانی کھلانے کے بعد لڑایا جاتا۔ پھر میلے تہواروں کے موقعوں پر برادری یا گاؤں کی سطح پر لوگ دو حصوں میں بٹ جاتے اور اپنے اپنے مرغے لے کر میدان میں آجاتے۔ مرغوں کی لڑائی بڑی خونخوار اور تیز ہوا کرتی تھی جس میں مُرغے ایک دوسرے پر اُچھل اُچھل کر وار کرتے۔ عام طور پر مرغوں کی ''تین پانی'' لڑائی ہوا کرتی تھی۔ یعنی لڑائی شروع ہونے کے کچھ عرصہ بعد مرغے تھکنے لگتے تو انہیں پکڑ کر پانی پلایا جاتا اور خوراک کھلائی جاتی، جب لڑنے کے قابل ہوتے تو انہیں دوبارہ میدان میں اُتار دیا جاتا۔ اس طرح تین بار پانی پلا پلا کر انہیں لڑایا جاتا اور تماشہ بین تالیاں بجا بجا کر اور شور مچا مچا کر اپنے اپنے مرغے کی پذیرائی کرتے۔ یہ لڑائی تب تک جاری رہتی جب تک کہ مُرغے لہولہان نہ ہو جاتے۔ وہ چونچیں مار مار کر ایک دوسرے کی کلغی کاٹ لیتے اور آنکھوں کو نکال لیتے تھے۔ اس طرح لمبی لڑائی کے بعد جب فیصلہ ہوتا تو جیتنے والی برادری یا گاؤں والے خوشیاں مناتے ہوئے گھروں کو واپس جاتے تھے۔

ڈوگر دیس میں طوطے پالنے کا چلن بھی عام ہوتا تھا۔ جموں میں مانسری طوطے بہت مشہور ہوتے تھے۔ شکاری ان طوطوں کو پکڑنے کے لئے خاص گُر استعمال میں لاتے تھے۔ پھر انہیں پنجروں میں ڈال کر سدھایا جاتا تھا اور باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ جب

طوطا بات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا اور جواب دینے لگتا تو اسے جموں کے بازار میں لایا جاتا تھا۔ جہاں لوگ طوطوں کی نسل، ان کی رنگت اور بولی کو دیکھ کر انہیں خریدتے تھے اور گھروں میں لے جاتے تھے۔ جہاں خاندانوں میں عورتیں فرصت کے وقت ان طوطوں کو کھلاتیں، انہیں گنگا رام کہہ کر پکارتی تھیں۔ چونکہ ڈوگرہ خاندانوں میں اکثر نوجوان لام پر یعنی لڑائی کرنے کے لئے لمبے سفر پر چلے جاتے تھے، اس لئے ان کی گھر والیاں دل بہلانے کی خاطر طوطوں سے کھیلتیں۔ اُن سے باتیں کرتی تھیں۔

طوطوں کی طرح باز پالنے کا رواج بھی عام ہوتا تھا۔ باز پالنے کا رواج راجپوت میاں خاندانوں یا ٹھاکر خاندانوں میں عام ہوتا تھا جو اچھے باز کو اپنے تشخص کی علامت مانتے تھے۔ باز پالنے کے علاوہ ٹھاکر اور راج پوت خاندان کے لوگ فرصت کے موقعوں پر شکار کھیلنے کے شغل میں محو رہا کرتے تھے۔ اچھی بندوقیں اعلیٰ خاندانوں کی نشاندہی کرتی تھیں۔ راجپوت اور ٹھاکر گھرانوں کے لوگ اچھے شکاریوں کے دستے کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے کے لئے نکلتے تھے۔

دن بھر پرندوں اور چرندوں کے شکار کے بعد شام کو جنگل میں ہی بسیرا ہوتا۔ الاؤ جلائے جاتے۔ میاں خاندان کے افراد کے لئے آرام دہ جگہ بنائی جاتی۔ شکاری اپنے شکار کو صاف کرتے اور جنگلی شکار کی ضیافت تیار ہوتی جو الاؤ کے گرد بیٹھ کر کھائی جاتی اور پھر ساری رات ڈوگری بھاکھ گا گا کر دل بہلایا جاتا۔ شکار کا یہ شغل کئی دنوں تک جاری رہتا تھا۔

جموں شہر میں بزرگ لوگ شطرنج کھیلنے کے شغل سے اپنا من بہلایا کرتے تھے۔ شطرنج ایک اہم مشغلہ ہوتا ہے۔ اکثر دوپہر ڈھلنے کے بعد شہر کے چوکوں اور نکڑوں پر لوگ شطرنج کی بساط بچھا دیتے تھے اور شطرنج کے مقابلے کو دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہو جاتے تھے جو کھلاڑی کی ہر چال پر تبصرہ کرتے اور اپنی رائے دیتے تھے۔ اس طرح کھیلنے والے اور دیکھنے والے دونوں اس شغل سے برابر محظوظ ہوتے تھے۔ یہ شغل رات گئے تک چلتا تھا۔ لوگ اس کھیل میں اتنے محو ہو جاتے کہ انہیں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

''چھنج'' ڈالنا ایک اور اہم مشغلہ ہوتا تھا۔ گاؤں میں جوان اور بانکے کُشتی کا شوق رکھتے تھے اور ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی پہلوان ہوتا تھا جو اکھاڑے میں ورزش کر کے اور دودھ مکھن کھا کر اپنے جسم کو کُشتی کیلئے تیار کرتا تھا۔ جب میلے اور تہوار کا وقت آتا تو گاؤں والے اپنے نوجوانوں کو دنگل ڈالنے کے لئے آمادہ کرتے اور ڈھول بجاتے ہوئے میلے تک لے آتے۔ پھر میلوں میں ڈھول کی ڈگر ڈگر پر چھنج پڑتی اور پہلوان کو دکھا کر اکھاڑے میں اُتراتے پھر دنگل پڑتا۔ پہلوان ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک دوسرے کو زیر کرنے میں جٹ جاتے۔ دیر تک مقابلہ جاری رہتا۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر اپنے پہلوان کی داد دیتے اور خوش ہوتے۔ یہ مقابلہ تب تک جاری رہتا جب تک کہ دونوں میں سے ایک کی پیٹھ زمین سے نہ لگ جاتی۔ پھر جیتنے والے پہلوان کے گلے میں ہار ڈالے جاتے۔ اُسے کاندھے پر اُٹھا کر اکھاڑے میں گھمایا جاتا اور اُس کے حمایتی خوشی کے ساتھ اُسے لے کر اپنے گاؤں لوٹتے۔

یہ حقیقت ہے کہ ڈوگرہ علاقہ کے مشغلے بڑے انوکھے اور لبھاونے ہوتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں دل جوئی کے دوسرے وسائل دستیاب ہو چکے ہیں تو مینڈھے لڑانے، دنگل ڈالنے، باز اُڑانے، طوطے پالنے اور بازاروں کی چوکوں میں شطرنج کھیلنے کا رواج جاتا رہا ہے اور اب مشاغل سُکڑ کر دورافتادہ گاؤں تک محدود ہو چکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مشاغل کی باضابطہ طور پر عکس بندی کر لی جائے تاکہ جموں کی ثقافت اور تمدن کے اس خوبصورت پہلو کو آنے والی نسل تک پہنچایا جا سکے۔

......☆......

ڈوگری زبان اور کلچر

ڈوگری زبان

کسی بھی خطے کی تمدنی میراث اور ثقافتی ورثہ کی شیرازہ بندی میں وہاں کی زبانیں ایک اہم کڑی بن کر اُبھرتی ہیں۔ مقامی زبانوں میں عوام کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی، سماجی، اقتصادی اور تاریخی پہلوؤں کی جھلک ملتی ہے کیونکہ زبان اور عوام کا رشتہ اتنا نزدیکی ہوتا ہے کہ اس سے مکینوں کی سوچ، وطیروں اور ادراک کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے دُکھ اور سُکھ، خوشیاں اور غم، عروج اور زوال کی جھلک ملتی ہے۔ رسم و رواج، آرائش و زیبائش، میلوں اور مشغلوں پر روشنی پڑتی ہے اور تمدنی تاریخ پہلو بہ پہلو سامنے آنے لگتی ہے۔ اس لئے علاقے میں بولی جانے والی زبانوں پر بات کئے بغیر صوبۂ جموں کی تمدنی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

صوبۂ جموں میں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے پہلے ڈوگری زبان کی بات کریں گے۔ عموماً ڈوگری زبان کا خطہ دریائے راوی اور چناب کے درمیان واقع تمام پہاڑی اور میدانی حصے کو مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پیر پنچال میں ڈوگری نے اپنے پاؤں سُندر بنی اور کالاکوٹ تک پھیلائے ہوئے ہیں۔ اُدھر ہماچل پردیش کے کچھ علاقوں، گورداس پور، پٹھان کوٹ، سرحد پار کے علاقہ شکر گڑھ، چھمب اور بھمبر میں بھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ ڈوگری بولی جاتی ہے۔

''ڈوگر'' لفظ سنسکرت کے لفظ ''دوی گرت'' سے نکلا ہے جس کے معنی سروین سر اور مان سر کے درمیان کا علاقہ ہے۔ جہاں کی زبان ڈوگری ہے اور آج کل جو زبان مادھو پور سے لے کر شوالک کی پہاڑیوں، علاقہ کنڈی کو پار کرتے ہوئی بانہال تک بولی جاتی

ہے، وہ اصلی صورت میں ڈوگری مانی جاتی ہے جبکہ میدانی علاقوں میں ڈوگری کے پنجابی سے ملاپ کے بعد اس پر ہمسایہ زبان کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

پڑوسی زبانوں کی طرح ڈوگری زبان کو بھی اپنے ماخذ کی تلاش رہی ہے۔ زبان اگر تحریری صورت میں نہ ہو تو وہ اُس دریا کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں مختلف اطراف سے آنے والے ندی نالے شامل ہو کر اس کی اصلی صورت پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ڈوگری زبان کا لوک ادب بھی ان ہی ادوار سے گُزرا ہے اور یہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنا لہجہ، معنی اور ہیئت بدلتی رہی ہے۔ آج سے 70 برس قبل تک ڈوگری میں ادبی اور تحریری روایات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لیکن مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انیسویں صدی میں ڈوگری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر اس کا اپنا تشخص قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کتابیں تحریر کروائی تھیں اور تراجم کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ انہوں نے ڈوگری رسم الخط کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کی تھی تا کہ ڈوگری کو اُس کے درست تلفظ کے ساتھ لکھا اور پڑھا جا سکے۔ مہاراجہ نے ڈوگری رسم الخط میں سنسکرت کتابوں کا متن از سر نو شائع کرایا تھا تا کہ اس زبان کو فروغ مل سکے اور یہ زبان عروج کی طرف بڑھ سکے۔ لیکن مہاراجہ کی وفات کے بعد ڈوگری زبان کی ترقی اور ترویج کا سلسلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس کے باوجود نجی طور پر ڈوگری لکھنے والوں نے ڈوگری کی شمع کو روشن رکھا جس کی وجہ سے ماہر لسانیات پہاڑی زبانوں کے گروہ میں ڈوگری زبان کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

مشہور تاریخ دان بین (Bein) نے پہاڑی زبانوں کے گروہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا گروہ مشرقی پہاڑی ہے جو نیپال میں بولی جاتی ہے۔ وہاں اسے خشورہ کہتے ہیں۔ درمیانی پہاڑی گروہ الموڑہ اور گڑھوال میں رائج ہے جہاں اسے کماونی کہتے ہیں جبکہ تیسرا گروہ مغربی پہاڑی ہے جو ہماچل سے لے کر صوبہ سرحد تک بولی جاتی ہے۔ ڈوگری زبان مغربی پہاڑی گروہ کی ہی ایک شاخ ہے جو صوبہ جموں میں راوی اور چناب کے درمیان تمام پہاڑی اور میدانی علاقوں میں عوام کی مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ

پنجاب کے علاقہ گورداس پور، پٹھانکوٹ، ہماچل کے کچھ علاقے، سرحد کے اُس پار شکرگڑھ، سیالکوٹ، چھمب اور بھمبر وضلع راجوری میں سندربنی اور کالاکوٹ کے کچھ گاؤں میں بھی ڈوگری کا چلن ہے جومختلف علاقوں میں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے۔

ڈوگری زبان کا اپنا رسم الخط ہے جوٹاکری سے ملتا جلتا ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس رسم الخط کو دیوناگری کے قریب لانے کی سعی کی تھی لیکن اب دیوناگری پرانے رسم الخط پر حاوی ہوچکی ہے۔پچھلے ستر برسوں میں ڈوگری زبان نے ترقی اور ترویج کا ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ 1958ء کے بعد ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی وساطت سے ڈوگری زبان کی بھی پذیرائی ہونے لگی اور انفرادی سطح پر لکھنے والوں کو اسٹیج مل گیا۔

جدید ڈوگری شاعری میں دینوں بھائی پنت کا نام سرفہرست ہے جوڈوگر کی لوک شاعری سے متاثر رہے ہیں جس میں بہادری کے نغمے، سپاہی کے کارنامے اور گھر والوں کی لام (جنگ) پر جانے والے نوجوانوں کی یاد، موسموں کے رنگ اور محبت کا رس ملتا ہے۔ اصل میں جدید ڈوگری شاعری کا آغاز حُب الوطنی کے نغموں سے ہوا۔ پنڈت ہرمت ملک، رگھو ناتھ سنگھ، دینو بھائی پنت، ویدپال دیپ، کے۔ ایس۔ مدھوکر، موہن لعل سپولیا، یش شرما، تاراسمیلپوری اور رام ناتھ شاستری کی شاعری مندرجہ بالا جذبوں سے سرشار اور لبریز رہی ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی شعور بھی نمایاں نظر آتا ہے اور یہ شاعری دائیں بائیں اور درمیانی خیالات کے رجحانات سے لبریز نظر آتی ہے۔ دینو بھائی پنت کی شاعری میں حقیقت پسندی کا بڑا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔

دینو بھائی پنت کو اپنا وطن نہایت خوبصورت لگتا ہے۔ وہ شاعری کے ذریعے اپنے دیش اور ملک کے بارے میں یوں لکھتے ہیں ۔

میرے دیسے دا شلیلیا
میری اکھیں کنّے دکھ
(میرے دیش کی خوبصورتی کو میری آنکھ سے دیکھو)

کرشن سمیل پوری کی شاعری جہاں لوک رنگ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے وہیں وطن پرستی سے بھی لبریز ہے۔

میرے دیش نی شان گنا

سُر گے دی گل نیں لا اڑیا

(جنت کی بات چھوڑو اور میرے دیش کی بات کرو)

کرشن سمیل پوری نے عوامی گیت لِکھ کر ڈوگری زبان کو عوام میں مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔اُن کے گیتوں میں جہاں ڈوگر دیش کی خوشیاں اور محبت کی جھلک ملتی ہے وہیں یہاں کے دُکھ اور کرب کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

یش شرما کی شاعری میں جہاں حسن کی پرتیں اور گہرے جذبات ملتے ہیں وہیں ان کی نظم ''امن'' اور ''میرے ساتھی'' میں وہ ایک آفاقی لب ولہجہ سے بات کرتے ہیں اور دُنیا انہیں دوستوں سے پُر نظر آتی ہے۔شاعری میں رویّے کی تبدیلی کا احساس مدھوکر کے کلام سے ہوتا ہے۔ 1930ء سے 1950ء تک ڈوگری شاعری میں حُب الوطنی کی شاعری کا دور کہا جاتا ہے۔اس کے بعد مدھوکر نئے جذبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

دیسا گی بنانا تے مٹانا ئُندے ہتھ اے

اُس کے بعد لوگ علاقہ ڈگر سے اوپر اُٹھ کر ملک کی سطح پر آ کر شاعری کرنے لگے۔ دینو اور یش شرما نے امن عالم اور دوسری عالمی تحریکوں سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ یش شرما کی نظم 'امن دی لُوڑ' (امن کی ضرورت) بھی نئے دور کے رویوں سے متاثر ہے۔ جبکہ المست اپنی مخصوص صوفیانہ لے میں انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہندو اور مسلمان اور دوسرے لوگ۔امتیاز کِس لئے، یہ سبھی تو خدا کی مخلوق ہیں اور پھر انسان کیا اور خدا کیا۔

آؤں کے آں تے توں کے ایں

(میں کیا ہوں اور تم کیا ہو)

اُدھر مدھوکر انسان اور کائنات کا وسیع تصور رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں کشمکش صرف انسان اور فطرت کے درمیان ہے۔ دنیا میں اتنے مظالم ڈھائے گئے مگر آسمان ایک خاموش تماشائی ہے۔

امبر کھڑ وتا چپ چاپ دکھدا

(آسمان چُپ چاپ کھڑا دیکھ رہا ہے)

اُن کے مطابق فطرت نے ہمیشہ انسان کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے لیکن مدھوکر امید نہیں چھوڑتے کیونکہ انسانی قوتوں کو بھی سرنگوں نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی کے بعد 1958ء میں کلچرل اکیڈیمی کا وجود عمل میں آیا تو ڈوگری زبان و ادب کی ترقی کے لئے ہمہ گیر کاوشیں ہوئیں اور ڈوگری لکھنے والوں کی نئی نسل سامنے آئی۔ پھر ڈوگر سنستھا جموں کا قیام عمل میں آیا جہاں ڈوگری شاعروں اور ادیبوں کو ایک ایسا اسٹیج ملا جہاں وہ اپنی تخلیقات کُھل کر پیش کرتے، جس پر بحث و تنقید ہوتی اور نئے رجحانات کی طرف اشارے ملتے۔ اس طرح کلچرل اکیڈیمی اور ڈوگری سنستھا کی وساطت اور پذیرائی سے ڈوگری میں سلسلہ وار کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا دور آیا۔ ریڈیو کشمیر جموں اور دوردرشن جموں کے ذریعے بھی ڈوگری زبان وادب اور ڈوگری تمدن کو فروغ ملنے لگا۔ آج سے تقریباً چالیس سال قبل رام کمار ابرول کی ڈوگری فلم "گلاں، ہوییاں بیتیاں" ڈوگری عوام کو انمول تحفہ دیا تھا اور لوگوں کو احساس ہوا کہ اس زبان میں فلمیں بھی بن سکتی ہیں۔ ابرول نے اپنی کہانیوں کے ذریعے بھی عوامی زندگی کی منظر کشی کرنے کی اس انداز میں کوشش کی کہ جس سے ڈوگری کے ادیبوں کو نئے راستے اور نئے اُفق نظر آنے لگے۔

اگر ڈوگری سنستھا کی بات کریں تو رام ناتھ شاستری کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر رام ناتھ شاستری جدید ڈوگری زبان وادب کی ترقی و ترویج کے معماروں میں سے ہیں۔ آپ نے ڈوگری زبان و ثقافت کیلئے جم کر تحریک چلائی اور وہ زبان جسے اپنے بھی بولنے سے کتراتے تھے اُسے مقبول عام کرنے میں معاون ثابت ہوئے اور اپنی زندگی میں

ہی اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ڈوگر علاقے کی دلوں میں اترنے والی لوک موسیقی، ڈوگر لوک رنگ اور پرانے زمانے کی اہم شخصیات، قومی ہیرو اور ملک کی سربلندی کے لئے قربان ہونے والے سرفروشوں کی لوک باریں جو وقت کی گرد سے اٹی پڑی تھیں، انہیں عوام میں متعارف کرنے اور مقبول بنانے میں موصوف نے اہم رول ادا کیا ہے۔

1944ء میں آپ نے چند دوسرے ادیبوں سے مل کر جموں ڈوگری سنستھا کی بنیاد رکھی۔ یہ سنستھا بسنت پنچمی کے دن 1944ء میں وجود میں آئی جو آج بھی نو بہ نو ہے۔ اس کے بنیادی ممبران میں پروفیسر رام ناتھ شاستری کے علاوہ دینو بھائی پنت، این ڈی مشرا اور ڈی سی پرشانت شامل تھے۔ سنستھا کا بنیادی مقصد ڈوگر عوام کے دلوں سے اپنی مادری بولی کے تئیں غفلت شعاری کو دور کرنا اور احساس کمتری کو ختم کرنا تھا۔ 1950ء میں ڈوگری سنستھا نے ڈوگری شاعری پر مبنی پہلی کتاب ''جاگو ڈگر'' چھاپی جسے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کو پروفیسر رام ناتھ شاستری نے ایڈٹ کیا تھا۔ شاستری صاحب نے 1948ء میں نیشنل کانفرنس کے ٹکری اجلاس میں ڈرامہ باوا جتو پیش کر کے ہلچل مچادی تھی۔ یہ ڈرامہ پروفیسر رام ناتھ شاستری، دینو بھائی پنت اور رام کمار ابرول نے مل کر لکھا تھا۔

رام ناتھ شاستری نے ڈوگری میں چودہ ڈرامے لکھ کر ڈوگری ادب کو زرخیز کرنے کے لئے اہم کاوش کی تھی۔ پھر شاستری جی کی قیادت میں 1967ء میں ڈوگری سنستھا کی طرف سے چیتا نام کا رسالہ شروع ہوا جس کے 75 شمارے موصوف نے ہی ایڈٹ کئے تھے۔ رام ناتھ شاستری نے تمام عمر ڈوگری زبان وادب کی خدمت میں گزار دی تھی۔ شاستری کی شاعری میں نئے انداز نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فتح کس لئے اور کس پر۔ ایک ملک کی غیر منصفانہ فتح دوسرے کی ہار ہو سکتی ہے اور قومی ہیرو جس نے دوسرے ملک کو زیر کیا وہاں کے باشندوں کے لئے ظالم ثابت ہوسکتا ہے۔ اپنی نظم پوڑان میں شاستری کشمیر کی تہذیب کو، وہاں کے فنکاروں کو، للیشوری، مہجور اور نادم جیسے شاعروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں کشمیر کا تمدن چنار اور سفیدے کی طرح خوبصورت اور شاندار ہے۔

پدما سچدیو:

ڈوگری زبان میں رام ناتھ شاستری، دینو بھائی پنت اور مدھوکر کے بعد اگلی پیڑی میں پدما سچدیو کا نام سرفہرست ہے۔ آپ کی پیدائش 1940ء میں پُرمنڈل میں سنسکرت کے عالم پروفیسر جے دیو کے ہاں ہوئی اور بچپن سے ہی ڈوگری زبان وادب کی طرف دل مائل ہوگیا اور پھر پوری زندگی اس کی خدمت میں گزاردی ہے۔ آپ ڈوگری کی پہلی خاتون شاعرہ مانی جاتی ہیں۔ آپ نے ڈوگری کی قالین کو رنگ برنگے پھولوں سے سجایا اور سنوارا ہے اور ڈوگری زبان اور کلچر کا ہار سنگھار کرکے ملکی سطح پر پیش کیا ہے۔ آپ نظم اور نثر میں بہترین لکھتی ہیں اور ڈوگری اُفق پر درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہی ہیں۔ زندگی میں نشیب وفراز کے باوجود پدما جی کی تخلیقات ہر دور میں نو بہ نو، تازہ اور مہک سے بھرپور رہی ہیں۔ تحریروں میں مٹھاس، رس، نیاپن اور نئی سوچ ملتی ہے۔ انداز، سادہ رنگ، عوامی اور خوبصورت زبان نے مل کر آپ کے فن کو مقبول کیا ہے۔ آپ کی تخلیق دلوں کو چھوتی ہی نہیں بلکہ دلوں میں اُترتی بھی چلی جاتی ہے۔ آپ ڈوگری زبان کی پہلی ادیبہ ہیں جنہیں 2001ء میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ مدھیہ پردیش حکومت نے کبیر سمان دے کر آپ کی پذیرائی کی اور ابھی حال ہی میں پدما جی کو سرسوتی سمان بھی ملا ہے۔ آپ کا ناول ''اِک سی سُکھی'' ڈوگری کا شاہکار ناول ہے۔

آپ نے اپنی سوانح حیات 'چت چیتے' لکھ کر ڈوگری ادب میں اچھوتا تجربہ کیا ہے۔ آپ کو شاعری کی کتاب ''میری کویتا، میرے گیت'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی حاصل ہو چکا ہے۔ لتا منگیشکر نے آپ کے ڈوگری گیتوں کو اپنی سُریلی آواز میں گا کر ڈوگری شاعری کو ملکی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ جن میں ''پھلا شپاییا ڈوگریا'' اور ''توں مِلا توں'' نہایت مقبول گیت ہیں۔ آپ کے کچھ فلمی گیت فلمی گائک بھوپندر اور مہندر کپور نے بھی گائے جن میں مہندر کپور کا گایا ہوا گیت ''مٹھری ابیہ ڈوگریں دی بولی تے مٹھرے نے

لوک ڈوگر'' (ڈوگروں کی زبان بھی میٹھی ہے اور ڈوگرے خود بھی بڑے میٹھے لوگ ہیں) قابل ذکر گیت ہے۔ پدما سچدیو 2021 میں پرلوک سدھار گئیں۔

وید پال دیپ ڈوگری کے ترقی پسند ادیبوں میں صف اوّل کے شاعر تھے۔ آپ نے ڈوگری غزل میں نئے نئے تجربے کئے۔ آپ کی کتاب ''اس نے آں بنجارے لوک'' منظر عام پر آچکی ہے۔ آپ کی شاعری میں امیری غریبی کے موضوعات، حالات سے بغاوت، نئی دُنیا کی امید، جارح نظام کے خلاف جد وجہد کا انداز واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ کلام میں ٹھیٹھ ڈوگری الفاظ کا خوبصورتی کے ساتھ استعمال اور غزل کو ڈوگری لباس میں پیش کرنے کا انداز وید پال دیپ کی پہچان رہی ہے۔ دیپ جی کا ایک شعر ملاحظہ کریں ۔

وہم غہ میریاں غریبہ داملاپ
اِیندی اک دن ٹھرکنی غہ ٹھرکنی

(امیروں اور غریبوں کا ملاپ ایک وہم ہے
کیونکہ ان کی آپس میں ایک دن لڑائی ہونی ہی ہے)

وید پال دیپ کل کی بات کرتا ہے جب وہ اکیلا تھا لیکن اب اس کے ہزاروں ساتھی ہیں۔

کل ہے ساں اکلا میرے ساتھی نیں گنیون اج
(کل میں اکیلا تھا پر آج میرے ساتھی گنتی سے باہر ہیں)

موہن سنگھ ڈوگری ادب کے البیلے باغی اور بااثر ادیب ہیں جنہوں نے ڈوگر زبان وادب میں اپنے راستے خود چُنے۔ خود ان راستوں پر سفر کیا اور اپنی تخلیقات کا لوہا منوایا ہے۔ ہٹ کر لکھنے کا انداز موہن سنگھ کی تخلیقات کو جہاں تازگی عطا کرتا ہے وہیں اسے دوسروں سے جُدا بھی کرتا ہے۔ موہن سنگھ پچھلے چالیس برسوں سے لگاتار نظم، نثر اور ڈراموں کے ذریعے ڈوگری ادب پر اَن مٹ چھاپ چھوڑ رہے ہیں۔ اس باغی اور انا والے شاعر اور ادیب نے نظم اور نثر سے ڈوگری ادب کو ہی نہیں عوام کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا

ہے۔آپ کے لکھنے کا انداز دوسروں سے بالکل ہٹ کر ہے۔آپ وہ لکھتے ہیں جو عام ڈوگرہ بسر کرتا ہے، جو اس پر بیت رہی ہے جس کے خلاف وہ صف آرا ہے۔ جہاں شاعری میں آپ کی دھوم ہے وہیں ڈوگری ڈرامے،نکڑ ڈرامے اور تھیٹر کے میدان میں ڈوگر دیس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔آپ نے جو لکھا معتبر انداز سے لکھا، تازگی سے لبریز لکھا۔ نئے انداز اور نئے تجربوں کے ساتھ لکھا ہے جس کے باعث ڈوگری ادب میں آپ کی پہچان اور شناخت منفرد ہے۔

موہن سنگھ کے بارہ فل پلے ناٹک شائع ہوئے ہیں، جن میں کالا سورج کا ہندی، انگریزی اور تامل میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اُن کا ڈرامہ ''اپنی ڈفلی، اپنا راج'' ہندی میں ترجمہ ہوا ہے۔اس ڈرامے پر آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ایک مقبول ڈراما ''پنچ پر پنچ'' کا ہندی ترجمہ ہو چکا ہے۔اس طرح موہن اپنے ڈراموں کے ذریعے ڈوگری ادب کو دوسری زبانوں کے پڑھنے والوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔آپ نے نکڑ ناٹک کی ایک کتاب لکھی ہے جس میں آپ کے چودہ نکڑ ناٹک شامل ہیں۔ سات شاعری کی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں غزل پر مبنی کتاب گیت کار کو کلچرل اکیڈیمی کا انعام ملا ہے۔موہن سنگھ نے ڈوگری میں ٹی وی سیریل لکھے اور اُن کو خود ڈائریکٹ بھی کیا ہے جن میں ''نشہ'' نام کا سیریل نہایت مقبول ہوا۔اس وقت آپ کی چار کتابیں پریس میں ہیں اور آپ کا ادبی سفر ابھی شباب پر ہے۔آپ کی شاعری سے چند شعر ملاحظہ کریں ؎

دھرتی کی ٹک ماراں
یا چنیہَ کی نِگلاں
میں جُگیں جُگیں توں
ان مُکی پھوکھ آں

(جی چاہتا ہے کہ زمین کو چبا جاؤں یا پھر چاند کو نگل لوں کیونکہ میں گیُوں گیُوں اَن مٹی بھوک ہوں)

موہن سنگھ جہاں ڈوگری ادب وثقافت اور ڈوگری تمدن کے فروغ کے لئے کوشاں رہے ہیں وہیں ڈوگری زبان کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے انہوں نے زبردست جدوجہد کی ہے۔ وہ اس مجلس کے کنوئنیر تھے جس کی کاوشوں کی بدولت ڈوگری زبان کو 2003 میں آئینِ ہند کے آٹھویں شیڈیول میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ آج بھی اپنے نُکڑ ناٹک لے کر گاؤں گاؤں نکل جاتے ہیں اور عوام سے روبرو ہوتے ہیں۔ ان کے ادب میں عوام کی زندگی چھائی ہوئی ہے۔

چھتر پال ڈوگری زبان کے ایک کہنہ مشق کہانی کار ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کا ڈوگری سماج کے خمیر کے ساتھ تانا بانا جوڑتے ہیں اور زمین کے ساتھ جُڑے ہوئے کہانی کار ہیں۔ چھتر پال ڈوگری سیریل لکھنے میں اہم نام ہے جن کے ڈوگری سیریل نہ صرف ٹی وی پر مقبول ہوئے ہیں بلکہ عوام کی آواز بن کر سامنے آئے ہیں۔ چھتر پال ماضی کی ڈوگر زندگی سے استفادہ کر کے آج کے دور سے جُڑ کر آنے والے زمانے کی بات کرتے ہیں۔

نرمل سنگھ دیو جموال ایک اور بزرگ کہانی کار ہیں جو روایتی انداز میں لکھنے کے باوجود آج کے ماحول کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے کردار سماج کی بُرائیوں، غریبی کے مسائل اور ڈوگر عوام کی زندگی کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اوم گوسوامی کی کہانیوں کے دو مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ ماضی کو ساتھ لے کر آج کے دور کے عکاس کہانی کار ہیں۔ اُن کی ڈوگری ادب کی تنقید پر گہری نظر ہے اور تنقید پر ان کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

درشن درشی ڈوگری کے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غزل لکھنے میں اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزل میں ایسے موضوعات پر شعر لکھتے ہیں جو نئے اور اچھوتے ہوتے ہیں اور قاری اُن کے شعر پڑھتے یا سُنتے ہوئے

چونک جاتے ہیں۔ درشنی نے ڈوگری میں ایک ناول بھی لکھا ہے۔

ڈوگری میں پرانے لکھنے والے شاعروں اور کہانی کاروں نے جہاں اپنا تخلیقی سفر انجام تک پہنچایا وہیں نئے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات کو نئے دور کے سانچوں میں ڈال کر اسے جدید ادب سے جوڑ دیا ہے۔ اُن کی تحریروں میں آج کے مسائل اور معاملات چھائے ہوئے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں اودھم پور کے جگدیش دوبے کا نام سرفہرست ہے جن کی کہانیوں کا مجموعہ سلنگشن منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی کہانی نئے اور اچھوتے موضوعات کے ساتھ سامنے آتی ہے جس میں مٹی کی خوشبو واضح طور سے ملتی ہے۔ وہ انسانی کرداروں کے علاوہ بھی کردار گھڑنے کی مہارت رکھتے ہیں اور پڑھنے والا اس نئے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اُدھر ریاسی کے راج راسی ایک اچھے کہانی کار ہیں اور اُن کی کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کہانی کا پلاٹ نیا ہوتا ہے جس میں آج کے دور کی زندگی کی مہک ملتی ہے۔

راجیشور سنگھ راجو اگر چہ صحافی بھی ہیں لیکن کہانی ان کی پہچان رہی ہے۔ اُن کی کہانیوں میں ڈوگر دیش کے عوام کے مسائل اور ڈوگری ماحول رچا بسا ہوتا ہے۔ راجیشور شاعری بھی کرتے ہیں اور جدید دور کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔

للت منگوترہ ایک اور منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ اُن کی تحریروں میں نہ تو تھکاوٹ دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی باسی پن ملتا ہے۔ کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''ہیلو مایا'' ایک ایسا مجموعہ ہے جسے جدید ڈوگری ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ للت منگوترہ کی تخلیقات میں جدید سوچ اور نئے نئے تجربے ملتے ہیں جن میں علامتوں کے ذریعے باطنی منظر کشی کے رنگ واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ابنارمل ریلیشن پر لکھنا ان کا اہم موضوع رہا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو جہاں متاثر کرتے ہیں وہیں کہانی کو محسوس کرنے کے لئے راغب بھی کرتے ہیں۔ للت منگوترہ ڈوگری میں شاعری بھی کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی

نظموں کا ہندی ترجمہ بھی کیا ہے۔ شاعری میں ان کا انداز اور لہجہ دوسروں سے ہٹ کر ہے۔

سُشیل بیگانہ غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ڈوگری کے ٹھیٹھ الفاظ کا بہترین طریقے سے استعمال کیا ہے اور ڈوگر دیش کے رنگ برنگے ماحول سے ڈوگری غزل کو نیا لباس عطا کیا ہے جو دوسرے ادیبوں کے ہاں نہیں ملتا۔

آج ڈوگری لکھنے والوں میں ڈوگر کی عورتیں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ اس وقت پدما سچدیو کے بعد میر میلا منہاس ڈوگری شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ جنہوں نے ڈوگر علاقے کے باہر بھی ڈوگری شاعری کو مقبول کرنے کی کاوشیں کی ہیں۔ اُدھر ودیا ٹھاکر ایک اور نام ہے۔ ودیا شاعری کرتی ہے اور مشاعروں میں سُریلی آواز میں گا کر مشاعرہ لوٹ لیا کرتی ہیں۔ آپ نے ڈوگری زبان میں بڑے خوبصورت ٹپے لکھے ہیں۔

سرجیت ہوش برسلی ڈوگری غزل کے ماہر شاعر ہیں جن کا تعلق اودھم پور سے ہے۔ آپ نہ صرف خود ڈوگری شاعری سے ڈوگری ادب کو مالا مال کر رہے ہیں بلکہ اودھم پور میں آپ نے پچیس شاعروں اور ادیبوں کی ایک جماعت ''میری متر منڈلی'' کے نام سے بنائی ہوئی ہے۔ اُدھر بھڈ و بلاور میں اشوک امبر کا اچھی غزل لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔

اگر ڈوگری زبان و ادب کی بات ہو تو ڈوگری سنستھا کی بات کرنا ضروری ہے۔ ڈوگری سنتھا 1944ء میں قائم ہوئی تھی اور متواتر آج تک ڈوگری قلم کاروں کے لئے ایک سٹیج کا کام کر رہی ہے۔ ہر دوسرے اور چوتھے سنیچروار کو ڈوگری شاعر اور ادیب ڈوگری سنستھا میں اکٹھے ہوتے ہیں، اپنی تازہ تخلیقات پیش کرتے ہیں جن پر سیر حاصل بحث اور تنقید ہوتی ہے۔ خاص کر نئے شعرا اور کہانی کاروں کی تخلیقات کو تراشنے اور نوک پلک سنوارنے میں ڈوگری سنستھا کا اہم رول رہا ہے۔ یہ سنستھا ڈوگری میں لکھے جانے والے ادب کو چھاپنے کا کام بھی کرتی ہے اور ڈوگری ادب کے فروغ کے لئے ایک رسالہ بھی نکالتی ہے۔ اس سنستھا کو چلانے میں للت منگوترا کا اہم رول رہا ہے جنہوں نے رام ناتھ شاستری کی اس تنظیم کو سنبھالا ہوا ہے۔ ڈوگری زبان کے قلم کاروں میں اگر شوم ہتہ کا ذکر نہ کیا

جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ شومہتہ کو ڈوگری زبان اور لوک ادب پر دسترس حاصل ہے۔ وہ ڈوگرہ فوک لور سے اپنی کہانیوں کا خمیر اُٹھاتے ہیں اور پھر دورِ جدید کے حالات سے ملا کر ایسی کہانی لکھتے ہیں کہ ان کی تخلیق پرت در پرت اثر چھوڑتی ہے۔ آپ کی ڈوگری زبان میں پانچ کتابیں آ چکی ہیں جن میں تین کتابوں کے مجموعے یعنی پھان، نبا اور پیڑیاں دی پیڑ شائع ہوئے ہیں جبکہ ڈراموں کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے ''بنّہ'' پر آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے جبکہ 'سنسکار' پلے پر سٹیٹ اکیڈمی کی طرف سے آپ انعام حاصل کر چکے ہیں۔

ڈوگری تنقید کے عمل میں ابھی کام کرنے کی گنجائش ہے۔ ڈوگری تنقید میں قابل ذکر نام للت منگوترا، اوم گوسوامی اور نرسنگھ دیو جموال ہیں۔ للت منگوترہ کی ڈوگری تنقید پر کتاب ''میری سوچ، میرے شبد'' شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح اوم گوسوامی کی تنقید پر کتاب آ چکی ہے۔ اُدھر ڈوگری غزل پر تنقید کے موضوع پر کرنل راز مناوری کی دو کتابیں آئی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈوگری میں جم کر تنقیدی کام نہیں ہوا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا مقصود ہے تا کہ ڈوگری ادب کی نوک پلک سنواری جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبۂ جموں کے ڈوگری بولنے والے علاقوں میں ڈوگری کی انجمنوں نے زبان وادب کو عوام تک پہنچانے اور ڈوگری تمدن کے فروغ میں اہم کام کیا جن میں ڈوگر سنستھا جموں سرفہرست ہے۔ 1980ء کے بعد موہن سنگھ اور للت منگوترہ جیسے ڈوگری کے مشعل برداروں نے اس زبان کے فروغ، وسعت اور مقبولیت کے لئے زبردست جدوجہد کی اور اسے آٹھویں شیڈول میں شامل کروا کر ڈوگری کو ملکی سطح پر اجاگر کیا۔ جبکہ ڈوگری کے خادموں نے نجی طور پر انجمنیں بنا کر اور کتابیں لکھ کر اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ آج شاعری کے میدان میں اس کے خزانے بھرے جاتے ہیں اور نثر میں کہنہ مشق ادیبوں نے ڈوگری زبان کو شاداب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ایک لمبی جست کے بعد ڈوگری زبان کو اُس مقام پر لے آئے ہیں جہاں سے وہ اس کا موازنہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کر سکتے ہیں۔

ڈوگری لوک ادب

ڈوگری لوک ادب کا سرمایہ بڑا وسیع، پُرمعنی اور دلنواز ہے۔ یہ ادب نظم اور نثر دونوں میں دستیاب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری ازل سے ہی ہر زبان میں جذبات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنی رہی ہے۔ جب سے انسان بول چال کرنے، کہنے اور سمجھنے لگا ہے، لوک گیتوں اور لوک ادب کا اظہار ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ لوک موسیقی بھی وجود میں آتی چلی گئی۔ کیونکہ ہر لوک گیت کی ایک دُھن ہوتی ہے۔ لوک گیتوں کا مواد اگر چہ کھردرا ہوتا ہے لیکن تہہ در تہہ معنوں سے بھر پور اور سریلا ہوتا ہے۔ لوک گیت دراصل انسانی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں چونکہ لکھنے کا رواج نہ ہوتا تھا، اس لئے لوگ زبانی لوک گیت سوچتے، اُن کو ترتیب دیتے اور عوام کے سامنے سُنایا کرتے تھے۔ جو گیت رس دار، پُرمعنی اور عوامی زندگی کے خمیر سے بُنے جاتے تھے وہ عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتے تھے اور خود بخود عوامی گیت بن جاتے تھے اور پھر لوگ اس لوک ورثے کو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتے رہتے اور پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سبھی لوگ اس جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

ڈوگری لوک ادب دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی لوک شاعری اور لوک کہانیاں۔ جہاں تک ڈوگری لوک گیتوں کا تعلق ہے اس میں مختلف رنگوں کے گیت ملتے ہیں جیسے بزمیہ رنگ، موسمی رنگ، قصے کہانیوں پر مبنی گیتوں کے رنگ، ملن اور جدائی کے رنگ، محبت اور عشق کے رنگ، فصلوں کی بُوائی کٹائی کے رنگ، میلے تہواروں پر گائے جانے والے گیتوں کے رنگ، شادی بیاہ کے رنگ، کارکوں (مذہبی گیت) کے رنگ شامل ہیں۔ اسی طرح ناچ کے وقت گائے جانے والے گیتوں کے رنگ، چھند سٹھنیاں، بین وغیرہ بھی گائے جاتے ہیں۔ کچھ نظمیں دیوی دیوتاؤں، سنتوں اور صوفیوں کی یاد میں گائی جاتی ہیں جنہیں کارکیں کہا جاتا ہے۔ جبکہ جوانمردوں اور بہادروں کی یاد میں گیتوں کو باریں کہا جاتا ہے۔ کارکوں اور باروں کو

عام طور پر گاؤں میں بھاٹ، جوگی یا میراثی گاتے ہیں۔ یہ گیت عوامی زندگی سے جڑے ہوتے ہیں اور چوکوں، نکڑوں پر لوگوں کو اکٹھا کر کے بھی گائے جاتے ہیں۔

ڈوگری میں کارکوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ یہ طویل نظمیں ہیں۔ ہر گیت دعا یا مناجات سے شروع ہوتا ہے۔ ڈوگری کی مشہور کارکوں میں باوا جتو، داتا رانو اور بہورل اہم ہیں۔

باوا جتو کٹرا کا رہنے والا ایک غریب کسان تھا۔ لیکن گاؤں میں مخالفت کے باعث وہ گھر چھوڑ کر جموں کے موضع سانبہ چک میں آ گیا۔ یہ علاقہ مہتہ بیر سنگھ کا تھا جو جموں کے راجے کا رشتہ دار تھا۔ جتو نے بیر سنگھ کے کہنے پر جھڑی میں ایک بنجر قطعے آباد کیا اور فصل کا تیسرا حصہ بیر سنگھ کو قرار دینا طے پایا۔ جب فصل تیار ہوئی تو بیر سنگھ نے آدھے حصے کی مانگ کی۔ دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور غصے میں جتو نے اناج کے ڈھیر پر بیٹھ کر خنجر گھونپا اور خودکشی کر لی۔ اُن کی موت ناانصافی کے خلاف بغاوت تھی۔ پہلی بار جموں علاقے میں کسان نے اپنی محنت پر برابری کا حق جتایا تھا اور مرتے وقت جتو نے بیر سنگھ کو للکارا تھا:۔

سُکی کنک نہ کھایاں مہتہ

دنایں ماس رلالی

(او مہتہ تو سوکھی گندم نہیں کھا سکے گا۔ میں اُس میں اپنا گوشت ملا دیتا ہوں)

جتوں کی کارک میں اُس کی زندگی کے تمام حالات ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں اور گانے والا جب کسانوں کے درمیان یہ کارک گاتا ہے تو کسان اسے اپنے تشخص کی علامت سمجھتا ہے۔

باوا جتو کی ولادت کا ذکر یوں ہوا ہے:

گھر روپا دے ٹھاگور تروٹھے

او تس نارا ینے لالی

بھلے پچھتر جنم بابا دا

ناریں منگل گالی

(ایشور روپا پر خوش ہوا اور اس کے گھر اچھی گھڑی میں بیٹے نے جنم لیا۔ اس موقعے پر عورتوں نے خوشی کے گیت گائے)

جتو کی شادی کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے:

ماگھ مہینہ نویں دی لگی
دِتا بیا رچائی
شیل ونتی نیک گلے دی
لیالی بابے بیائی

(ماگھ مہینے کی نویں تاریخ کو شادی ہونا قرار پائی اور بابا کی شادی نیک خاندان کی لڑکی شیل ونتی سے ہوئی)

کارک کا آخری حصہ یوں ہے:

ئدھولے میرے کھولی اُڑیاں
میری بُوا کی گھار پنچائی
پگڑی کٹارا جت مل بابا
چڑھیا ڈھیرا پر جائی
ممتا چھوڑی جت مل بابا
چھاتی کٹارا لائی
کنکے دے بچ ٹرنے بابا
پنچھیں رولا پائی

(میرے سفید بالوں کو کھول دینا اور بیٹی کو گھر پہنچا دینا۔ جت مل بابا نے خنجر پکڑا اور اناج کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ بابا نے ساری موہ مایا چھوڑ دی اور سینے میں خنجر گھونپ لیا۔ پھر گیہوں کے ڈھیر پر تڑپتا رہا اور پرندوں نے شور وغل مچا دیا)

داتا رانو کی کارک بھی اچھائی اور بُرائی کے بیچ لڑائی کی داستان ہے جس میں

گاؤں کے دو مخالف گروہوں کے زمین کی ملکیت کے جھگڑے میں داتا رانو کو ثالث بنایا گیا۔ اُس نے کمالِ ذمہ داری کے ساتھ فیصلہ سُنایا اور غاصب کے جھانسے میں آنے کے بجائے حق کا ساتھ دیا اور اپنے خون سے فیصلے کو انجام تک پہنچایا۔ اس نظم میں داتا رانو عدل کا دیوتا بن کر اُبھرتا ہے اور بانگی جو ظلم کی علامت ہے کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح راجہ بہوڑل کی کارک کانگڑہ میں مقبول ہے۔ راجہ نے لوگوں کے لئے ایک لمبی نہر بنوادی اور نہر کو جاری رکھنے کے لئے اپنی بہورل سے جان کی قربانی دینے کے لئے کہا جو اپنی مرضی سے شہید ہونے کے لئے تیار ہوئی اور نہر کی دیوار میں چنوانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اسی طرح بابا کورا، مائی مائی، باما کالو، بابا نار سنگھ، بابا سُورگاک نامی کارکیں مشہور ہیں۔

باریں

بار ہندی کے لفظ بِیر کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنی بہادری یا جواں مردی کے ہوتے ہیں۔ بار کے کردار بہادری، شہہ زوری اور مطیع نہ ہونے کی خُو والے جذبوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ہر بار میں کسی خاص شخصیت کو ابھارا جاتا ہے جس کے باعث علاقے کا نام روشن ہوتا ہے۔ ڈوگر علاقے میں باریں بھی ہمسایہ زبانوں یعنی پہاڑی اور گوجری زبان کی باروں کی مانند بڑی جوشیلی اور مرصع ہوتی ہیں اور گونج دار آواز میں بھاٹ یا میراثی گاتے ہیں۔ باروں میں بڑے سخت، کڑے اور کُھر درے الفاظ کا برتاؤ بھی کیا جاتا ہے جو شاعری کی دوسری صنفوں میں نہیں ہوتا۔ بار کو شمشیروں کے کھڑکنے، للکارنے مارنے اور مقابلہ بازی جیسے واقعات سے پرویا جاتا ہے۔

باروں کے کردار خیالی نہیں ہوتے بلکہ عوام کے بیچ سے ہوتے ہیں جو بہادری کے باعث قوم یا ملک کے لئے درخشندہ ستارہ بن جاتے ہیں اور پشت در پشت یاد رکھے

جاتے ہیں۔ڈوگر علاقے میں کارکیں اور باریں سُنانے کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ جب کارک یا بار سُنائی جاتی ہے تو لوگ خاموشی سے ہمہ تن گوش اس کو سُننے اور مفہوم کو سمجھنے میں لگے رہتے ہیں۔ان سے علاقے کی سماجی، ثقافتی، معاشی، تمدنی اور تہذیبی رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے اور عوام کی شجاعت، بہادری اور بانکپن کی علمیت بھی ہوتی ہے۔ڈوگری میں باروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں سرفہرست بار ڈیڈو، وزیر رتنو، بسنتی رام، گنگا اور رام سنگھ کی باریں قابل ذکر ہیں۔

میاں ڈیڈو کی ولادت 1780ء کے چیت ماہ میں جگتی گاؤں میں جموال خاندان میں ہوئی۔اس دور میں جموں پر میاں جیت سنگھ کی حکمرانی تھی اور پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ڈنکا بج رہا تھا۔مہاراجہ نے 1809ء میں جموں پر دھاوا بول دیا۔میاں ڈیڈو، گلاب سنگھ اور دوسروں نے مل کر مزاحمت کی اور حملے کو روکا۔لیکن راجہ جیت سنگھ کی وفات کے بعد 1810ء میں جموں کو سکھوں نے مغلوب کر دیا۔گلاب سنگھ نے بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت اختیار کر لی۔تب ڈوگرہ دیش کو ختم ہوتے دیکھ کر میاں ڈیڈو تڑپنے لگے اور قسم کھائی کہ حملہ آوروں کو وطن سے نکال باہر کریں گے۔میاں ڈیڈو نے ایک جمعیت تیار کی اور جموں میں مہاراجہ کی فوج پر حملے شروع کر دئے۔مہاراجہ نے باغی کی سرکوبی کے لئے گلاب سنگھ کو روانہ کیا۔گلاب سنگھ نے میاں ڈیڈو کو ہرانے کی بہت کوشش کی اور سکھ دربار میں عہدہ دلوانے کا بھروسہ دلوایا۔مگر ڈیڈو پر تو وطن پرستی غالب تھی۔وہ قابو میں نہ آیا۔پھر گلاب سنگھ اور ڈیڈو کی فوجوں میں جم کر لڑائی ہوئی۔سکھ فوج نے ڈیڈو کے باپ کے جسم کے چار ٹکڑے کئے اور اس کے گھر میں لٹکا دیئے۔

ڈیڈو نے ترکٹا کے پہاڑوں میں پناہ لی اور ایک مقابلے میں اپنے باپ کے قاتل کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور خود بھی سکھ فوج کے ایک سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس طرح میں ڈیڈو عوام کا ہیرو بن کر اُبھرا اور امر ہوگیا۔میراثیوں نے اُس کی بار بنا کر گانا شروع کیا جس کے باعث ڈیڈو کے کارنامے آج بھی عوام تک پہنچ رہے ہیں۔ڈیڈو کی بار

سے مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں، جن میں ڈیڈو دشمن کو للکارتے اور ڈوگر دیس سے چلے جانے کے لئے کہتے ہیں:

	(ترجمہ)
سامنے کھڑ وئی اے میاں ڈیڈو للکارا جے دتا	مقابلے میں آ کر میاں ڈیڈو نے کہا
میرا لاقہ چھوڑی دے	میرا علاقہ چھوڑ دو
ساری کنڈی چھوڑی دے	ہماری کنڈی چھوڑ دو
اپنے ماجھے دا ملک سمہال	اپنے ماجھے کا ملک سنبھالو
اپنے لاہور دا ملک سمہال	اپنے لاہور کا ملک سنبھالو
پکڑی تلوار میاں ڈیڈو حملہ جے کیتا	پھر میاں ڈیڈو نے تلوار اُٹھائی اور وار کرنے لگا
بڑی بڑی منڈیاں	اور سر کاٹ کر گرنے لگے
بیری دیاں ٹنگیاں گرنے نال لڑکن بال گرنے نال	اُن کے بال لٹک رہے تھے
ہتھ آوندا نیں ڈیڈو جموال	ڈیڈو ہاتھ نہیں آ رہا تھا
خرچ پٹھا بیری بند جے کیتا	پھر پنجابی فوج نے میاں ڈیڈو کا خرچ اور اناج بند کر دیا
ھن کے کھا گا میاں ڈیڈو	اب میاں ڈیڈو کیسے لڑے گا
سامنے کھڑ وئی میاں بیری کی گلایا	تب سامنے کھڑے ہو کر ڈیڈو نے کہا
ساڑی کنڈی دے پکی گئے گرنے	ہماری کنڈی میں گرنے کا پھل پک چکا ہے
بیرنی جندے ہاڑ سیاں	اور بیر سال بھر رہتے ہیں
کھالی کھالی کر گے بانگ تلوار	ہم گرنے اور بیر کھا کر تلوار چلائیں گے، مقابلہ کریں گے

ڈیڈو کے علاوہ جس نے پنجاب ڈوگرہ عظمت کی دھاک بٹھائی اور ڈیڈو کے علاوہ وزیر رتنو، مہتہ بستی رام، زورآور سنگھ جرنیل کے ساتھی تھے۔ ان دونوں کی الگ باریں ہیں جنہوں نے 1834ء میں لداخ کی طرف کوچ کیا۔ 1836ء میں لیہہ پر قبضہ کیا اور

1840ء میں تبت کی راجدھانی لاسہ کے دروازہ تکلا کوٹ تک پہنچے جہاں برفباری نے اُن کے قدم روک لئے۔ واپسی کے راستے بند ہو گئے اور دشمن پوری طاقت سے اُن پر جھپٹ پڑا اور زورآور سنگھ مارا گیا۔ زورآور سنگھ کی بہادری کے لئے لکھی گئی باریں گاؤں میں بھاٹ اور میراثی گاتے تھے۔ اسی طرح گُگا کی بار بھی ایک لمبی داستان ہے جو گگا کی بہادری پر مبنی ہے۔ روایت ہے کہ گُگا ناگوں کا دشمن تھا اور اس کی ناگوں کے ساتھ لڑائیاں رہتی تھیں۔ ایک دور میں گُگا کی عبادت بھی ہوتی تھی اور اس کا دن منایا جاتا تھا جو جنم اشٹمی کے دوسرے روز آتا ہے۔

روایت ہے کہ گُگا ایک برہمن عورت کی گائے واپس لانے کے لئے غزنی گیا تھا۔ گائے نے اسے کہا کہ وہ اُسے غزنی سے لے کر بھاگ جائے لیکن گُگا نے جواب دیا کہ وہ چوروں کی طرح نہیں واپس جائے گا۔ اُس نے لات مار کر سلطان کو جگایا اور لڑائی کے بعد گائے واپس لایا۔ یہ ایک لمبی بار ہے جس کے چند شعر پیش ہیں:

چڑھی پیا غزنی پہ راجہ	گُگا نے نقارے پر چوٹ
چوٹ نکارے لائی	لگا کر غزنی کی جانب کوچ کیا
ٹُھم ٹُھم چال چلے رتھ نیلا	اور نیلا رتھ ہلکی چال چلتے ہوئے
جیا کنبے پر تھالی	اٹک کنارے جا پہنچا

پھر آگے لکھتے ہیں۔

ستے کوٹ لوہے دے ٹپے	اس نے سات قلعے لوہے کے توڑے
اٹھویں ٹپی اے کھائی	اور آٹھویں کھالی پار کی
رمھا چھوڑیا کپلا نے	گائے نے بلند آواز میں گگا کا
اخ پھریا میرا سائیں	استقبال کیا کہ میرا مالک آ گیا ہے اور
راجہ میری دیگی بند چھڑائی	اب مجھے بیڑیوں سے آزاد کرے گا۔

اگڑے ہوئی اے دیوگُگا
کیلا دی سونگل کپی
ان جل کیتا نہیں راجہ
بیر پاکی نیں جگائیں
بول راجہ بچن کرے
آنو چوری کردا نہیں
دیہی لت دتا جگائی
کڈ تلوار میانوں بیری
سر راجے دے لائی
تریہ ٹوٹے تلوار ہوئی
بجی جمی پر آئی
کھڑونی اے بچ دیوگُگا نے
سر بیری دے بالی
دھڑ اُڑیا بچ غزنی سے
سر چھوڑ یہ ٹل ٹپائی

پھر گگا دیو نے آگے بڑھ کر گائے کی
بیڑیاں کاٹ دیں۔
گائے نے کہا میں نے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے
لے چلو مگر سلطان کو نہیں جگانا۔
گگا راجہ نے کہا میں چوری نہیں کروں گا۔
اُس نے لات مار کر سلطان کو جگایا۔
سلطان نے تلوار نکال کر راجہ پر وار کیا۔
مگر تلوار تین ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گئی۔
پھر راجہ گگا نے میدان میں کھڑے ہو کر
سلطان پر وار کیا۔
جس کا دھڑ تو غزنی میں رہا لیکن سر دریائے
اٹک کے پار جا گرا۔

ڈوگری لوک شاعری میں جنگ کے خلاف نفرت کا جذبہ غالب ہے کیونکہ فوج میں ہمیشہ ڈوگروں کی تعداد زیادہ رہی ہے اور سپاہی سے زیادہ کون جنگ کے کڑوے پن، اس کی بدصورتی اور ہولناکی کو سمجھ سکتا ہے:

وڈا قلعہ چلاسے دا
ہڈیں دے پھر ڈھیر لگی گئے
کوئی کوئی گُچھا ماسے دا

(چلاس کے قلعے پر بڑا بھیانک منظر تھا۔ جہاں لاشوں کے ڈھیر تھے جن پر گوشت کم اور

ہڈیاں زیادہ تھیں)

یا پھر راجہ جو سپاہیوں کو بھرتی کرتا تھا اُس کے خلاف نفرت یوں ظاہر ہوتی ہے:

آپوں راجہ محلیں سوتا

کیمپ لگے ستواری او

(خود تو راجہ محلوں میں سوتا ہے اور سپاہیوں کے لئے ستواری میں کیمپ لگے ہیں)

ماھیر جو لام میں مارے جاتے تھے اور واپس نہیں آتے تھے اُن کی یاد میں اس گیت کا یہ بند ملاحظہ کریں۔

بھنورا رتوِ پھری آئیاں

بھنورا کریَراں پھُلی آئیاں

بھنورا موئے نیں پھروے

(بھنورا بسنّت رُت پھر آ گئی ہے۔ کریری کے پھول نکل آئے ہیں۔ لیکن جو چلے گئے وہ نہیں لوٹ سکتے)

ڈوگری لوک گیت

لوک گیت عوام کے دلوں کی ترجمانی کرنے کا ذریعہ اور دل جوئی کا وسیلہ مانے جاتے ہیں۔ ان گیتوں سے عوام کی زندگی ہمکتی ہے۔ تمدنی اور ثقافتی میراث سامنے آتی ہے جنہیں سُن کر سکون ملتا ہے۔ ڈوگری لوک گیتوں میں بھی پیار محبت، شادی بیاہ کے گیت، میلوں ٹھیلوں کے گیت، موسموں، تہواروں سے جُڑے ہوئے گیت ملتے ہیں۔ ناچ گیت، اور مذہبی گیت بھی پائے جاتے ہیں۔

پیار محبت کے گیت ازل سے ہی انسانی فطرت پر حاوی رہے ہیں۔ ڈوگری سماج میں عموماً نوجوان فوج کی نوکری کرتے ہیں۔ جوان لام (جنگ) پر جاتے ہیں اور جب

واپس آتے ہیں تو اُن کے گھر خوشیاں منائی جاتی ہیں اور عورتیں گیت گاتی ہیں ؎

کچیاں بارکاں شپاہی سہاڑے روہندے

پکیاں روہندے جمعدار تری سنوں

(کچی بارکوں میں سپاہی رہتے ہیں اور میرا ماہی پکے گھر میں رہتا ہے کیونکہ وہ جمعدار ہے تیری قسم)

یا جس وقت سپاہی گھر سے فوج میں جاتا ہے تو اُس کے گھر والے بڑی محبت کے ساتھ اُسے کہتے ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ لے چل:

آنوں گلانی آن سچ او۔ مہاڑے بانکو نیا چاچوا

میکی وی یہی چل کچھ او۔ مہاڑے بانکو نیا چاچوا

(میرے بانکے بیٹے کے چاچو میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل)

لام (جنگ) میں جن عورتوں کے سہاگ جاتے ہیں اُن کے لئے زندگی گُزارنا بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ مسائل اور مصائب سے دوچار رہتی ہیں۔ ان عورتوں پر بیتنے والے حالات کو اس لوک گیت میں بیان کیا گیا ہے ؎

جنھیں ناریں دے کنّت مری گے

مشکل ھون گجارے۔ اوچناں جی

سیج بچھائی کرے اودلیلاں

امبر گُندی ایہ تارے

اوچناں جی

(جن عورتوں کے خاوند لڑائی میں مارے جاتے ہیں، اُن کے لئے زندگی گزارنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھروں میں سیج بچھا کر اُداس بیٹھی رہتی ہیں اور رات آسمان کے تارے گِننے میں گزار دیتی ہیں)

عشقیہ گیتوں میں پرتھی سنگھ اور اندر دیہی و کنجوا اور چنچلو جیسے گیت بڑے مقبول

ہیں۔ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

کتھوں تے اُٹھی کالی بدلی۔ اومنڈیا پرتھی سنگھا

کتھوں برسیا ٹھنڈا نیر

چھاتیا تے اُٹھی کالی بدلی۔ اومنڈیا پرتھی سنگھا

اکھیاں تے برسیا ٹھنڈا نیر

(یہ کالی گھٹائیں اور ٹھنڈا پانی کہاں سے برس رہا ہے۔میرے پرتھی سنگھا۔او پیاری: کالے بادل دل سے اُمڈ رہے ہیں اور ٹھنڈا پانی آنکھوں سے برس رہا ہے تیری یاد میں)

ڈوگرہ سماج میں شادی بیاہ کے گیت عام طور پر رسموں رواجوں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔جیسے مہندی، بٹنہ، تِل چاولی، سہاگ، سیرا گھڑولی ڈولی سکھیا، سٹھنیاں، چھند وغیرہ۔یہ گیت عام طور پر عورتیں مل کر گاتی ہیں۔عموماً کسی کمرے میں عورتیں بیٹھتی ہیں اور ڈھولکی کی تھاپ کوئی لوک گیت چھیڑتی ہیں اور بیچ میں کچھ عورتیں اُٹھ کر ناچنے بھی لگتی ہیں۔ گیت اور ناچ کے جوڑ سے ماحول میں خوشی اور جوش کے جذبات حاوی ہو جاتے ہیں۔ ڈوگرہ سماج کے یہ منظر نہایت لبھاونے اور دلکش ہوتے ہیں۔ایسے میلے تہوار کا گیت۔

گھگوال لگا میلہ

دِکھنے کی چل چلچے

گُنڈیں نیں پیہ دھیلہ

دِکھنے کی چل چلچے

ٹُری بھی چلگے

کنّے گلاں وی کرگے

پجی جاگے بڑی سویلے

دِکھنے کی چل چلچے

(گھگوال میں میلہ لگا ہے۔چلو چل کر دیکھ آتے ہیں۔لیکن میری جیب میں روپیہ ڈھیلہ ہے، ہی

نہیں، کیسے جاسکتے ہیں۔ٹھیک ہے پیدل چلیں گے۔ساتھ میں باتیں کرتے ہوئے چلیں گے اور باتوں باتوں میں جلد ہی میلے والی جگہ پہنچ جائیں گے۔اس لئے چلومیلہ دیکھنے چلتے ہیں)

ڈوگرسماج کی غریب خاندانوں میں جہیز کی بدعت کا رواج عام ہے اور کئی جگہ تو لڑکے والے بیٹی والوں سے جہیز کی مانگ کرتے ہیں۔اس بدعت کولوک گیت کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

بیٹی دے بابل مدن مدین
ماتا جِسی سوچ ہو وے گا
اِک میری رادھا دا بیاہ
دوجا ور داج منگے گا
پر بھوجی بیاہ چاڑ یو توڑ
بھگوان شرماں لاج رکھے گا

(لڑکی کے والدغریب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ماتا بے حد پریشانی کے عالم میں ہے۔لڑکی شادی کرنے کے قابل ہوچکی ہے۔لگتا ہے کہ دولہا کے گھر والے جہیز کا مطالبہ کریں گے۔اے میرے مالک! شادی کوخوش اسلوبی سے انجام دینا کیونکہ تو ہی ہماری شرم رکھنے والا ہے)

شادی کے موقعوں پرلڑکیاں کُھل کر اپنے دل کی بات اور جذبات کا اظہار لوک گیتوں کے ذریعے کرتی ہیں۔ جب برات آتی ہے تو مرد برات کا سواگت کرنے میں محو ہوجاتے ہیں مگر دونوں طرف کی عورتیں خوشی اور ہنسی مذاق کے گیت چھیڑ دیتی ہیں جنہیں 'سٹھنیاں' کہا جاتا ہے۔ان میں دولہا اور دُلہن کے گھر والوں کونشانہ بنا کر مذاق کیا جاتا ہے۔اس طرح 'سہاگ' گیت بھی رمزوں اور اشاروں سے پُر ہوتے ہیں جن میں کسی خاص بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔کچھ گیتوں کے بند ملاحظہ ہوں ۔

سہاگ

بابل جے تُس میرے	بابل اگر آپ سمجھ دار باپ ہیں تو
چتر چنار	میرے لئے اچھا ساتھی ڈھونڈ نا
چنگا ور ڈھونڈ نا	

☆

بابل میرا اک کہنا کیجئے	بابل میری اک بات مان لینا۔ مجھے
مگی رام رتن ورد یجے	رام چندر جی جیسا ور ڈھونڈ کر دینا

سٹھنیاں

چار کوٹھریاں اک دانہ	دولہا کے گھر میں چار کمرے تو ہیں
معراجے دے پیودا کوٹ پرانہ	لیکن کھانے کے لئے ایک دانہ ہے
	اور پھر دولہا کے باپ نے تو پرانا
	کوٹ پہنا ہوا ہے

......☆......

گُجر بکروال قبائل

گُجر اور صوبۂ جموں کے گُجر

گُجر جموں وکشمیر میں ہی نہیں بلکہ برصغیر ہندو پاک اور افغانستان ہر جگہ آباد ہیں۔ اُن کا ماضی نہایت درخشندہ رہا ہے اور برصغیر میں ان کی حکومتیں رہی ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں نمودار ہوئے۔ کچھ تاریخ دان انہیں ہندوستان کے قدیمی باشندے مانتے ہیں جن کی اپنی حکومتیں تھیں لیکن گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں شمال مغرب کی طرف سے مسلمان فاتحین نے اُن کے پاؤں اکھیڑ دیئے اور ایک عرصے تک مسلمان فاتحین کا رسد سامان اُٹھا کر کابل، غزنی اور ایران تک جاتے رہے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ باقی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پسپا ہو گئے۔ آج بھی ہندوستان کے گجروں میں ہندو، مسلمان اور سِکھ موجود ہیں اور ان کی آپس میں ذاتیں اور گوتیں ملتی ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ گُجر چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان وارد ہوئے۔ مسٹر کننگم گجروں کو یوچی انڈستھین قبائل کا حصہ بتاتے ہیں جو ابتداء میں آتش پرست اور سورج کے پُجاری تھے اور وسط ایشیا میں گرجستان میں آباد تھے جو دھیرے دھیرے مال مویشیوں اور ریوڑوں کے ساتھ گرجستان سے باہر نکلے اور جنوب وسطی ایشیا میں پھیلنے لگے اور درۂ بولان کے راستے افغانستان سے ہندوستان وارد ہوئے اور ساتویں صدی عیسوی تک اس ملک میں چھا گئے۔ گجروں کی ہندوستان میں پہلی ریاست کوہِ آبو میں قائم ہوئی جس کا دارالخلافہ بھنیمال تھا اور انہیں گُجر کہا جاتا تھا لیکن انہیں بیرونی حملہ آوروں نے اپنے علاقوں سے نکال دیا۔ یہ

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔ گجروں کی ریاست جموں وکشمیر میں آمد کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کچھ مورخ انہیں ریاست کے قدیمی باشندے مانتے ہیں اور یہاں کے کھش قبائل کو ہی گجر بتاتے ہیں جن کا مرکز خطہ پیر پنچال میں علاقہ بُدھل ہوا کرتا تھا۔

لیکن مورخین کا دوسرا طبقہ بتاتا ہے کہ گُجر 1586ء میں مغلوں کے کشمیر پرحملہ کے بعد پنجاب کے علاقہ گجرات سے کثیر تعداد میں مغل قافلوں اور شاہی کاروانوں کے ساتھ مُلازم کی حیثیت سے کشمیر کی طرف آئے اور پھر یہاں کے ہی ہوکر رہ گئے اور کشمیر کی طرف جانے والی شاہراہ مغل روڈ، شاہراہ توش میدان، بُدھل پیر اور نندن سردرّے کے ساتھ ساتھ اقامت گزین ہوتے گئے پھر پونچھ راجوری، میرپور، بھمبر، بُدھل، سورن کوٹ، مینڈھر اور منڈی کے پہاڑی علاقوں میں پھیلتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ 1798ء میں پونچھ میں روح اللہ خان سانگو نے گجروں کی پہلی ریاست قائم کی اور اپنے بیٹے امیر خان کو پونچھ کا راجہ بنا دیا۔ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ پونچھ، راجوری، بھمبر اور میرپور کے گجر زیادہ تر گجرات سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ کیونکہ ان علاقوں کے گجروں کی ذاتیں اور گوتیں وہی ہیں جو گجرات کے گجروں کی ہیں۔

صوبہ جموں کے گُجر بکروال قبائل: رہن سہن اور طرزِ زندگی

گُجر ہندوستان کے قدیمی قبائل میں شمار ہوتے ہیں اور جموں وکشمیر کے ہر خطے میں ان قبائل کی بستیاں، گاؤں اور گھر کوٹھے ملتے ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت صوبہ جموں کے خطۂ پیر پنچال میں آباد ہے جو اپنے مخصوص تہذیبی ورثے، ثقافتی پسِ منظر اور ٹھوس قبائلی رہن سہن کے ساتھ اپنی منفرد شناخت اور پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بانہال کے جنوب میں گول گلاب گڑھ سے ہوتے ہوئے بُدھل راجوری اور پونچھ تک تمام علاقے میں سکونت کرتے ہیں۔ اُدھر ایل۔ او۔ سی کے اُس پار بھمبر، میرپور، کوٹلی، باغ، راولاکوٹ اور

سدھنتی میں بھی گجروں کی بڑی آبادی مُقیم ہے۔کنٹرول لائن کے آر پار دونوں طرف گجر کنٹرول لائن کے قریب پہاڑی ڈھلوانوں اور جنگلوں کے نزدیک رہتے ہیں یا پھر دور دراز کے کٹے پھٹے علاقوں میں ان کی اکثریت آباد ہے اور دریائے جہلم اور چناب کے درمیان خطۂ پیر پنچال میں پہاڑی بولنے والے لوگوں کے ساتھ گجر بکروال بھی سکونت کرتے ہیں اور اس خطے کو اپنا گھر مانتے ہیں۔ان کا ذریعہ معاش زراعت اور زراعت سے جڑے ہوئے شعبوں پر منحصر ہوتا ہے۔گھنی آبادیوں سے دُور ان کے گھر کوٹھے ہوتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے زمینی قطعوں پر فصلیں اُگاتے اور مال مویشی پالتے ہیں۔گجروں کی ایک شاخ بکروال کہلاتی ہے جو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پالتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ٹھوس جتھے بندی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔بکروالوں کے یہ کاروان بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں اور کھانے پینے کے سامان کے ساتھ پورے خاندان سمیت چلتے ہیں۔پہرہ دینے اور ریوڑوں کو چوروں سے بچانے اور جنگلی درندوں سے تحفظ کے لئے خاص قسم کے لڑاکو کُتے ان کے ساتھ ہوتے ہیں جنہیں بکروالی کُتے کہا جاتا ہے۔

گائے بھینس پالنے والے گجروں کی جنگلی علاقوں میں اپنی ڈھوکیں (بہکیں) اور مرگیں ہوتی ہیں۔جہاں رہنے کے لئے انہوں نے کچے کوٹھے بنائے ہوتے ہیں جنہیں ڈھارہ کہا جاتا ہے۔ایک ڈھارے میں کئی خاندان سکونت کرتے ہیں۔جبکہ مویشی اکثر چھتنار درختوں تلے یا کُھلے آسمان میں یا پھر دھارے کے ایک حصے میں رکھے جاتے ہیں۔دن کو مرد راشن پانی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔لڑکیاں اور لڑکے مویشی چراتے ہیں۔عورتیں جنگلی ساگ، جسے گنڈور یا ہند کہتے ہیں، لانے نکل جاتی ہیں یا دودھ بلوتی ہیں۔دودھ کی روٹی یعنی کلیاڑی تیار کرتی ہیں۔مکھن اور گھی بناتی ہیں اور خاندان کے لئے روٹی تیار کرتی ہیں۔شام کے وقت خاندان کے لوگ پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد دیر تک گپیں ہانکتے یا پھر صوفیانہ کلام گا کر دل جوئی کرتے ہیں۔

گجروں کی ایک شاخ دودھی گجر کہلاتی ہے جنہیں بنہارہ گجر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہوتے ہیں اور بھینسیں پالتے ہیں اور شہروں قصبوں کے قریب جھونپڑوں میں قیام پذیر رہتے ہیں اور بھینسوں کا دودھ شہروں میں بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔

گجر قوم بڑی سادہ مزاج، فطرت کی دلدادہ، شوخ، چنچل، قناعت پسند، دلیر، پُراعتماد، جفاکش اور خوش گُفتار مانی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے جانا جاتا رہا ہے۔ جیسے گرجُر، حرزر، گورجارہ، گوجر، گُجر وغیرہ۔ یوں تو یہ قبائل پورے ہند و پاک اور افغانستان میں دور دور تک پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں اور اپنے مخصوص کلچر، رہن سہن، روایتی پہناوے اور مادری زبان گوجری کے باعث اپنی علاحدہ پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ جبکہ جموں و کشمیر میں ہر جگہ ان کی بستیاں اور گھر کوٹھے دکھائی دیتے ہیں لیکن صوبۂ جموں کے علاقہ پیر پنچال میں گجر بڑی تعداد میں آباد ہیں اور اس خطے کو یہ لوگ اپنا گھر مانتے ہیں۔

موسم بہار کی آمد پر راجوری، پونچھ اور بُدھل کے گجر اپنے مویشوں اور ریوڑوں کے ساتھ قافلوں اور کاروانوں کی صورت میں پیر پنچال کی بالائی پہاڑی ڈھوکوں (بہکوں)، مرگوں اور چراگاہوں کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں، جبکہ ایسے ہی قافلے کٹھوعہ، ادھم پور، ریاسی اور گول گلاب گڑھ سے بھی رواں دواں ملتے ہیں۔ یہ قافلے اور کاروان یا تو پیر پنچال کی ڈھلوانوں اور مرگوں میں سکونت کرتے ہیں یا پھر درہ پیر، جمیاں گلی، نور پور گلی، نندن گلی اور بُدھل گلی عبور کر کے اپنے مویشیوں، ریوڑوں اور اہل خانہ کے ساتھ وادئ کشمیر کو پار کر کے لولاب، گریز، تلیل، سونہ مرگ، یوس مرگ اور گلمرگ کی چراگاہوں تک چلے جاتے ہیں۔ آج بھی یہ قبائل قدیم آریائی قبیلوں کی شکل میں ٹھوس جتھے بندی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ڈھوکوں مرگوں کے دن خوشی، مسرت اور موج مستی کے دن ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان علاقوں میں دور جدید کی ہر آسائش میسر نہیں ہوتی لیکن زندگی بڑی آزاد، بے ساختہ اور فطرت کے بہت قریب ہوتی ہے۔ مویشی اور ریوڑ وسیع مرگوں میں گھاس چرتے اور کلیلیں کرتے رہتے ہیں، جبکہ گڈریئے، چوپان اور چرواہے میٹھی لسی پی کر مست ہوجاتے

ہیں۔ پھر کھیل کود، گانوں اور دیگر مشاغل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مینڈے لڑانا، بھینسیں لڑانا، بنی پکڑنا، پنجہ چھڑانا، مٹھ بازی اور بیت بازی کے مقابلے، کھِنو (گیند)، ٹلہ (بیٹ)، چھپن چھوت، قاضی کوڑا اور پنج گھیٹی جیسی کھیلیں کھیلتے ہیں اور گپ بازی میں مشغول رہتے ہیں۔ پت جھڑ کے آغاز میں یہ لوگ واپس اپنے گاؤں میں لوٹ آتے ہیں۔ یہ گاؤں پہاڑوں پر واقع ہوتے ہیں جہاں ان کی اکثریت کچّے مکانوں میں سکونت کرتی ہے۔ مکان اکثر دو حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ اوپر والا حصہ جو پَسار، بیٹھک، کوٹھار والا کمرہ اور رسوئی پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ نیچے والے حصے کو بانڈی کہا جاتا ہے جہاں مال مویشی رکھتے ہیں اور سردیوں کے ایام میں خود بھی بانڈی کے ایک خاص حصّہ میں قیام کرتے ہیں جو انسانی سکونت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

مرگوں میں گجر بکروال قبائل

بہار کے آغاز میں جب پیر پنچال کے پہاڑوں پر برف پگھلنے لگتی ہے تو بکروال قبائل بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں، گھوڑوں، اہل خانہ اور شکاری کتوں کے ساتھ مرگوں میں داخل ہونے لگتے ہیں جبکہ گجر مال مویشی کے ساتھ آتے ہیں۔ مرگ جہاں جنگل اور پہاڑ ختم ہو جاتے ہیں اور نرم نرم گھاس اور جنگلی پھولوں کے قالین نما میدانوں میں اپنے خیمے نصب کرتے ہیں۔ اہل خانہ خیموں میں قیام کرتے ہیں اور ریوڑ کُھلے میں گھاس کی تلاش میں سارا دن گھومتے رہتے ہیں اور شام کو آجڑی (وہ بکروال جو ریوڑ چراتا ہے) ریوڑ کو لے کر واپس آجاتا ہے۔ مرگوں میں دورِ جدید کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ نہ سڑکیں ہوتی ہیں، نہ بجلی نہ دوائی، نہ راشن کی دُکان۔ ہر چیز ان قبائل کو میلوں پیدل چل کر لانی پڑتی ہے۔ اس لئے صبح صبح ناشتہ کر کے بزرگ لوگ راشن و دیگر ضروریات زندگی کے لئے میلوں پیدل سفر کر کے گاؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نوجوان لکڑی، گھاس اور پتے لانے کے لئے نکل

جاتے ہیں۔ خاندان کے لڑکے لڑکیاں ریوڑوں کے ساتھ چلے جاتے ہیں جبکہ عورتیں دودھ اکٹھا کرتیں، دہی بلو کر لسّی مکھّن تیار کرتی ہیں۔ مکھن کو گرم کر کے گھی بناتی، دودھ اور لسی ملا کر دودھ کی روٹی جسے گلیاڑی کہا جاتا ہے، تیار کرتی ہیں۔ پھر پہاڑی علاقے میں جنگلی سبزیاں لینے کے لئے چلی جاتی ہیں جن میں کنڈور، ہند اور بڑی پلان شامل ہوتی ہیں، پھر واپس آ کر کپڑے دھوتیں یا سر کے بالوں کی مینڈیاں گھُندوانے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔

شام سے پہلے ریوڑ خیمہ بستیوں کے قریب آ جاتے ہیں اور مویشی ڈھاروں یا خیموں کے باہر جمع ہونے لگتے ہیں۔ بزرگ لوگ ضروریاتِ زندگی کا سامان لے کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ نوجوان گھاس، لکڑی اور پتوں کے گڈھے (بڑے بڑے گٹھڑ) اُٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ عورتیں الاؤ جلاتی ہیں اور جانوروں کا دودھ دوہتی ہیں۔ پھر کھانا تیار کرنے میں محو ہو جاتی ہیں۔ شام کے کھانے میں عام طور پر جنگلی سبزیوں کی کڑی، چاول، مکئی کی روٹی یا گوشت پکایا جاتا ہے۔ جبکہ چاول، دودھ اور شکر ملا کر بھی کھانے کا رواج ہے۔ تہواروں اور شادیوں میں بکرے ذبح کئے جاتے ہیں۔

کھانا شام ہوتے ہوتے کھا لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دن کو جنگلی جھاڑیوں سے اکٹھا کیا گیا پھل یعنی گُرچھ، جنگلی سٹابری خاندان میں بانٹی جاتی ہے۔ خیمہ بستی اور ریوڑوں کے درمیان الاؤ جلایا جاتا ہے اور خاندان اس کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے کو دن کی وارداتوں کو بیان کرتے، قبیلے کے مسائل پر غور کرتے، ریوڑوں کے تحفظ اور بیماریوں کے تدارک پر بات ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاندان کے افراد اپنے بزرگ لوگوں کو صوفیانہ کلام سُنانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ اُس وقت بزرگ لوگ احتراماً دو زانوں بیٹھ جاتے ہیں۔ کانوں کو اُنگلیوں سے دبا لیتے ہیں اور اونچی آواز اور لمبی تان میں بیت، سی حرفیاں اور بارہ ماسے سناتے ہیں۔ ان گیتوں سے ساری مرگ گونجنے لگتی ہے اور دیر تک چاندنی رات کی روشنی میں خاندان الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے صوفیانہ کلام سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد بچے اور عورتیں سونے کے لئے ایک خاص قسم کی چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں

جسے ڈنگی کہا جاتا ہے۔ یہ تقریباً چار چار پائیوں کے برابر ہوتی ہے۔ اُس پر گھاس اور پتے بچھائے جاتے ہیں اور پھر بستر لگایا جاتا ہے۔ ایک ڈنگی پر خاندان کے کئی افراد با آسانی سو سکتے ہیں۔ لیکن نوجوان افراد ریوڑوں یا مویشیوں کی رکھوالی پر تعینات ہوجاتے ہیں اور انہیں چوروں یا جنگلی درندوں سے بچانے کے لئے متحرک رہتے ہیں۔

گجر بکروال قبائل کے رسم و رواج بڑے سادہ اور زندگی سے بھرپور ہوتے ہیں جو بچّے کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوجاتی ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُسے کپڑے میں لپیٹ کر مولوی یا پیر صاحب کے پاس لیا جاتا ہے جو بچے کے کان میں اذان دیتے (پڑھتے) ہیں۔ ختنے کے موقعے پر سارے رشتہ دار اکٹھے ہوتے ہیں اور گھر والوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس موقعے پر دعوت کھلائی جاتی ہے۔ شادی کے موقعے پر لڑکا اور لڑکی دونوں کے ہاں تیل، مہندی، گانا وغیرہ رسمیں ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں سہرا باندھا جاتا ہے۔ دولہن کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لیا جاتا ہے۔ شادی میں گوجری زبان کے لوک گیت ماہیا، ڈھول، مہندی، سرمہ، سکڑا، ڈولی، سیرا وغیرہ گائے جاتے ہیں۔ گاؤں میں بارات گھوڑوں پر جانا پسند کرتی ہے۔ دلہن کے گھر پہنچنے سے قبل دولہا کسی زیارت پر سلام کرنے جاتا ہے یا زیارت کے قریب درخت پر جھنڈا لہرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ راستے میں با آوازِ بلند اللہ کے نام کا ورد کیا جاتا ہے۔ جبکہ آج سے چالیس سال پہلے ڈھول اور شہنائی کے ساتھ بارات جایا کرتی تھی۔ جب بارات دولہن کے گھر کے قریب پہنچتی ہے تو گھر کے باہر ایک بڑا تراشا ہوا ہتھی والا پتھر پڑا ہوتا ہے جسے بگدر کہتے ہیں۔ باراتیوں پر لازم ہوتا ہے کہ اُن میں سے کوئی پہلے بگدر کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھائے اور پھر آگے بڑھے۔

بارات جب دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو روایتی انداز میں عورتیں لوک گیت گا کر ان کا استقبال کرتی ہیں۔ پھر دعوت شروع ہوتی ہے جو چاول، دہی، گھی، دودھ اور شکر پر مشتمل ہوتی ہے یا پھر گوشت اور مُرغے پکائے جاتے ہیں۔ برادری والے لڑکے اور لڑکی کے گھر نقدی کی صورت میں روپے دیتے ہیں جسے نیندرہ یا تمول کہا جاتا ہے۔ اس طرح قبیلہ کے لوگ شادی

میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔لڑکی کو جہیز دینے کا رواج ہے۔ذہنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے پیر صاحب سے دعا کرائی جاتی ہے۔اس عمل کو پھونک مارنا (دَم کرنا) کہتے ہیں۔ پیر صاحب خاندان کی ترقی اور بہبودی، اچھی فصل وغیرہ کے لئے بھی پھونک مارتے ہیں۔مَردوں کو چوہدری یا مقدم کے لقب سے جانا جاتا ہے جبکہ عورتوں کومہری یا چودھرانی کہا جاتا ہے۔عورتیں اور مرد عام طور پر روایتی لباس اور زیور پہنتے ہیں۔مرد لمبی قمیض واسکٹ، لمبی شلوار پہنتے ہیں۔کمبل کا استعمال کرتے ہیں۔سر پر مختلف رنگوں کی پگڑی پہنتے ہیں۔ہاتھ میں سوٹی (لاٹھی، بیت) رکھتے ہیں اور پاؤں میں جوڑا (مقامی چمڑے کا جوتا) پہنتے ہیں۔عام طور پر بکروال بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پالتے ہیں جبکہ گجر بھینسیں رکھتے ہیں۔

عورتیں چھینٹ کی کُرتی (قمیض) لال سُتھن (شلوار) سر پر تا جکستانی ٹوپی اور چھینٹ کا چھپرا (دوپٹہ، چادر) رکھتی ہیں۔قمیض میں بہت سے بٹن لگانے کا رواج ہے۔ عورتوں میں سر کے بال گوندنے کا منفرد انداز ہے۔بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈیاں گوندی جاتی ہیں جنہیں گوندنے میں تقریباً ایک دن لگ جاتا ہے۔عورتیں چاندی کے گہنے پہننے کی شوقین ہیں اور کنگن، مریدے، کڑھے، ہیری حمیل، لونگ، مرکیاں اور چھلّے پہنتی ہیں۔ عورتیں چونکہ بہت زیادہ کام کرتی ہیں اس لئے ان کے بدن چھریرے ہوتے ہیں۔نین نقش تیز، ناک لمبی اور چہرے متاثر کُن ہوتے ہیں۔یہ عورتیں نہایت جفا کش، بہادر، دلیر اور محنتی ہوتی ہیں۔گجر بکروال عورتیں لال، ہرے اور نیلے پیلے منکوں (موتیوں) کی مالا بھی پہنتی ہیں اور اُنگلی میں لال تھیوے (نگینے) والی چاندی کی چھاپ (انگوٹھی) شوق سے پہنتی ہیں۔زیبائش کے لئے آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں۔ہاتھوں میں مہندی لگاتی ہیں۔ہونٹوں کو اخروٹ کے داتن سے رنگتی ہیں۔سُرمے، داتن اور مہندی کا استعمال مرد بھی کرتے ہیں خاص طور سے بُزرگ مہندی سے اپنی لمبی لمبی سفید داڑھیاں رنگتے ہیں۔

گوجری لوک ادب

دنیا کی ہر قوم کی اپنی مادری زبان ہوتی ہے۔ ازل سے ہی اس زبان کو بولنے والے افراد میں شاعرانہ اور ادیبانہ طبیعت کے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو اپنے شعروں اور قصے کہانیوں سے دوسروں کو محظوظ کرتے ہیں اور پھر جو شعر یا کہانیاں عوام کو پسند آتی ہیں وہ انہیں منہ زبانی یاد کر لیتے ہیں اور دوسروں کو سُنا سُنا کر دل بہلاتے ہیں۔ یہاں سے ہی زبان میں لوک ادب کی بنیاد پڑتی ہے۔ تخلیق کار کا نام یا تو یاد نہیں رہتا لیکن تخلیق اس قدر عوامی زندگی کے قریب ہوتی ہے کہ وہ بھول نہیں پاتی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک سینہ بہ سینہ خود بخود منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ گوجری زبان کا بھی اپنا لوک ورثہ موجود ہے اور صوبہ جموں کے گجر قبائل میں نہایت مقبول ہے۔

صوبہ جموں کے گجر چونکہ سال میں پانچ ماہ بلندیوں اور ڈھوکوں (بہکوں، چراگاہوں)، مرگوں میں بسر کرتے ہیں جہاں دورِ جدید کی آسائش اور دل جوئی کا کوئی وسیلہ نہیں ہوتا، اس لئے یہ لوگ لوک ادب اور لوک گیتوں سے اپنی دل جوئی کرتے ہیں اور شام کو الاؤ کے قریب بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے ہیں۔ دن کو عورتیں اور مرد مال مویشیوں یا پھر بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے ساتھ گھومتے ہوئے لوک گیت گاتے ہیں۔ یہ لوک گیت گجر قبائل کی زندگی کے نہایت قریب ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گوجری لوک گیت اور قصے کہانیاں ایسا آئینہ ہیں جس میں وہ اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

صوبہ جموں میں بولی جانے والی گوجری زبان میں لوک گیتوں کا ایک وسیع خزانہ موجود ہے۔ ان گیتوں میں شادی بیاہ کے گیت، موسمی گیت، کہانیوں پر مبنی گیت، شجاعت سے بھرپور گیت جنہیں لوک باریں کہا جاتا ہے اور عشق و محبت کے گیت ملتے ہیں۔ ان گیتوں میں گجر قبائل کی زندگی کی حقیقتیں، اُن کی خوشیاں اور غم، دُکھ اور سُکھ، عروج اور زوال کی جھلک ملتی ہے۔

صوبہ جموں کے گوجری لوک گیتوں میں ماہیا، شُپاہیا، لٹھولی، ڈھینڈی، قینچی، تاجو، نورو، کنگو، بساکھ، ڈولی، مہندی، سرمہ، سہرا، جدائی اور بچھوڑے کے گیت اور شجاعت پر مبنی لوک باریں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ لوک باریں اور گیت پیش ہیں۔

بارنورہ چوہدری

گوجری لوک ادب میں نورے لوک بارنورہ چودھری کی بار کو شجاعت اور جواں مردی کی علامت مانا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں صوبہ جموں کے علاقہ پونچھ میں کوئی مرکزی حکومت نہ ہوتی تھی بلکہ آپ راجی کا دور تھا اور گاؤں میں قبیلوں کے سردار یا چودھری حکومتیں چلا رہے تھے۔ اس زمانے میں تحصیل مینڈھر کے علاقہ گرسائی پر نورے چوہدری کا دبدبہ تھا جبکہ ہرنی میں راٹھی قوم کے لوگ اپنا تشخص رکھتے تھے۔ نورے چوہدری کا گھر گرسائی کی اونچی ٹیکری پر قائم تھا۔ اس کے پاس سینکڑوں بھینسیں تھیں اور چوہدری بڑی شان والا مرد رہا تھا اور ہر روز نیا جوتا پہنتا تھا۔ وہ علاقے کا سردار مانا جاتا تھا۔

نورے نے بھینسوں کے لئے گرسائی کے ڈنہ پر باڑی (مویشی خانہ) بنائی لیکن ماں اسے روکتی رہی کیونکہ اُس مقام کے آگے خواجہ خضر اور پیچھے پیر صاحب کا آستان تھا۔ لیکن نورا نہ مانا۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد نورے کی بھینسوں نے ہرنی کے راٹھیوں کے کھیت اُجاڑ دیئے۔ کیونکہ نورے کا نوکر اور اس کا بھانجہ مٹھا چاہتا تھا کہ دونوں قبائل میں جھگڑا ہو۔ اسی رات راٹھیوں نے مٹھے سے مل کر نورے کے گھر حملہ کر دیا۔ اُس وقت مٹھے نے چودھری کے خونخوار کُتے اور بھینسے باندھ دیئے تھے اور نورے کے ہتھیار چھپا دیئے تھے۔ ان حالات میں راٹھیوں نے نورے کو قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔

دوسرے دن موچی جب نورے کے لئے نیا جوتا بنا کر لایا تو اس نے دیکھا کہ نورا قتل ہو چکا ہے۔ اس نے شور بَرپا کیا تو نورے کا بھائی کشال موقعے پر پہنچا اور قسم کھائی کہ وہ

بھائی کے خون کا بدلہ لے گا۔ چنانچہ کشال نے گجر قبائل اور سیدوں کی مدد سے ہرنی کے راٹھیوں پر حملہ کر دیا۔خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔کشام، مٹھے مانجھی اور نورے چودھری کے مویشی لے کر واپس آیا اور پھر تحقیق کے بعد مانجھی کو اُسترے کے ساتھ چیر چیر کر ختم کر دیا اور پورے علاقے میں چودھری خاندان کا دبدبہ پھر سے قائم ہو گیا۔

بارہ نورہ

سچا رب سورو جیڑو پروردگار ہے
اڑیہ آخر ہے مرجانوّ چھوڑ دینو سنسار ہے
(اپنے مالک کی یاد کرو جو سب کا پروردگار ہے۔آخر سب نے دنیا کو چھوڑ دینا ہے)
ٹھاکے تتاں ماتا نورہ ٹھاکے بڈھو باپ
سُن لے توں گل مھاری بانڈی نہ چاڑ
اگےّ پیر خواجہ پچُھ ڈاہڈی ہے سرکار
(نورے کو ماں اور باپ روکتے رہے کہ تو اونچے مقام پر بانڈی نہ بنا کیونکہ اس کے آگے پیر خواجہ اور پیچھے کامل سرکار کا آستان ہے)
خواجہ دیو گو بکرو پھینڈر پیراں کی نیاز
بالی چال بانڈی اگر سوہنو ہے پیار
(نورا جواب دیتا ہے کہ میں خواجہ کی زیارت پر بکرا اور پیر صاحب کے آستان پر بھینس کی نیاز دوں گا کیونکہ میری بانڈی بائیس چال لمبی ہے اور خوبصورت ہے)
سارا کہیں نورو ڈھوک بنڈھ کے چار
ٹوک نہیں ہوں بنڈتو مناں بھُوہ ہے جنجال
ہلاّں تیں جدھ چھیڑوں جاکے بھینس پھامڑانا ڑ

(نورے کوسب کہہ رہے تھے کہ ڈھوک کو بانٹ کر چراؤ۔مگر نورہ کہتا تھا کہ میرا جنجال بہت ہےاور میری مویشی ہلاں سے لے کر پھامڑہ ناڑ تک پھیلے ہوئے ہیں۔اس لئے میں ڈھوک نہیں بانٹتا)

رہ رہ تناں گو کے تیرو پھالّی کُشال
ہرنی کے ٹیڑے میری کٹیاں کی چراند
ہرنی کے ٹیڑے چھیڑ دتو ہے تیں مال

(تیرا بھائی کشال رہ رہ کر تجھے کہہ رہا ہے کہ ہرنی کے موڑ والا علاقہ میری کٹیوں (بھینسوں کے وہ بچّے جو سال ڈیڑھ سال کی عُمر کے ہوں) کی چراند ہے مگر تو اسے بھی اپنی بھینسوں سے اجاڑ رہا ہے۔

چھیڑی راوی ڈھیلی جاگے بھنّی ہے باڑ
لتاں ملی کنگنی نال کھادی ہے بنسال

(مگر نورہ نہیں مانا۔اُس نے اپنی دو بھینسوں راوی اور ڈھیلی کو باڑ توڑ کر فصل میں چھوڑ دیا جنہوں نے کنگنی کی فصل کو مسل کُچل دیا اور شالی کی فصل کھالی۔

جا گیا ایں فرراٹھی جناں موڑیو آگے مال
کِس گا تایں چھوکر کیڑو مانجھی ہے نال

(پھرراٹھی جاگے اور انہوں نے بھینسوں کو باہر نکالا اور پوچھنے لگے کہ ان کے ساتھ چروانے والا کون ہے اور یہ مویشی کس کے ہیں)

نورا گاہیں چھوکھر مِٹھّو مانجھی ہے نال
پنج سُپلی دیو میری اُجڑی ہے بنسال
یا دے راوی ڈھیلی نہیں تہ بھرے تو بنسال
راوی نیں ہوں دیتو یوہ ہے دھیاں کو داج

(یہ مویشی نورے کے ہیں اور مٹھا مانجھی ان کے ساتھ ہے۔زمیندار نے کہا کہ میری پانچ

سُلپی (دس من) شالی اجڑ گئی ہے وہ مجھے دے دو نہیں تو یہ راوی اور ٹھیلی بھینس اس کے بدلے دے دو۔ مگر نورہ کہتا ہے کہ میں راوی ٹھیلی نہیں دوں گا کیونکہ یہ میں نے بچیوں کو جہیز میں دینے کے لئے رکھی ہیں)

چڑھیا راٹھی دستہ کا چھالیا ہیں چاڑ
پہنچیا فراو ہلاں جا کہ پجُیا پھامڑ ناڑ
دیو ہم نا لسی ہم ہاں ڈاہڈا طلبگار
چل اُٹھ جاکے راٹھی کٹورہ نا چھچھیال
دہو میرّی حقہ ہم ہاں ڈاہڈا طلبگار
چل او اِتو راٹھی میرو حقو نہ چھچھیال
سونا کو ہے حقو نالے جست کی ہیں نال
نالے چھکے نورو نالے بھائی کشال

(راٹھیوں کا جو دستہ نورہ کے گھر کی طرف بڑھا اور پھامڑ ناڑ آ گیا۔ راستے میں ایک گھر سے انہوں نے لسی مانگی اور حقہ طلب کیا لیکن گھر والوں نے اِنکار کر دیا اور کہا کہ یہ حقہ سونے کا ہے اور اس کی نال جست کی ہے جسے صرف نورا چودھری اور اُس کا بھائی کُشال پیتے ہیں)

آرے مِٹھّو مانجھی گل کریے میرے نال
کِت ہے دوست نورو کِت ایں نورا کا ہتھیار
ھوں نہیں تِنّاں دستو مناں چھوڑ یہ گو مار
مارن نہیں ہم دیتا تناں رکھاں گا سینہ نال
دیاں گا تنّاں ٹھیلی توں وی کریئے فِرراج
لہریا واہ ایں چھوٹا او دیں گا تمنہ مار

(راٹھی پھر نورا چودھری کے نوکر مٹھا سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیا نورے نے ہتھیار کہاں رکھے ہیں۔ مٹھا کہتا ہے میں نے بتایا تو نورا مجھے مار دے گا۔ راٹھی کہتے ہیں ہم تمہاری

حفاظت کریں گے اور انعام میں نورے کی بھینس ٹھیلی تجھے دیں گے۔تم بھی راج کرنا۔مٹھا کہتا ہے نورے کے ٹھیلے بھینسے تمہیں مار دیں گے)

مھاری سارے چھوٹے کڈ سٹیے ہتھیار
مہاری توں اُڈیک رکھیئے جمعہ کی رات

(راٹھی کہتے ہیں تم نورے کے بھینسے باندھ دینا اور ہتھیار پھینک دینا اور جمعہ کی رات کو ہمارا انتظار کرنا)

مِٹھاں مانجھی تناں پُیے گئی اللہ کی مار
بھدیا سارا چھوٹہ کڈ سٹیاں ایں ہتھیار

(مٹھے مانجھی کو اللہ کی طرف سے مار پڑے۔اُس نے جمعہ کی رات نورے کے بھینسے باندھ دیئے اور ہتھیار پھینک دیئے)

چڑھیاں ہیں راٹھی کون ڈیڑھ ہزار
کھولیو اُڑیہ پھت مناں پیہ گئی ایہ رات
اُٹھیے مٹھو مانجھی اُٹھ کے پھت نا اُگاڑ
اُٹھن نیں ھو تومنّاں چڑیو ہیں تاپ
اُٹھ رے بچہ رحمت اُٹھ گے پھت ناں اگاڑ
پئی ہے تناں بابا بار کھلی ہے دھاڑ
کپی اُن نے ڈنگی نورو ٹھٹھو جنواں پھار
پکڑیو فِر نورو بھدیو سیلی* کے نال
سیلی نال نہ بھدیئے مناں بدھیے پٹّے نال

(پھر جمعہ کی رات کو ڈیڑھ ہزار راٹھی نورے پر حملہ آور ہوئے اور اس کے دروازے پر دستک دی۔نورے نے مٹھے کو دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔مٹھے نے کہا مجھے بخار ہے، میں

* بکریوں اور گھوڑوں کی دُم سے کاٹے ہوئے بالوں سے تیار کئے گئے رَسّے کو ''سیکی'' کہتے ہیں۔

نہیں اُٹھ سکتا۔ نورے نے پھر بیٹی رحمت سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ رحمت نے دروازہ کھولا تو ڈر گئی اور باپ نورے سے کہا باہر حملہ آوروں کا جتھا کھڑا ہے۔ حملہ آوروں نے نورے کی ڈنگی (چارپائی) کو کاٹ دیا اور نورا گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ راٹھیوں نے اُسے پکڑ لیا اور کھردری رسی سے باندھ دیا)

مکھن میرو جسو چبیں سیلی کا بال
پکڑی اُن نے چھری کیو نورا نا حلال
روڑی ہے ھُن مَنڈی آوے کلمہ کی واج
بے عقلی کم گھمایو گُجر ڈاہڈ تھو حضرات
ھُن نکلیو چھوٹو منگو بیڑے بھایو اُس رنگاٹ
نچیں سارا راٹھی دین قنداں کی مار
پُچھ مڑغہ دیکھ کھسم نیں ایہ میرا نال

(نورے نے کہا مجھے بکری کے بالوں والی اس رسی سے نہ باندھو۔ ریشم کی ڈوری سے باندھو کیوں کہ میرا جسم مکھن کی مانند ہے اور رسی کے بال مجھے چبھتے ہیں۔ مگر راٹھیوں نے اُسے چُھری سے حلال کر کے گلا کاٹ دیا اور نورے کے منہ سے کلمے کی آواز آتی رہی۔ پھر منگو نام کا بھینسا رسہ توڑ کر باہر آ گیا اور رینگنے لگا مگر راٹھیوں نے اُسے بندوق کے قندوں سے مار مار کر بھگا دیا اور منگو پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگا کہ اس کا مالک ساتھ نہیں ہے)

تَرَپّہ تُوں کُوکے یتر وبھائی رے کُشال
ہائے او مٹھے مانجھی کئی مچی ہے اے دھاڑ
پونم گی یاہ چانی ماما پیہ گئی ڈاہڈی تہھاڑ
لائیریاں ترئیاں کھلیں بھایں ایں رنگاٹ
نِکلی رحمت بار اُس نا دتا ایں جواب
ہائے ہائے میریا چاچا مارگیا راٹھی مار

(ترپہ سے کشال نے زور سے آواز دیکر مٹھے سے پوچھا کہ یہ شور کیوں ہے۔مٹھے نے کہا پونم کی رات گھر پہ یہ حملہ ہوگیا ماما اور دودھ دینے والی پیاسی بھینس اب رینگ رہی ہے پھر نورے کی بیٹی رحمت باہر نکلی اور چچا کشال سے کہا کہ راٹھیوں نے سب ختم کر دیا)

ہرنی کے ٹھیڈے جاکے مچی اے ھُن مار
جایئے نہ توں راٹھی میرا بھائی نا مار
نٹھا ہیں فِر راٹھی پکڑ گجنا کی ماہل
پکڑی ہے اُس چُھری راٹھی کیا ہیں حلال
لہریا واہ کُشال راٹھی کُترے دس ہجار
پیّہ تھو ادرات تے لہو کا لیہہ تھو ڈکار

(پھر کُشال اور اس کے گجر اور سید ساتھیوں نے راٹھیوں کا پیچھا کیا اور ہرنی کے موڑ پر لڑائی شروع ہوگئی۔راٹھی گجنا پہاڑ کی طرف نکل گئے لیکن کُشال اور اس کے ساتھیوں نے راٹھیوں کو پکڑ پکڑ کر حلال کرنا شروع کر دیا اور اُن کا لہو پی کر ڈکار مارنے لگا)

گجیں بلی چیچی کمیّں گورسائی کوناڑ
چڑیا بلی چیچی ستر سید اُس گے نال
کیو نورو دفن خلقت گئی کہراں دار

(پھر بلی چیچی گرجتے ہوئے آگے بڑھا جس کے ساتھ ستر سید بھی تھے۔انہوں نے نورے چودھری کو دفن کیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے)

آیئے مٹھا مانجھی گل کریئے میرا نال
نیڑے نہیں ہوں آتو ماما چھوڑ یہ گوتوں مار
تناں نیں ہوں مار تو رکھوں سینہ گے نال
گیو مٹھو مانجھی گل کئیں ہیں اُس چار
کِت ہے میرو جیدو کت ہیں جیدہ گا ہتھیار

ھوں نیں تھودئیوں اُن نے کھڑیا زوراں نال
پکڑی ایہہ رے چھُری مِٹھو کیو ہے ہلال
ایسی نمک حرامی کوئی نہ کرے دوجی وار
تے دوتر مان ھوویں ست پیڑی نمک حرام

(پھر کشال نے مٹھے مانجھی کو بُلایا۔ مٹھے نے کہا میں آیا تو تم مجھے ماردو گے ماما۔ کُشال نے کہا میں تجھے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ پھر مٹھا مانجھی آیا تو کُشال نے کہا میرا پیارا کہاں ہے اور اُس کے ہتھیار کہاں ہیں۔ مٹھے نے جواب دیا ہتھیار راٹھی زبردستی چھین کر لے گئے۔ پھر کشال نے چُھری پکڑی اور مٹھے کو حلال کیا اور کہا کہ آئندہ کے لئے کوئی بھی نمک حرامی نہ کرے۔ اس لئے یہ سزا اپنے بھانجے مٹھے مانجھی کو دی)

بیساکھ

بیساکھ ایک موسمی گیت ہے۔ بیساکھ گُجر قبائل کی زندگی کا خوبصورت ترین مہینہ ہوتا ہے۔ جب سردی کے خاتمے پر بہار آتی ہے اور چاروں طرف ست رنگے پھول کھلتے ہیں اور گجر اپنے مویشیوں، ریوڑوں اور اہل خانہ کے ساتھ ڈھوکوں بہکوں، مرگوں کا رُخ کرتے ہیں۔

بیساکھ
آتا بیساکھ کی ہے نشانی
نیلو نیلو تلو ناتے ٹھنڈو ٹھنڈو پانی
میریا ست رنگیا بیساکھا
مریا سیج پھُلاں کیا راکھا
راجہ بہلو مڑیئے

(بیسا کھ کی آمد کی نشانی سرسبز میدان اور ٹھنڈے پانیوں کے چشمے ہیں۔میرے ست رنگے بیسا کھ۔خوبصورت پھولوں کے راکھے بیسا کھ تو جلد لوٹ آنا)

آیو ہے بیساکھ تے پھلیو سوہنو گھاہ
حالیں نیں مڑیو تے نکلن لگو ساہ
راجہ بہلو مڑے

(بیسا کھ آگیا اور گھاس تک پھول گئی۔لیکن میرا محبوب نہیں آیا۔اب میرا دم نکلنے لگا ہے۔اس لئے جلد لوٹ آ)

چڑھتا بیساکھ مانھ گیگھی گیت کانویں
بولیں سُوہنی بولی ترا باجوں ترساویں
راجہ بہلو مڑیئے

(جب بیسا کھ کی آمد ہوتی تو گہگھی گیت گاتی ہے لیکن تو میرے قریب نہیں۔اس لئے یہ گیت بھی مجھے اچھے نہیں لگ رہے۔میرے راجا جلدی آجا)

چڑھتا بیسا کھ ماں چاروں آں رے بکری میرے
سجن کی جُدائی ماں سُک ہوئی لکڑی
راجہ بہلو مڑیئے

(بیسا کھ آیا تو میں بکریاں چرانے نکل پڑی۔لیکن دلبر کی جُدائی میں سوکھ کر لکڑی ہو چکی ہوں۔اس لئے تو جلد لوٹ آ)

چڑھتا بیساکھ ماں رُت سوہنی چلے
درد جُدائی میرا کالجہ نا سلے
راجہ بہلو مڑیئے

(بیسا کھ کی آمد پر خوبصورت رُت جاری ہے۔لیکن جدائی کے درد نے میرے دل کو چھید کے رکھ دیا ہے۔اس لئے تو جلد آجا میرے راجہ)

قینچی

قینچی صوبہ جموں کے پہاڑی علاقے میں ایک مقبول لوک گیت ہے۔ محبت سے لبریز کہانی پر مبنی یہ گیت گوجری اور پہاڑی زبانوں میں ایک جیسا ہے۔ اگرچہ بول الگ اور شعر مختلف ہیں۔ روایت ہے کہ درشی کے جنگلوں میں جنگل کاٹنے والے ٹھیکیدار کا منشی نہایت دیدہ زیب اور بانکا شخص تھا۔ وہ جہاں رہتا تھا اس کے قریب واقع گھر ایک لڑکی کے ساتھ اُس کی محبت ہوجاتی ہے جو اتنی حسین ہوتی ہے کہ پورے گاؤں کے نوجوان اُس پر فدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ لڑکی منشی سے پیار کرتی ہے۔ اس لئے نوجوان منشی کا قتل کر دیتے ہیں۔ جب لڑکی کو پتہ چلتا ہے تو پاگل ہوجاتی ہے اور اسی حالت میں گھر سے نکل جاتی ہے اور جنگل جنگل گھوم کر اپنے محبوب کو ڈھونڈتی ہے اور منشی کی یاد میں جو گیت گاتی ہے اُسے قینچی کہا جاتا ہے۔ قینچی گیت کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں ۔

قینچی

درشی کا بنّاں ماں بولتی ایہ لگھ رے
چٹا تیرا کپڑا تے ڈاہڈی سوہنّی پگ رے
لگی قینچی غماں کی

(درشی کے جنگل میں چکور خوشی سے بول رہا ہے لیکن میرے دل کو تیرے غم کی قینچی کاٹ رہی ہے اور تیرے سفید کپڑے اور خوبصورت پگڑی یاد آرہی ہے)

درشی کا بناں ماں چڑی نیلا دھاری
گیو میرو منشی تے جین کس کاری
لگی قینچی غماں کی

(درشی کے جنگلوں میں نیلا دھاری کی بیل درختوں سے لپٹ رہی ہے لیکن میرا منشی تو چلا گیا

ہے۔اب جینا کس کام کا۔ مجھے تو غم کی قینچی کاٹ رہی ہے)

درشی کا بناں ماں سوہنی سوہنی ڈھوک رے

گیو میرو منشی تے رویں سارا لوک رے

لگی قینچی غماں کی

(درشی کے جنگل میں نہایت خوبصورت ڈھوکیں ہیں لیکن جب سے میرا منشی گیا ہے۔ ان ڈھوکوں میں رہنے والے لوگ رو رہے ہیں۔ کیونکہ غم کی قینچی کاٹ رہی ہے)

درشی کا بناں ماں چنوں بن تِل رے

گیو میرو منشی تے لگتو نہیں دل رے

لگی قینچی غماں کی

(درشی کے جنگلوں کے اندر اگرچہ میں بن تِل چُن رہی ہوں۔ لیکن جب سے منشی گیا ہے میرا دل نہیں لگ رہا اور غم کی قینچی کاٹ رہی ہے)

درشی کا بناں ماں ڈُھنگا ناڑ رے

گیو میرو منشی کے دل گیو ساڑ رے

لگی قینچی غماں کی

(درشی کے جنگلوں میں گہرے پانیوں کے نالے بہہ رہے ہیں لیکن جب سے منشی گیا ہے میرا دل جل بھُن چکا ہے۔ کہیں نہیں لگتا۔ کیونکہ غموں کی قینچی کاٹ رہی ہے)

بیاہ شادیوں کے گیت

گوجری لوک رنگ میں شادی بیاہ کے گیتوں کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ کیونکہ پُرانے وقتوں میں دل جوئی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا، اس لئے بیاہ کے وقت مختلف رسموں کے ساتھ گیت جُڑے ہوتے تھے جنہیں گا کر عورتیں ماحول کو لُبھاؤنا بنا دیتی تھیں۔ ان گیتوں

میں مہندی، ڈولی، گانو، پرادیس، پگ سہرو، بابل، امبڑ یئے اہم گیت ہیں۔ کچھ گیتوں کے بند ملاحظہ کریں۔

اُٹھو سئیو مہندی راہن نا چلیے
راہ وۂ گیو مَلیار مہندی رانگلی ہے
اُٹھو سیئو مہندی گڈُن نا چلیے
گڈوۂ گیو دعوار مہندی رانگلی ہے

(آؤ سہیلیو! مہندی کو بیجنے چلیں لیکن ملیار نے مہندی پہلے ہی بیچ دی ہے۔ آؤ سہیلیو! مہندی کے پودے کو گوڑی کرنے چلیں۔ مگر دعویدار نے پہلے ہی گوڑی کر دی ہے)

اُٹھو سیئو مندی کپن نا چلیے
کپ وۂ گیو ملیار مہندی رانگلی ہے

(آؤ سہیلیو! مہندی کی فصل کاٹنے چلیں۔ مگر وہ تو پہلے ہی کٹ چکی ہے۔)

اُٹھو سیئو مہندی بنڈن ناچلیے
بنڈوۂ گیو دعویدار مہندی رانگلی ہے
بگ گئی ایہ بازار مہندی رانگلی ہے
بچھی وۂ بھلی رنگدار مہندی رانگلی ہے

(آؤ سہیلیو! مہندی بانٹنے چلیں لیکن دعوے دار نے پہلے ہی بانٹ دی ہے۔ اب تو بازار میں بِک رہی ہے اور بڑی رنگدار مہندی ہے)

گانو

مھارا بیرنا گانو بھناون
کون کوئی آیو بھلا
اماں اپنی تے لوک پرایو بھلا

(میرے بھائی کو گانا باندھنے کے لئے کون کون آیا ہے۔ان میں اماں اپنی ہے باقی سب پرائے ہیں)

بٹنو

مھارا نکڑانا بٹنو لاوون
کون کوئی آیو بھلا
دوست اپنا تے لوک پرایو بھلا

(میرے بیٹے کو بٹنا لگانے کے لئے کون کون آیا ہے۔آئے تو بہت سے لیکن ان میں دوست اپنے ہیں، باقی سب پرائے ہیں)

کپڑا

مھارا نِکڑا نا کپڑا لواون
کون کوئی آیو بھلا
نانی اپنی تے لوک پرایو بھلا

(میرے بیٹے کو کپڑے پہنانے کے لئے کون کون آیا ہے۔آئے تو سبھی ہیں لیکن نانی اپنی ہے، باقی سب پرائے ہیں)

سیرو

مھارا نکڑا ناں سہرو بدھان
کون کوئی آیو بھلا
ماموں اینو تے لوک پرایا
کون کون آیو رے

(میرے بیٹے کو سہرا باندھنے کے لئے کون کون آیا ہے۔آئے تو سبھی ہیں لیکن ماما اپنا ہے،

باقی سب پرائے ہیں)

مھارا نکڑانا جج چڑھاون

کون کوئی آیو بھلا

مُلاں اپنو تے لوک پرایو بھلا

(میرے بیٹے کی بارات میں کون کون آیا ہے۔ آئے تو سبھی ہیں لیکن ملا اپنا ہے، باقی سب پرائے ہیں)

سہرہ

متھا گا لشکیں بال

اس مہارا بیر کا

(میرے بھائی تو نے سہرا باندھا ہے تو تیرے ماتھے پہ بال چمک رہے ہیں)

آبیرہ بن سگنا گو گانو

گانا کا پھُمن چار

اِس مھارا بیرا گا

(میرے بھائی آ تجھے شگن کا گانا باندھوں جس کے ساتھ چار پھول لگے ہیں)

آ بیرا لا ہتھاں نا مہندی

مہندی کو رنگ لال

اس مھارا بیر گا

(آ میرے بھائی تجھے مہندی لگاؤں جس کا رنگ لال ہے)

آبیرا آبَیس چوکی ور

چوکی کا پاوا چار

اس مھارا بیر گا

(آ میرے بھائی تو چوکی پر بیٹھ جس کے چار پائے ہیں)

آ بیرا لا سگنا کا کپڑا
کپڑا سئیں درزی چار
اس مھارا بیر گا

(آ میرے بھائی تو شگنوں کے کپڑے پہن۔ تیرے کپڑے چار درزیوں نے مل کر بنائے ہیں)

آ بیرا بھن سگنا کو سہرو
سہرہ گی لڑی ہے چار
اس مھارا بیرگا

(آ میرے بھائی تو شگنوں والا سہرا باندھ۔ اس سہرے کی چار لڑیاں ہیں)

بابُل

بابُل گیت اُس وقت گایا جاتا ہے جب ڈولی تیار ہوتی ہے اور بیٹی اپنے باپ سے شکوے کرتی ہے۔

بابل کے محلیں بولے کبوتر
بن ماں بولے مور
دھن بابل تھارو جگرو
دھی دتی ہے ٹور

(بابل کے محل میں کبوتر بول رہا ہے اور جنگل میں مور۔ بابل تیرا کتنا حوصلہ ہے کہ تو نے اپنی بیٹی کو بھیج دیا ہے)

دھی پرادیسن چار دھاڑے
سدا نہیں رہنو کول
دھن بابل ترو جگرو

(بیٹی تو پردیسیوں کی طرح ہوتی ہے جو باپ کے گھر چند دن رہتی ہے اور چلی جاتی ہے۔
بابل تیرا کتنا بڑا حوصلہ ہے)

کس کی دِھی بابل کس کو پوت
رب نے بنایو جوڑ
دِھی دتی ہے ٹور
دَھن بابل ترو جگرو

(کسی کی بیٹی اور کسی کا بیٹا ہوتا ہے اور پروردگار دونوں کا جوڑا بنا دیتا ہے تو بیٹی چلی جاتی ہے۔
بابل تیرا کتنا بڑا حوصلہ ہے کہ تو بیٹی کو بھیج دیتا ہے)

گوجری لوک گیتوں میں عشق اور محبت کے گیت بھی عام ملتے ہیں جن میں سرگی، موسم بریالو، بھور، ماہیو، شپاہیو، ڈھول شامل ہیں۔ ان گیتوں میں ملن، جدائی، دوری کا بیان اور محبوب کی تعریف شامل ہے۔ سرگی گیت کے یہ بند ملاحظہ کریں۔

سرگی

سرگی کو تارو سوہنو سے چڑھیو
لاٹ مارے لوو ہانی اندر بڑھیو
ترو لِشکارو ہانی جھل نیں سکتی

(سحری کا خوبصورت تارہ طلوع ہوا۔ دروازے پر تارے کی لاٹ پڑی تو میرا محبوب اندر آ گیا جس کے چہرے کا نور دیکھنے کے لائق ہے)

آیو رے ہانی تاراں گی لو ماں
بیٹھی اُڈیکوں میں چن کی سلو ماں
ترو لِشکارا ہانی جھل نیں سکتی

(اے میرے محبوب تو تاروں کی لو میں آنا اور میں تاروں کی ملگجی چاندنی میں تیرا انتظار کروں

گی۔تو اتنا خوبصورت ہے کہ میں تیرے چہرے کے نور کو آنکھ بھر کر دیکھ نہیں سکتی)

آیورے ہانی برفاں نا لنگ کے
موڑ یورے ہانی رات دھیاڑی منگ کے
ترو لشکارا ہانی جھل نیں سکتی

(میرا ساتھی برف پر چل کر آیا ہے جسے میں نے رات دن اللہ سے مانگ کر لیا ہے۔اُس کے چہرے کے نور کو آنکھ بھر دیکھ نہیں سکتی)

آیورے ہانی گھوڑا اُپر چڑھ کے
ہانی کی نشانی رکھی سینہ اندر مڑھ کے
تیرو لشکارو ہوں جھل نیں سکتی

(میرا سنگی گھوڑے پر سوار ہو کے آیا ہے جس کی نشانی میں سینے کے اندر رکھی ہوئی ہے۔اُس کے نور بھرے چہرے کو میں آنکھ بھر دیکھ نہیں سکتی)

ماہیا اگر چہ گوجری، پہاڑی، سرائیکی، پوٹھوہاری اور پنجابی میں گایا جاتا ہے لیکن گوجری کا ماہیا اپنی زمین کی خوشبو رکھتا ہے اور گُجر سماج کی علامتوں سے اس کا سنگھار ہوتا ہے۔ماہیا سُنتے ہوئے انسان کو گوجری سماج کے اندر جھانکنے کا موقع بھی ملتا ہے اور محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔پیش ہیں کچھ بند۔

ہتھ چھاپ تراماں کی
پھُوپھی کیا او منڈیا
ہوں دھی ترا مامائی

(ہاتھوں میں ترامے کی چھاپ پہنانے والے اور نوجوان میں تیرے مامے کی بیٹی ہوں)

کالا کوٹ سوا ماہیا
ننگا پھٹکھا رہ لیاں گا
پرادیس نہ جا ماہیا

(میرے محبوب تُو کالا کوٹ پہن جو تجھے اچھا لگتا ہے۔لیکن پردیس مت جا۔ہم یہاں ہی بھوکے ننگے رہ لیں گے)

چٹی چادر خاشا گی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جھلے
میرا ماہیا گا پاسا گی

(خاشا کی سفید چادر ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔لگتا ہے یہ ہوا میرے محبوب کے ہاں سے آ رہی ہے)

کالا پھنگ ہیں تتراں گا
ہک وار آگے مل سجناں
فِر کدے نا بچھڑاں گا

(تیّر کے پر کالے ہیں۔پر تو ایک بار مل جائے تو پھر کبھی نہ بچھڑیں گے)

اچی نکی پر چر بھلیا
ھوں راہ تکتو ریو
تم پانی بھر ٹُر چلیا

(اونچی ٹیکری پر کھانا بنانے کے لئے آگ جل رہی ہے اور میں تیری راہ دیکھتا رہا لیکن اے میرے محبوب تو چشمے سے پانی بھر کر چلی گئی)

گوجری لوک رنگ میں صوفیانہ کلام کا اہم مقام ہے جس میں عشق مجازی کی رمزوں کے ذریعے عشق حقیقی کی طرف در کھولنے کی سعی کی گئی ہے۔یہ کلام عام طور پر بزرگ لوگ دوزانو بیٹھ کر موسیقی کے بغیر کانوں کو اُنگلیوں سے دبا کر روحانی مستی کے عالم میں گاتے ہیں اور باقی لوگ احترام کے طور پر بڑی خاموشی کے ساتھ سُنتے ہیں۔گوجری صوفیانہ کلام لکھنے کی صنف سہ حرفی، بارہ ماسے یا پھر مثنوی ہے جس میں کلام لکھنے والے کا نام بھی آتا ہے۔اس کے باوجود یہ کلام گوجری لوک رنگ کا ہی حصہ مانا جاتا ہے۔سہ حرفیوں کے کچھ بند

پیش ہیں۔

ح۔ حُکم تیرو گھر بار تیرو مری جان قربان بساریئے نہ
چیتو نہ بساریئے جان گُھمائی مرتا دم توڑی قولوں ہاریئے نہ
جس کوسنگ کریئے اُس کے سنگ مریئے دغودے پردیس ماں ماریئے نہ
نونؔ۔ سدّے جے تناں غلام تری مھیساں نال آیئے بھانویں چاریئے نہ

(مجھ پر تیرا حُکم واجب ہے۔ میں تجھ پر قربان جاؤں۔ مگر مجھے بھولنا مت۔ تو نے جو میرے ساتھ قول وقرار کئے ہیں انہیں یاد رکھنا۔ کیونکہ میں نے اپنی جان تجھ پر قربان کی ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ وعدہ کیا ہے زندگی بھر اُسی کے ساتھ رہنا ہے۔ دغا دے کر پردیس میں مارنا نہیں۔ اور اگر تیرا محبوب تجھے بھینس چرانے کے لئے بُلائے تو آجانا، یہ تجھے نونؔ کہتا ہے)

ز۔ زری خیال نہ اُناں نا مھارو۔ جن کو رہ ہمیش خیال ہم نا
کیا یاد نہ جُھاں نے بھل کے بھی۔ بھلنو اُنھاں گو ہو یو محال ہم نا
نہیں تھی گھڑی منظور جدائی ہم نا۔ اُن تیں بچھڑیاں ہوا کئی سال ہم نا
اللہ سُنے ذبیحؔ دعا مھاری۔ ملے یار سوہنا خیراں نال ہم نا

(اُن کو ہمارا ذرا بھی خیال نہیں جن کی ہمیشہ یاد آتی ہے۔ جنہوں نے ہمیں بھُول کے بھی یاد نہیں کیا۔ اُن کو بھولنا محال ہو رہا ہے۔ ایک گھڑی بھی جن سے جدائی ہمیں منظور نہ تھی اُن سے بچھڑے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ ذبیحؔ رب سے یہی دعا مانگتا ہے کہ میرا خوبصورت یار خیریت کے ساتھ آن ملے)

ن۔ نور تے نار کی کھیڈ ساریں نیکی نور تے بدی نا نار لکھوں
نیکی کروں تے ملے آرام مناں۔ کروں بدی تے غماں کی مار لکھوں
کروں بدی ارادہ کے نال اپنے نیکی کروں تے فاعل مختار لکھوں
صابر سخت جہان ماں جین اوکھو۔ اس جین نا چھُری کی دھار لکھوں

(اس دنیا میں نور اور نار کے تمام کھیل ہیں۔ میں نیکی کو نور اور بدی کو نار سمجھتا ہوں۔
میں اگر نیکی کرتا ہوں تو روح کو آرام ملتا ہے اور اگر بدی کروں تو غموں کی مار میرے
لئے ہے۔ میں ارادہ کر کے بدی نہیں کرتا اور نیکی کروں تو اپنے کو مختار نہیں سمجھتا۔
صابر اس مشکل جہان میں جینا اُتنا ہی دشوار ہے جیسے چھُری کی دھار پر چلنا محال
ہوتا ہے)

جدید گوجری زبان وادب

جموں وکشمیر میں جہاں جہاں گُجر آباد ہیں وہ گوجری زبان ہی بولتے ہیں جو گوجر قبائل کی مادری زبان ہے۔ چونکہ اس زبان نے صدیوں کا سفر طے کیا اور ایسے علاقوں میں رہی جہاں لکھنے پڑھنے کے وسائل نہ تھے یا مخصوص حالات کے باعث اُن علاقوں میں سینکڑوں برسوں تک درس وتدریس کا چلن رُکا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گوجری زبان جس کا ماضی درخشندہ رہا ہے اپنے ادبی مرکزوں سے دُور ہوتی چلی گئی۔ صوبہ جموں میں بولی جانے والی گوجری نے بھی زمانے کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ اس کے باوجود علاقہ پونچھ راجوری کو جہاں گجر قبائل کا مرکز مانا جاتا ہے وہیں یہاں کی گوجری زبان بھی خالص گوجری مانی جاتی ہے جس نے دوسری زبانوں کو دیا تو بہت کچھ ہے لیکن اثر کسی کا قبول نہیں کیا ہے۔ اُدھر جموں شہر اور اس کے گردونواح یعنی سانبہ، ریاسی، اودھم پور میں جہاں دودھی گجر آباد ہیں وہ اپنے لہجے کی گوجری بولتے ہیں جس میں مقامی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اسی طرح کٹھوعہ، ڈوڈہ اور اودھمپور کے کنڈی علاقوں میں خانہ بدوش گجر ہیں جو زیادہ تر بکروال کہلاتے ہیں۔ اگر چہ وہ بھی گوجری زبان ہی بولتے ہیں لیکن لہجے میں فرق نمایاں دکھائی دیتا ہے لیکن یہ سب لہجے لفظ اور تلفُظ کے ہیر پھیر کے باوجود گوجری زبان کے اندر ہی سمائے ہوئے ہیں۔

جموں وکشمیر میں گوجری زبان نے کب اور کن حالات میں قدم رکھا اس بارے

میں وثوق کے ساتھ کہنا ممکن نہیں۔ البتہ راج ترنگنی میں اُن گجروں کا ذکر ہے جو پہاڑی دروں کے قریب آباد تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ صوبۂ جموں میں گجروں نے گجرات سے کشمیر کی طرف آنے والے شاہی قافلوں کے ہمراہ آنا شروع کیا تھا۔ پھر یہ سلسلہ مغلوں کے عہد میں بڑھتا چلا گیا اور گجر ملازمت کے سلسلے میں قافلوں کے ساتھ یہاں آنے لگے اور دھیرے دھیرے یہاں کی آب و ہوا اور موسموں سے متاثر ہو کر یہیں سکونت اختیار کرتے گئے۔ آج بھی گجروں کی سب سے بڑی تعداد کشمیر کی طرف جانے والے دروں کے دامن میں علاقہ راجوری، پونچھ اور بُدھل میں آباد ہے۔ چونکہ ان علاقوں میں لکھنے پڑھنے کے وسائل موجود نہ تھے اس لئے گجر جو زبان بولتے تھے اُس کی ترقی اور ترویج ایک عرصہ تک نہ ہو سکی اور گوجری زبان ماں بولی کی صورت میں نسل در نسل آگے بڑھتی رہی اور گوجری زبان میں صرف لوک ادب پنپتا رہا۔ گوجری لوک ادب بڑا زرخیز اور شاداب ہے۔ اس میں جہاں لوک گیت ملتے ہیں، لوک باریں پائی جاتی ہیں، وہیں کہانیاں اور قصے بھی موجود ہیں۔ گوجری زبان میں جدید شاعری کرنے کی ابتدا اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی میں صوفی درویشوں اور پیروں فقیروں کے ڈیروں سے ہوئی جنھوں نے سی حرفیاں، بارہ ماسے اور بیت لکھ کر اس زبان کو تحریری صورت میں اُجاگر کیا۔ حضرت باباجی صاحب لاروی، حضرت میاں نظام الدین لارویؒ اور نون پونچھی پہلے گوجری صوفی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس طرح اٹھارہویں صدی عیسوی کے بعد گوجری میں لکھنے پڑھنے کی ابتدا ہوئی۔ 1917 کے آس پاس حضرت باباجی صاحب کی گوجری سی حرفیوں کی کتاب سامنے آئی اور 1920ء کے بعد گجر قبائل نے حضرت میاں نظام الدین لاروی غلام حسین لسانوی کی قیادت میں اپنی قوم کی شیرازہ بندی کرنی شروع کی تو گوجری میں لکھنے کا چلن بھی بڑھنے لگا۔ حضرت میاں نظام الدین لارویؒ تبلیغ کے لئے جب صوبۂ جموں کے دوروں پر آتے تو علاقہ پونچھ، راجوری، میرپور اور کوٹلی میں رات کے وقت مجالس آراستہ کیا کرتے تھے جن میں گُجر اور پہاڑی شعرا کو کلام پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ حضرت موصوف کی کاوشوں کی بدولت پونچھ،

راجوری اور کوٹلی میں شاعروں اور ادیبوں کا ایک کاروان چل نکلا جہاں زیادہ تر شعرا صوفیانہ شاعری کیا کرتے تھے۔ پھر چوہدری غلام حسین لسانوی، راجوری کے چوہدری دیوان علی، مہرالدین قمر، حاجی محمد اسرائیل کھٹانہ اور چوہدری وزیر محمد ہکلہ نے نہ صرف خود لکھنا شروع کیا بلکہ دوسروں کو بھی راغب کیا۔ 1940 کے آس پاس چودھری فتح علی سرمدی کسانہ نے ''نوائے گجر'' اور ''گجر دیس'' نکال کر گُجر شاعروں اور ادیبوں کو ایک اسٹیج فراہم کیا۔ اُس دور کے معروف گُجر ادیبوں میں نون پونچھی، سروری کسانہ، مولانا محمد اسماعیل ذبیح، مولانا محمد اسرائیل مہجور، میاں فتح محمد درہالوی، مہرالدین قمر، خدابخش زار، حاجی حسن الدین حسن گورسی، شمس الدین مہجور پونچھی، میاں محمد اسرائیل اثر راجوروی، سائیں قادر بخش، اعلم الدین بن باسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سلسلہ 1947 تک چلتا رہا۔ لیکن 1947 کے واقعات کے بعد گوجری تحریک جو حضرت میاں نظام الدین نے شروع کی تھی وہ رُک گئی۔ کیونکہ شاعر اور ادیب سرحد کے آر پار چلے گئے اور ایسے سنگین مسائل میں مبتلا ہوئے کہ انہیں زبان و ادب کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔ مختلف وجوہات کی بنا پر جموں و کشمیر میں گجر قبائل ایک عرصے تک پسماندہ اور پچھڑے ہوئے رہے۔ آزادی کے بعد ایک عرصے تک غریبی اور محکومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن 1975 میں شیخ محمد عبداللہ جب دوسری بار برسر اقتدار آئے تو انہوں نے پچھڑی ذاتوں اور قبائل کو آگے لانے کے لئے ہمہ گیر کوششیں کیں۔ گجر ترقیاتی بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے گجر بستیوں میں سکول کھولے گئے۔ ڈھوکوں، بہکوں، مرگوں میں موبائل سکول چلائے گئے۔ بچوں کو وظیفہ جات سے نوازا جانے لگا۔ ہر ضلع میں گجر بکروال ہوسٹل کھولے گئے۔ 1991 میں مرکزی حکومت کی جانب سے گجر قبائل کو درجہ فہرست قبائل کے زُمرے میں لایا گیا اور مربوط طریقے سے ان کی فلاح و بہبود کے کام شروع ہوئے۔

گوجری زبان اور تمدنی ورثہ کی ترقی کے لئے جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی میں گوجری شعبہ قائم ہوا اور گوجری زبان اور ورثے کی دیکھ بھال اور تمدن کے فروغ کے لئے

کام ہونے لگا۔ گجر شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں نے تمدنی اور ثقافتی وراثت کے تئیں اپنا فرض نبھانے کے لئے آگے آنا شروع کیا۔ ریڈیو کشمیر سرینگر، ریڈیو کشمیر جموں، آکاش وانی پونچھ، دوردرشن کیندر سرینگر اور جموں سے گوجری زبان وثقافت کے لئے جم کر کام ہونے لگا جس کا سیدھا اثر ان قبائل کی زندگی پر پڑا اور وہ دھیرے دھیرے دورِ جدید کی ترقی کی شاہراؤں پر گامزن ہونے لگے۔ آج گجر قبائل اپنی تاریخ اور ثقافت سے ضیا حاصل کر کے نئی نئی راہیں تلاش رہے ہیں۔ ایک طرف گوجری زبان میں کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو دوسری جانب گُجر چیری ٹیبل ٹرسٹ جموں نے چودھری مسعود احمد کی رہبری میں گجر ثقافت اور تہذیبی فروغ کے لئے زبردست کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جس سے گجر تہذیب وثقافت کے گل بوٹے اُبھر کر سامنے آرہے ہیں۔ چودھری مسعود احمد نے گوجری زبان کا رسالہ ''آوازِ گرجر'' گوجر چیری ٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے نکال کر شاعروں اور ادیبوں کے لئے راہ ہموار کی جس میں گوجری زبان کی ترقی اور بہتری کے لئے کام ہونے لگا۔ چودھری صاحب کی کاوشوں نے گجر قوم کو تمدنی ورثے کے تئیں بیدار کیا۔ ڈاکٹر جاوید راہیؔ کی بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اسی طرح چودھری جاوید راہی نے گوجری زبان و ادب وثقافت کے لئے نہ صرف جدوجہد کی بلکہ گوجری ٹرائبل ریسرچ سینٹر قائم کر کے زبان وادب کے فروغ کے لئے اہم کام کیا ہے۔ جہاں کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے شیرازہ گوجری، ہمارو ادب اور ڈکشنری کا کام ہوا وہیں انفرادی طور پر گوجری ادیبوں نے اپنی کتابیں چھاپ کر اپنا حصہ ادا کیا ہے اور گوجری زبان وثقافت کے فروغ کا یہ سفر اب شدومد سے جاری ہے۔

......☆......

پہاڑی بولنے والے لوگ

پہاڑی

صوبۂ جموں کے خطۂ پیر پنچال کو پہاڑی لوگوں کا وطن مانا جاتا ہے، جس میں بدھل، پونچھ اور راجوری کے علاوہ کنٹرول لائن کے اُس پار بھمبر، میر پور، کوٹلی، سدھنتی، باغ اور راولا کوٹ شامل ہیں۔ اس خطے میں پہاڑی صدیوں سے آباد رہے ہیں۔ جنگجو، سرفروش اور بہادر لوگوں کا یہ طبقہ اس خطہ پر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا حکمران بھی رہا۔ گاؤں میں ان لوگوں کی زمینیں اور گھر کوٹھے بنے ہوتے ہیں۔ ان کی اکثریت کا ذریعۂ معاش زراعت اور زراعت سے جُڑے پیشے رہا ہے۔ ان لوگوں کا منفرد تمدنی تشخص، تہذیبی ورثہ، ثقافتی میراث انہیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ یہ لوگ اس خطے کے پہاڑی ڈھلوانوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سکونت کرتے ہیں جبکہ گرمیوں میں پہاڑی لوگوں کا وہ طبقہ جو مویشی رکھتا ہے ڈھوکوں اور مرگوں میں بھی جاتا ہے۔

مختلف مذاہب، ذاتوں، فرقوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے پہاڑی لوگ آپس میں رواداری اور میل ملاپ سے رہتے اور ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں، مسلمان اور سِکھ بھی شامل ہیں جن کو مادری زبان پہاڑی اور مشترکہ تمدنی ورثے نے آپس میں باندھ کے رکھا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی عادتوں، وطیروں، روایات، اقدار، ذائقوں، مشاغل اور پہناوے میں یگانگت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ نہایت خوبصورت، چُست، بانکے، بہادر اور مردِ میدان واقع ہوئے ہیں۔ ان ہی اوصاف کی بدولت پہاڑی لوگوں کو کشمیر کے محافظ اور نگہبان کا رُتبہ ملا ہوا ہے۔ یہ لوگ

شوقین مزاج واقع ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے میلے، تہواروں میں شامل ہوتے، شادی بیاہ بڑی شان سے کرتے ہیں۔ ان کی روایات میں فراخ دلی، خلوص اور محبت کا عنصر نہایت گہرا ہے۔ صفائی اور ستھرائی کا خاص خیال رکھتے ہیں اور گاؤں کی مجالس میں شامل ہونا اور اپنی رائے دینا ان کے عادات میں شامل رہا ہے۔

پہاڑی کھانے اور پکوان

دریائے چناب اور جہلم کے درمیان علاقہ پیر پنچال کے جنوب اور مغربی حصے میں پہاڑی اور گجر بکروال لوگ سکونت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ علاقے صوبۂ جموں میں آتے ہیں لیکن یہاں کا کھان پان اور تمدنی وراثت ڈوگروں سے تھوڑی مختلف ہے۔ جہاں تک کھانے پینے کا تعلق ہے یہ لوگ مکئی کی روٹی کو مکھن، پسی ہوئی مرچ، نمک اور لہسن کے لیپ کے ساتھ کھانا پسند کرتے ہیں۔ یہ روٹی لسی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ ڈھوکوں مرگوں میں یہ لوگ دودھ اور لسی کو ملا کر روٹی کے برابر کلاڑی تیار کرتے ہیں جو کھانے میں نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ اس کلاڑی کو سُکھا کر بھی رکھا جاتا ہے جو کسی بھی وقت استعمال میں لائی جاسکتی ہے۔ اُدھر گاؤں میں سرسوں کا ساگ، گھنیار کا ساگ اور شلغم کے ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی ایک عام کھانا ہے جسے دیہات میں لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ گھنیار اور سرسوں کے ساگ کو چاولوں میں دودھ ڈال کر بھی کھایا جاتا ہے جبکہ چاولوں کو راجماش کے ساتھ کھانا ایک اعلیٰ ڈش مانی جاتی ہے۔ مکئی کی روٹی عموماً تندور میں پکائی جاتی ہے۔ مکئی کے آٹے کے ستو چائے میں ڈال کر کھائے جاتے ہیں۔ کچی مکئی کے بُھنے ہوئے کُرکُرے بھٹے خریف کے موسم میں کھائے جاتے ہیں، وہیں یہ بُھٹے سُکھا کر رکھے جاتے ہیں اور سردیوں کے موسم میں لوگ بستروں میں بیٹھے ہوئے مزے سے بُھنے ہوئے دانے چباتے ہیں۔ مکئی کے بعد چاول بھی لوگ خوشی سے کھاتے ہیں لیکن گاؤں میں چونکہ چاول میسر نہیں ہوتے تھے اس لئے مکئی

کی روٹی سے گزارہ کیا جاتا تھا۔لیکن آج کے دور میں مکئی کی روٹی کے علاوہ رات کو چاول پکائے جاتے ہیں اور صبح ناشتے میں گندم کے پُھلکے بھی کھانے کا رواج عام ہو چلا ہے۔

روایتی طور پر لوگ صبح صبح نہاری بنایا کرتے تھے اور رات کے پکے ہوئے چاولوں میں دودھ یا دہی ڈال کر کھایا جاتا تھا۔شیر نمکین چائے کے ساتھ مکئی کی روغنی روٹی اور گندم کے پراٹھے کا استعمال بھی ہوتا ہے۔غریب گھروں میں آٹے کے ستو قہوے میں ڈال کر بھی تناول کئے جاتے ہیں۔

دوپہر کا کھانا عموماً تندور میں پکی ہوئی مکئی کی روٹی کو نمک، مرچ، ساگ اور لسی کے ساتھ کھایا جاتا ہے لیکن جب زمیندار کھیت میں کام کر رہے ہوتے ہیں تو تندور کی روٹی کو نمک، مرچ، لہسن کی چٹنی کو مکھن میں ملا کر روٹی پر لیپ لگا کر لسی کے ساتھ پروسا جاتا ہے جسے کسان کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کھاتے ہیں تو پکنک کا مزہ آجاتا ہے۔

جن گھروں میں مویشی دودھ دیتے ہیں وہاں عام طور پر رات کے وقت لسی میں گھنیار کا ساگ ملا کر یخنی تیار کی جاتی ہے جسے کڑھی کہتے ہیں، جس میں نمک مرچ کے علاوہ جنگلی خوبانی کی گریاں پیس کر ڈالی جاتی ہیں۔کڑھی پہاڑی لوگوں اور گجر قبائل کی مقبول ترین ڈش ہے۔کڑھی مکئی کی روٹی اور چاولوں کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔دالوں میں عام طور پر راجماش، لوبیا اور موٹھ دال پروسے جاتے ہیں۔دعوتوں میں مرغے یا بکرے کا گوشت پکتا ہے۔لیتری (گھاس کاٹنے والے) لیب (شالی کے پودے لگانے والے) اور جنگل سے شہتیر لانے والے کامگاروں کے لئے چاول، شکر اور گھی پروسنے کا رواج ہے۔جبکہ نیاز کے وقت بکرے کی قربانی یا پھر ہلدی والے چاولوں میں میٹھا ڈال کر کھلایا جاتا ہے۔

برف باری کے دنوں میں پہاڑی اور گجر قبائل کے گھروں میں پسے ہوئے چاولوں کا کڑھا بنایا جاتا ہے جسے چلیٹھی کہا جاتا ہے۔مکئی کے بھنے ہوے دانوں کو پیس کر اس کا شیرا بنا کر بھی پیا جاتا ہے۔دیسی گھی کے تڑکے پر میٹھی والے چاول پکائے جاتے ہیں اور اُن میں گُڑھ ڈالا جاتا ہے۔یہ ڈش سردیوں کے موسم میں کھائی جاتی ہے۔عورتیں گیہوں

کے نشاشتے کا استعمال عام کرتی ہیں۔ یہ خوراک بچے کی پیدائش کے بعد عورت کو دی جاتی ہے۔ گاؤں میں شکار مار کر کھایا جاتا ہے اس میں جنگلی مُرغے، کبوتر، تیتر، جنگلی بکریاں وغیرہ شامل ہیں۔ اُدھر ہندو اور سکھ گھروں میں صبح چائے کے ساتھ پراٹھا، دن کو چاول دال دہی، مکئی کی روٹی اور لسی اور شام کو راجماش، دالیں اور چاول اور سبزیاں پکائی جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں کڑاہ پوری حلوا، کچوری پراٹھا، کانجی، شربت اور مٹھائیاں کھانے کا رواج عام ہے۔ جبکہ مسلمان گھروں میں شادی بیاہ کے موقعے پر بکرے ذبح کئے جاتے ہیں اور گوشت کے پکوان بنائے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہندو اور سکھوں میں ویشنو کھانا کھلانے کا رواج ہے جس میں کڑا پوری، میٹھے چاول، راج ماش، پنیر، دم آلو، سبزیاں، راشیہ، میوہ اور کھانے پینے کے دیگر سٹال بھی لگائے جاتے ہیں۔

اُدھر لائن آف کنٹرول کے اُس پار علاقۂ جموں میں پہاڑی اور گجر قبائل کے ذائقوں سے ملتا جلتا کھانا ہی کھایا جاتا ہے لیکن کہیں کہیں پکانے میں فرق ہے۔ جیسے باٹ بنانا۔ پونچھ راجوری میں باٹ مکئی کے کچے دانوں کو پیس کر بنایا جاتا تھا۔ ساون بھادوں میں جب لوگوں کے گھروں میں اناج ختم ہوجاتا تو اکثر غریب گھروں میں مکئی کے بھٹوں کا باٹ کھا کر گزارہ کیا جاتا تھا۔ اسے چلہ باٹ کہتے تھے۔ علاقہ راولاکوٹ اور کوٹلی میں مختلف چیزوں کا باٹ بنتا ہے، جیسے نکا باٹ، یہ السی کو پیس کر بناتے ہیں اور کمزور لوگوں کو دوا کے طور پر دیا جاتا ہے۔ چہاسا باٹ، یہ چلہ باٹ کی طرح مکئی کے دانوں کا بنتا ہے۔ اس میں گھی اور مکھن بھی ڈالا جاتا ہے لیکن اس میں مکئی کے بُھنے ہوئے دانے استعمال ہوتے ہیں۔ اُدھر راولاکوٹ میں ذائقہ بدلنے کے لئے مکئی کے دانوں کو بُھنا جاتا ہے پھر ان کو پیس کر آٹا بنایا جاتا ہے، پھر اس کی روٹی بنائی جاتی ہے جسے چکیانی روٹی کہا جاتا ہے۔

علاقہ پونچھ راجوری کے عوام کی طرح اُس پار بھی رات کی پکی ہوئی مکئی کی روٹی جسے 'بہی روٹی' کہا جاتا ہے کو شوق سے کھایا جاتا ہے جبکہ پونچھ راجوری میں 'بہی روٹی' کو دودھ کے کٹورے میں بھگو کر اور میٹھا ڈال کر تناول کیا جاتا ہے۔ مکئی کے بھنے ہوئے دانوں کو اخروٹ

اور گُڑھ میں ملا کر کھانے کا رواج سرحد کے دونوں طرف ہے۔اسی طرح لسی اور دودھ سے کلاڑی پنیر اور کڑان (یہ صرف لسی سے بنتا ہے) بڑے عمدہ پکوان ہیں جبکہ وہ لسی جس سے ابھی مکھن نہ نکالا گیا ہواُسے 'ادریڑ کا' کہتے ہیں جبکہ راولاکوٹ میں اسے ''بوری نی لسی'' کہا جاتا ہے۔ یہ لسی اکثر مائیں اپنے بچوں کو پلاتی ہیں۔اسی طرح انار دانے، پودینے اور دھنیے کو کوٹ کر اور نمک مرچ ڈال کر جو چٹنی بنائی جاتی ہے وہ عوام میں نہایت مقبول ہے۔ یہ چٹنی، سالن اور چاولوں کے ذایقے کو تیکھا کرنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی ہے۔اُدھر گندم کے کچے دانے کو بھون کر اور میٹھا ملا کر کھائے جاتے ہیں۔اِسے اُمیاں کہا جاتا ہے۔

صوبۂ جموں کے علاقۂ پیر پنچال میں بہت سی قسموں کے پھل ہوتے ہیں جیسے جنگلی خوبانی جسے ہاڑی کہا جاتا ہے ایک عام میوہ ہے جسے غریب امیر سب کھاتے ہیں۔اس کے علاوہ بگو گوشہ، ناخ، پتھر ناخ، سیب، چوٹا، بٹنگ، آڑو، اخروٹ، املوک، بہی، پلمپ، کینٹھی وغیرہ پھل مقامی طور پر دستیاب ہوتے ہیں جنہیں عوام استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دڑونہ، پھگواڑہ، سمبلو، گرچھ، بیرنویں، کاچ ماچ، وغیرہ بھی اس علاقے میں ہوتے ہیں جو علاقہ جموں سے مختلف ہیں۔

لباس

ڈوگری بولنے والے خطہ سے باہر آئیں تو علاقہ جموں میں دوسری زبانیں بولنے والے لوگ ملتے ہیں جن میں پہاڑی اور گجر سب سے زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ان کا پہناوا ڈوگروں سے تھوڑا مختلف ہے۔ پہاڑی عورتیں شلوار، لمبی چھینٹ کی ڈھیلی ڈھالی قمیض اور اوڑھنی جسے چادر یا چھپری بھی کہا جاتا ہے زیب تن کرتی ہیں۔سردی کے موسم میں جرابیں اور سویٹر کا بھی استعمال کرتی ہیں اور سر پر شال رکھنے کا بھی رواج ہے۔اگر چہ اب پاؤں میں چپل پہنی جاتی ہے لیکن پرانے وقتوں میں گاؤں میں جوڑا پہنا جاتا تھا جو مقامی موچی چمڑا کما

کر تیار کرتا تھا اور پھر تلے سے کڑائی کر کے اسے دیدہ زیب بنایا کرتا تھا۔عورتوں میں برقعہ پہننے کا بھی رواج ہے جبکہ سر پر چادر اتنی بڑی اور لمبی رکھتی ہیں کہ اس سے وجود ڈھانپا جا سکتا ہے۔شادی بیاہ کے موقعے پر عورتیں اور لڑکیاں لال چھینٹ کے سوٹ پہن کر اور سُرمہ، سکڑا(داتن) اور مہندی لگا کر اپنے آپ کو زیادہ کشش والی بناتی ہیں۔ہندو عورتیں بھی تقریباً اسی قسم کا لباس زیب تن کرتی ہیں لیکن ان کی شلوار قمیض ڈھیلی نہیں ہوتی ہے بلکہ جسم سے لگی ہوئی ہوتی ہے۔اوڑھنی کو پلا کہا جاتا ہے۔پلا چھپری سے چھوٹا ہوتا ہے۔مسلمان عورتیں اگر چھپری سے اپنا سر ماتھے تک ڈھانپ لیتی ہیں لیکن ہندو عورتوں میں پلا سر پر بھی رکھا جاتا ہے اور صرف گلے میں بھی ڈالا جاتا ہے۔بالوں کو سادگی سے گوندکر پروندھے سے باندھا جاتا ہے۔لیکن ہندوؤں میں راج پوت عورتیں مسلمان عورتوں کی طرح وجود کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔پرانے زمانے میں ان عورتوں میں بھی بُرقعہ پہننے کا رواج ہوتا تھا۔یہ برقعہ سفید رنگ کا ہوتا تھا لیکن اب ہندوؤں میں برقعہ پہننے کا رواج جاتا رہا ہے۔

امیر پہاڑی لوگوں میں مرد سفید رنگ کی شلوار، بوسکی کی قمیض، کالی واسکٹ یا ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنتے تھے۔کوٹ کے بٹنوں کے ساتھ چاندی کی زنجیر لگی ہوتی تھی جس کے ساتھ گھڑی ہوا کرتی تھی۔یہ گھڑی کوٹ کی اوپر والی جیب میں ڈالی جاتی تھی۔ٹُرے والی رنگدار پگڑی یا پھر تلے والا افغانی کُلاہ کے اوپر سفید صافہ باندھنے کا رواج ہے جبکہ غریب پہاڑی لوگ ملیشے یا کھدر کی شلوار قمیض پہنتے اور سر پر صافہ باندھتے ہیں۔کئی جگہ کھتی رنگ کی لُنگی بھی سر پر باندھی جاتی ہے۔گاؤں میں جب کوئی کھاتے پیتے گھر کا پہاڑی خان سوٹ زیب تن کر کے، چشم بلبُل کمبل کی بُکل مار کر، سر پر قلعی دار پگڑی سجائے گھوڑے پر سوار گاؤں کی پگڈنڈیوں پر نکلتا ہے تو پرانے وقتوں کا رئیس یا جاگیردار دکھائی دیتا ہے۔

سردیوں کے موسم میں اکثر پہاڑی لوگ شالی کے خوشوں کی بنی ہوئی چپل جسے ''پول'' کہا جاتا ہے، استعمال میں لاتے ہیں اور سردی سے بچنے کے لئے ٹانگوں کے گرد پٹو کا بنا ہوا مفلر نما کپڑا باندھتے ہیں جسے ''پتاوے'' کہا جاتا ہے۔اسی طرح جسم ڈھانپنے کے

لئے 'لوی' کی بُکل مار کر آگ تاپنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لوی سفید رنگ کی اون کی چادر ہوتی ہے جسے مقامی کسب دار تیار کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں آسودہ حال اور پڑھے لکھے پہاڑی لوگ نئے زمانے کے لباس پہننے میں دوسروں سے پیچھے نہیں اور پینٹ سوٹ، ٹائی، شیروانی وغیرہ کا استعمال عام ہو چلا ہے۔ اب گاؤں میں لوگوں نے پگڑی کی جگہ چارخانہ پٹکا باندھنا بھی شروع کیا ہے اور افغانی ٹوپی جسے قراقُلی ٹوپی کہا جاتا ہے اُسے بھی پہنتے ہیں۔ شادی بیاہ اور میلے تہواروں پر پہاڑی مرد عورتیں سج دھج کر اپنے پہناوے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

کھیل اور مشاغل

ڈوگری بولنے والے علاقے کے باہر پہاڑی اور گجر لوگ آباد ہیں جن کے اپنے مشغلے اور کھیل ہیں۔ پہاڑی اور گجر لوگوں کے مشغلے بڑے شاندار اور جاندار ہوتے ہیں۔ ان مشغلوں اور کھیلوں سے عام طور پر طاقت کا مظاہرہ اور مقابلہ کرنے کا عنصر عیاں ہوتا ہے۔ گاؤں اور پہاڑی علاقوں اور ڈھوکوں مرگوں میں موسم بہار میں پہاڑی اور گُجر نوجوان مویشی چرانے، زمینداری کرنے کے بعد یا پھر شادی بیاہ کے موقعوں پر جب مسرت کے لمحے میسر آتے ہیں تو یہ لوگ فطرت کے کُھلے ماحول میں، معتدل موسمی حالات سے متاثر ہو کر کھیل کود اور دیگر مشاغل میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان مشاغل میں بھینسیں لڑانا، مینڈھے لڑانا، مرغے لڑانے کے علاوہ دوسرے مشاغل اس طرح ہیں:

بنی پکڑنا

بنی پکڑنا گجر اور پہاڑی نوجوانوں کا مخصوص مشغلہ ہے۔ اس میں دو نوجوان میدان میں اُترتے ہیں اور ایک نوجوان دوسرے کی کلائی کو اِتنے زور سے پکڑ لیتا ہے کہ

دوسرا چھڑا نہ سکے۔ پھر دوسرا نوجوان پورا زور لگا کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس زور آزمائی میں دونوں کئی بار گرتے اور اُٹھتے ہیں لیکن کلائی اس قدر مضبوطی سے پکڑی جاتی ہے کہ اُسے چھڑانے میں وقت لگتا ہے۔ اگر کلائی چھڑالی جائے تو کلائی پکڑنے والا ہار جاتا ہے۔ اگر کلائی نہ چھڑائی جاسکے تو پکڑنے والا جیت جاتا ہے۔ زور آزمائی کے اس کھیل کو دکو گاؤں میں لوگ بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ اور میلے تہواروں پر بھی بینی پکڑنے کا رواج عام ہے۔

بگدر اُٹھانا

یہ پہاڑی لوگ اور گجر قبائل کا ایک اور منفرد مشغلہ ہے۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ من پتھر کو تراش کر چکور کیا جاتا ہے اور پھر پکڑنے کے لئے درمیان میں پتھر کی ہی ہتھی بنائی جاتی ہے۔ اسے بگدر کہا جاتا ہے۔ بگدر اکثر میلے تہواروں اور شادی بیاہ کے موقعے پر اُٹھایا جاتا ہے اور اسے نوجوان کی طاقت اور بہادری کی علامت مانا جاتا ہے۔ جب نوجوان میدان میں اُترتا ہے تو اکثر ڈھول والے زور زور سے ڈھول بجاتے ہیں اور تماشہ بین تالیاں بجا بجا کر اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ نوجوان ایک دو بار پتھر کو دیکھتا ہے اور دائرہ نما میدان میں چکر لگاتا ہے پھر جوش کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور پتھر کو ہتھی سے پکڑ کر سیدھے سر سے اوپر لے جاکر کھڑا ہو جاتا ہے اور پتھر کو کچھ دیر کے لئے ہاتھوں پر تھامے رکھتا ہے جبکہ تماشائی جوش کے ساتھ تالیاں بجا کر اور شور وغُل مچا کر اُس نوجوان کی پذیرائی کرتے رہتے ہیں۔ پھر پتھر کو چند لمحوں تھامنے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔ بگدر اُٹھانے کا کھیل علاقہ پونچھ، راجوری اور کنٹرول لائن کے اُس پار بھمبر، میرپور، کوٹلی، راولا کوٹ باغ اور سدھنتی وتھکیالہ پروا میں بہت مقبول رہا ہے۔

پنجہ لڑانا

پنجہ لڑانا بھی پہاڑی لوگوں اور گجر قبائل کا ایک اہم کھیل رہا ہے۔ اس میں دو

نوجوان کسی میز کے آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کہنیوں کے سہارے ہاتھ آگے کر کے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ پھر ریفری کے اشارے پر دونوں زور لگا کر اسے دائیں یا بائیں طرف ہاتھ کو میز کے ساتھ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جو جیت جاتا ہے، اُسے انعام سے نوازا جاتا ہے۔

لٹھ بازی

لٹھ بازی لکڑی کی سوٹیوں (ڈنڈوں) کا کھیل ہے جسے عام طور پر گجر قبائل ڈھوکوں اور مرگوں میں کھیلتے ہیں۔ جب انہیں فرصت کے لمحے میسر آتے ہیں تو بزرگوں کی فرمائش پر نوجوان لٹھ یعنی ڈنڈے لے کر آجاتے ہیں اور پھر ڈنڈوں سے ایک دوسرے پر وار کرنے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کھیل تلوار بازی اور گتکہ کی ہی ایک چھوٹی صورت ہے۔

شمشیر بازی

شمشیر بازی پہاڑی اور گجر دونوں قبائل کھیلتے ہیں۔ ڈھوکوں، مرگوں میں فرصت کے لمحوں یا شادی بیاہ میں تلوار بازی کا کھیل کھیلا جاتا تھا جو لٹھ بازی کی طرح وار کرنے اور دفاع کرنے پر مبنی ہوتا تھا۔ اب اس کا چلن نہیں رہا۔

کھنُوٹلہ

کھنوٹلہ کرکٹ کے کھیل کا ہی بدل ہے جو پہاڑی اور گجر لڑکے اکثر مویشی چراتے ہوئے کھیلتے تھے۔ یہ کھلے میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ اس میں وکٹوں کی جگہ پتھر رکھے جاتے ہیں اور گیند کی جگہ ہاتھ سے کپڑے کا بنایا گیا گیند ہوتا ہے جسے کھنو کہتے ہیں اور بیٹ کی جگہ بیٹ نما سادہ لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ اُسے ٹلہ کہتے تھے۔ دھیرے دھیرے گاؤں میں اب یہ کھیل ناپید ہو رہا ہے اور اس کی جگہ کرکٹ نے لے لی ہے۔

پنج گھیٹی

یہ کھیل اکثر چھوٹے بچے اور بچیاں کھیلتی ہیں۔اس میں پانچ گھٹیاں یعنی چھوٹے چھوٹے گول کنکروں کا استعمال ہوتا ہے۔اس میں کنکروں کو اُچھالا جاتا ہے اور پھر پکڑا جاتا ہے۔ پہلے الگ الگ، پھر دو دو، پھر ایک ساتھ پانچ گھیٹے پکڑے جاتے ہیں۔ پھر ہاتھ کو اُلٹا سیدھا کر کے انہیں اچھالا جاتا ہے۔ ہر مرحلہ طے کرنے کے بعد گھر بن جاتا ہے اور مخالف پر باری چڑھ جاتی ہے۔ یہ صوبہ جموں کے پہاڑی علاقوں میں لڑکیوں کا دلچسپ اور مقبول کھیل رہا ہے جسے وہ فرصت کے لمحوں میں کھیلا کرتی ہیں۔

گتکہ

گتکہ شمشیر بازی کی مانند تلواروں کا کھیل ہے۔صوبہ جموں میں گتکہ سکھوں میں بہت مقبول ہے جو عام طور پر گورو پورب منانے کے موقعے یا پھر بیساکھی جیسے تہواروں کے وقت کھیلتے ہیں۔ یوں تو گتکہ جموں شہر اور جموں کے دوسرے علاقوں میں بھی کھیلا جاتا ہے لیکن پونچھ میں سکھ اپنے ہی انداز میں کھیلتے ہیں۔ یہاں گوردواروں کے ساتھ کچھ گتکہ سکھانے والے جڑے ہوتے ہیں جو مختلف عمر کے لوگوں کی ٹولیوں کو گتکہ کھلاتے ہیں اور گورو پورب پر گتکہ کھیلنے والی کئی ٹولیاں تلواریں لہراتے ہوئے باہر آتی ہیں اور مذہبی جلوس کے ساتھ جوش بھرے انداز میں گتکہ کھیل کر دیکھنے والے سے اپنی مہارت کا لوہا منواتی ہیں۔ کیونکہ تلوار اور ڈھال کے اس کھیل میں وار کرنے اور وار روکنے میں اگر ذرا سی بھی چوک ہو جائے تو جان پر بن سکتی ہے۔

کبڈی

کبڈی اگر چہ پورے ملک میں کھیلی جاتی ہے لیکن صوبۂ جموں میں کبڈی کا کھیل گاؤں کی سطح سے لے کر صوبائی سطح تک مقبول ہے۔کھیل کھیلنے والے کبڈی کبڈی کرتے

ہوئے جب مخالف کی طرف آتے ہیں تو تیزی، حوصلے اور چُستی سے باہر آنا پڑتا ہے۔ اسے گاؤں اور شہروں میں اشتیاق کے ساتھ لوگ دیکھتے ہیں۔

صوبۂ جموں میں ان کھیلوں کے علاوہ ہاکی، فٹبال، والی بال، رسہ کشی، دوڑ لگانا، لک چھپ کھیلنا، مویشیوں کی لڑائیاں جیسے بھینسے، بیلوں، مینڈھوں، مرغوں کی لڑائی بھی لڑی جاتی ہے جبکہ مغربی پونچھ میں کتوں کی لڑائی اہم مانی جاتی ہے جسے 'پیڑ' کہا جاتا ہے۔ لڑاکے کُتے شوقین لوگ پالتے ہیں۔ انہیں گوشت اور دودھ دیا جاتا ہے۔ کُتوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اگر کُتا لڑتے ہوئے بول جائے تو اس کی ہار مانی جاتی ہے۔ کتوں کی لڑائی راولاکوٹ اور سدھنتی علاقے میں بہت مقبول ہے۔

شکار کھیلنا بھی صوبۂ جموں کے عوام کا اہم مشغلہ رہا ہے۔ پرانے وقتوں میں جنگلی جانوروں اور پرندوں کا شکار ایک ہُنر مانا جاتا تھا۔ برف کے موسم میں جب خرگوش، تیتر اور بٹیر جھاڑیوں سے نکل کر برف پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو تاک میں بیٹھے شکاری یا تو انہیں پکڑ لیتے تھے یا پھر شکار کر لیتے تھے۔ اسی طرح موسم سرما شروع ہونے پر جنگلوں سے کبوتروں کے ڈار اُڑ کر گاؤں میں آجاتے تھے اور شکاری انہیں اپنا نشانہ بنا لیتے تھے۔ لیکن اب شکار کی طرف لوگوں کی رغبت کم ہو چلی ہے اور حکومت کی طرف سے پابندی بھی عائد ہے۔

پہاڑی لوگوں کے زیور اور زیبائش

پہاڑی لوگ زیور پہننے کے شوقین ہیں۔ پہلے یہ زیور چاندی کے ہُوا کرتے تھے لیکن اب دھیرے دھیرے سونے کے زیوروں کا رواج ہو چلا ہے۔ پہاڑی عورتیں زیبائش کے لحاظ سے اپنی منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ گاؤں میں عام زمیندار لوگوں میں آرائش کے لئے چاندی کے گہنے پہننے کا رواج ہے جن میں گلے کے لئے سہری، حملیلیں، دولڑا اور نورنامہ کا استعمال ہوتا ہے۔ اب سونے کی گانی بھی پہنی جاتی ہے جو گردن کے ساتھ لپٹی ہوئی پیچھے کی طرف چلی جاتی ہے۔ کہیں کہیں لال، پیلے اور سفید کانچ کے موتیوں کی مالائیں بھی گلے میں

پہنی جاتی ہیں۔جبکہ پہاڑی خطہ میں ہندواورسکھ عورتیں گلے میں عموماً سونے کے ہار یا زنجیر جس کے ساتھ لاکٹ ہوتا ہے، پہنا کرتی ہیں۔ ہندوعورتیں ہاتھوں میں کڑے اور چوڑیاں پہنتی ہیں جبکہ مسلمان عورتیں ہاتھوں میں کنگن، مریدے، چوڑیاں اور کڑے پہنتی ہیں جو چاندی یا سونے کے ہوتے ہیں۔کانوں میں جھمکے، بالا، مُرکی، کانٹا، ٹاپس پہننے کا رواج ہے۔ ناک میں کوکا یا تھیوے والا تیلہ یا پھر لونگ پہنا جاتا ہے۔لونگ ہمیشہ سونے کا ہوتا ہے اور اس کے درمیان میں لال رنگ کا تھیوہ لگا ہوتا ہے۔لونگ سب سے خوبصورت گہنا مانا جاتا ہے جو ناک کے اگلے حصے کو ڈھانپ لیتا ہے۔عورتیں لال تھیوے والی چھاپ پہننے کی شوقین ہوتی ہیں۔اسی طرح گجر عورتیں گلے میں ہیری اور موٹے منکوں والی مالائیں، حملیل، کڑے، جھمکے، چھلے، بالا اور لونگ پہنتی ہیں۔ دومڑے بھی پہنے جاتے ہیں۔کانوں میں بندے یا بالی یا مرکی پہنی جاتی ہے جبکہ ہاتھوں میں رنگین نگوں والی انگوٹھیاں۔اس کے علاوہ کانچ کی بنگیں جو کلائی میں ڈالی جاتی ہیں زیبائش کا مقبول گہنا ہیں۔

پورے صوبۂ جموں میں زیبائش کے لئے عورتیں اور مرد آنکھوں میں سُرمہ ڈالتے تھے۔ ہاتھوں میں مہندی لگاتے تھے اور ہونٹوں کو اخروٹ کے داتن سے رنگنے کا رواج تھا۔ جبکہ گجر قبائل میں عورتیں شہد سے نکلنے والے موم (جسے سِتھا کہا جاتا ہے) سے سر کے بالوں کو گوندھتی تھیں۔ بکروال عورتیں بھی مینڈیاں گوندواتی ہیں یعنی بالوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ کر اُسے گوندھتی ہیں اور پھر مینڈیوں کی لڑیاں ماتھے کے دائیں اور بائیں طرف سے کانوں کے پیچھے لے جا کر پرونده ڈال کر انہیں باندھ دیتی ہیں۔ یہ مینڈیاں کئی کئی ہفتوں تک گندھی رہتی ہیں اور بکروال عورتوں کی پہچان کی علامت ہوتی ہیں۔ مرد مہندی ہاتھوں کو ہی نہیں لگاتے بلکہ بزرگ لوگ مہندی سے اپنی سفید داڑھیاں بھی رنگتے ہیں۔ اُدھر چاندی کا ایک گہنا جسے دند کھرچن کہا جاتا ہے اور جس کے ساتھ تھیوے اور گھنگھریاں لگی ہوتی ہیں پہاڑی اور گجر عورتیں گلے میں لٹکائے رکھتی ہیں جس کی نوک سے دانتوں کی صفائی کی جاتی ہے اور یہ گہنا زیبائش کے کام آتا ہے۔اب جبکہ جدید طرز کے ٹوتھ

پیسٹ اور برش عام ہو چلے ہیں۔ دندھر چن کا رواج کم ہو چلا ہے۔

پہاڑی زبان

لفظ پہاڑی کے لغوی معنی بہت وسیع ہیں اور ہر وہ شخص جو پہاڑوں میں سکونت کرتا ہے پہاڑی کہلا سکتا ہے۔ جیسے جموں و کشمیر میں دُر کپا، برو کپا، بول بوٹو شینہ، درد، گدی، گجر، بکروال قبائل بھی اس زُمرے میں آسکتے ہیں۔ لیکن بقول موتی لال ساقی مخصوص تاریخی، لسانی، سماجی اور سیاسی حالات نے پہاڑی اصطلاح کو نئے معنی عطا کئے اور لفظ 'پہاڑی' زبان پر آتے ہی کچھ خاص نسلی قبیلوں کے لوگ ہمارے ذہن میں گھومنے لگتے ہیں، جن کی مادری زبان پہاڑی ہے اور جو صوبۂ جموں کے علاقۂ پیر پنچال کے دامن میں دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی پہاڑی خطے میں آباد ہیں۔ یہ قبائل صدیوں سے اس پہاڑی خطے میں مخصوص طرزِ زندگی، منفرد ثقافتی، تمدنی ورثے اور مخلوط کلچر کے ساتھ اکٹھے رہتے چلے آرہے ہیں جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل ہیں۔ کیونکہ اس خطہ کا ہر وہ شخص جس کی مادری زبان پہاڑی ہے، وہ پہاڑی کہلاتا ہے۔

فریڈرک ڈریو نے اپنی کتاب ''دی ناردرن بیریر آف انڈیا'' میں پہاڑیوں کو جفاکش، بہادر، سرکش، دلیر اور بااعتبار قبائل کا درجہ دیا ہے۔ یہ لوگ سادہ رہن سہن، دلچسپ مشاغل، منفرد چہرے بشرے، خوبصورت خد و خال، روایتی لباس، شاندار تاریخی ورثے، جاندار ثقافتی وتمدنی پس منظر اور میل ملاپ کے باعث اپنی الگ پہچان اور شناخت رکھتے ہیں۔

پہاڑی دراصل مخلوط کلچر کا نام ہے جس میں بہت سے کلچر خلط ملط ہو چکے ہیں۔ اس کلچر میں اگر مسلم ثقافت کے رنگ اُبھرتے ہیں تو ہندو تہذیب کی چھاپ بھی دکھائی دیتی ہے اور سکھوں کے تہذیبی ورثے کی علامتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر (جن کا بچپن پونچھ میں گزرا تھا) اپنی کتاب ''مٹی کے صنم'' میں پہاڑی تہذیب

کو اُس قالین سے تشبیہہ دیتے ہیں جس میں مختلف رنگوں کے پھول مل کر اس قالین کو زیبائی عطا کرتے ہیں۔ پہاڑی قبائل کا موازنہ دیودار کے درخت کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح پیر پنچال کے جنگلوں میں دیودار ہمیشہ سر بلند اور سرسبز رہتا ہے اور مختلف موسموں کے باوجود نو بہ نو رہتا ہے، ایسے ہی پہاڑی بھی تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے سر بُلند، باوقار اور سدابہار لگتے ہیں۔

علاقہ پیر پنچال میں اگرچہ گجر بکروال قبائل بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں اور کشمیری بولنے والے لوگوں کی بستیاں بھی ملتی ہیں لیکن پہاڑی لوگ اکثریت میں آباد ہیں جو اپنے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ورثے کے علاوہ مادری زبان پہاڑی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔صوبہ جموں میں بانہال کے جنوب میں بُدھل، راجوری، تھنہ منڈی، درہال، منجھا کوٹ، نوشہرہ، کالاکوٹ، سندربنی، مینڈھر، سورن کوٹ، منڈی پونچھ میں آباد لوگوں کی زبان پہاڑی ہے۔اُدھر ایل۔او۔سی کے اُس پار صوبہ جموں کے علاقہ بھمبر، میر پور، کوٹلی، سدھنتی، باغ، راولاکوٹ اور تھکیالہ میں آباد لوگوں کی اکثریت پہاڑی ہے جو مادری زبان پہاڑی بولتے ہیں۔اس طرح صوبۂ جموں کے علاقہ پیر پنچال میں گوجری کے علاوہ لفظ اور تلفظ کے ہیر پھیر کے باوجود جو زبان بولی جاتی ہے، وہ پہاڑی زبان ہے۔

1970 کی دہائی کے بعد اس خطہ کی مقامی پہاڑی بولیوں کو پہاڑی زبان کا نام دیا گیا اور پھر اس پچھڑی ہوئی زبان کو نکھارنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اگرچہ پہاڑی خطہ پیر پنچال کے علاوہ وادئ کشمیر اور ضلع جموں کے کچھ علاقوں ایل۔او۔سی کے اُس پار مظفر آباد اور نیلم وادی میں بھی بولی جاتی ہے لیکن پہاڑی زبان کا مرکزی خطہ صوبۂ جموں پیر پنچال علاقہ ہی مانا جاتا ہے جہاں اس زبان کے بولنے والے صدیوں سے آباد ہیں۔ پہاڑی بولنے والوں کی کئی حکومتیں، راجواڑے اور جاگیریں یہاں ہوا کرتی تھیں اور ان کے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ورثے کی جڑیں اس خطہ میں ہی پیوست ہیں۔

آدمی کی پہچان اُس کی زبان سے ہوتی ہے اور زبان ہی کسی قوم، فرقے یا علاقے

کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ پہاڑی زبان اپنے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر میں ایک حقیقت ہے۔ لیکن یہ زبان ایک عرصے تک بے اعتنائی کی شکار رہی۔ اس کے باوجود صدیوں سے یہ زبان پہاڑیوں کی ماں بولی رہی ہے جو آپس میں بول چال، میل ملاپ، لین دین، وید حکیموں کے نسخوں، صوفی بزرگوں کے کلام اور دُکانداروں کے بہی کھاتے لکھنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی رہی ہے۔ 1931 کی مردم شماری کے بعد پہاڑی کو مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے لکھا جاتا رہا ہے۔ جیسے بھمبر راجوری میں اسے چبالی کا نام دیا گیا۔ میر پور میں میر پوری، پونچھ میں پونچھی، اوڑی میں ہندکو، کرناہ مظفر آباد میں کاغانی یا ہزاروی لکھا گیا۔ یہ تمام نام پہاڑی زبانوں کا ہی بدل ہیں۔ الفاظ اور تلفظ کے ہیر پھیر اور مقامی رنگ آمیزی کو چھوڑ کر خطۂ پیر پنچال میں دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقے میں جو عوام کی اکثریت کی زبان رہی ہے وہ پہاڑی ہی تھی۔ اس زبان کو 1970 کے بعد باضابطہ پہاڑی زبان کا نام دے کر اس کو اپنا مقام عطا کیا گیا۔

پہاڑی زبان کے ابتدائی دور کے بارے میں جب ہم جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کا آغاز شہنشاہ اشوک کے عہد میں پورے پہاڑی خطے میں ہوا جو نیپال سے کشمیر تک پورے علاقے میں پھیلا ہوا تھا اور اس کی جڑیں کشمیر میں بدھ مت کے عروج سے جا ملتی ہیں، کیونکہ اس دور میں بُدھ عالموں کے لئے پہاڑی خطہ میں بدھ مت کے پرچار کے لئے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو مقامی لوگوں کی سمجھ میں آسکتی۔ چنانچہ پہاڑی خطے کے علاقہ دراوہ میں شاردا یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ یہاں بدھ عالموں کی چوتھی کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس میں 141ء میں شہنشاہ کنشک نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں بُدھ بھکشوؤں اور عالموں نے فیصلہ کیا کہ بدھ دھرم کے گرنتھوں کو سنسکرت کے بجائے ایسی زبان میں لکھا جائے جو مقامی زبانوں کے قریب ہو اور جس کا رسم الخط آسان ہو۔ اس ضرورت نے شاردا لپی کو جنم دیا جس میں سنسکرت کے علاوہ شورشینی اور مقامی زبانوں کے وہ الفاظ شامل کئے گئے جو عوام میں بولی

جانے والی زبانوں کے تھے۔ اس زبان کو بدھ بھکشوؤں نے اپنے مذہب کے فروغ کے لئے اپنالیا اور پورے پہاڑی علاقوں میں نیپال سے کابل تک پھیل گئے۔ اس طرح بدھ مت کے عروج کے ساتھ ایک نئی زبان کو بھی عروج حاصل ہوا۔ چونکہ یہ پہاڑی علاقوں میں روزمرہ بولی جانے والی زبانوں کے بہت قریب تھی۔ اس لئے جہاں بدھ مت پہاڑی علاقے میں پھیلا وہیں شاردا لپی والی یہ زبان بھی پھیل گئی اور ایک عرصے تک نیپال سے لے کر کشمیر اور کابُل تک لوگوں کی زبان رہی۔

دسویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف کشمیر بلکہ دوسرے پہاڑی علاقوں میں بھی بدھ مت کو نقصان ہونے لگا۔ اس کی وجہ سے بھکشوؤں کی عیاشی، شنکر آچاریہ اور کمار بھٹ جیسے ہندو عالموں کا بدھ مت پر زوردار حملہ تھا۔ اس طرح دھیرے دھیرے ہندوستان کے باقی علاقوں کی طرح پہاڑی خطے میں بھی بدھ مت کے خیمے اُکھڑ گئے اور ہندومت پھر سے فروغ پانے لگا۔ ہندوراجاؤں نے سنسکرت کی سرپرستی شروع کردی اور وہ زبان جو بدھ مت کے فروغ کے لئے رائج کی گئی تھی اُس زبان میں تعلیم اور ترقی رُک گئی۔ بُدھ مت کے نام لیوا شہروں، گاؤں اور قصبوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا بسے۔ ان لوگوں کی زبان پہاڑوں تک محدود ہوگئی اور نیا ادب تخلیق ہونا بند ہوگیا جبکہ بدھ مت کے فروغ کے لئے لکھی گئی کتابیں بھی ناپید ہوتی چلی گئیں۔ اس طرح وہ زبان جو بدھ مت کے نام لیوا بولتے تھے پہاڑوں میں مرکوز ہو کے رہ گئی جسے لوگ ماں بولی کے طور آگے بڑھانے لگے۔ چنانچہ آنے والی نسلیں شاردا رسم الخط کو بھی بھول گئیں جس میں ان کی ماں بولی لکھی جاتی تھی اور ادب کے شہہ پارے پائے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان فقط پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کی زبان بن کر رہ گئی۔ چونکہ اس کی تدریس اور ترقی کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے مقامی طور پر اس کے رنگ بدلتے رہے۔ لہجے میں فرق آتا گیا، لفظ اور تلفظ میں بدلاؤ آتا چلا گیا اور مختلف علاقوں میں الفاظ کے معنی مختلف ہوتے چلے گئے۔ مقامی رنگ آمیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان مختلف گروہوں اور بولیوں میں بٹ گئی۔

مشہور تاریخ دان بین نے پہاڑی زبان کو تین گروہوں میں بانٹا ہے:

(۱) مشرقی پہاڑی: یہ نیپال میں رائج ہے جہاں اسے کھشورہ کہتے ہیں۔

(۲) وسطی پہاڑی: پہاڑی کا یہ گروہ دہرہ دُون، الموڑہ، نینی تال اور کمانوں کے پہاڑی علاقوں میں رائج ہے جہاں موٹے طور پر اسے کماونی کہا جاتا ہے۔

(۳) مغربی پہاڑی: پہاڑی زبان کا یہ گروہ ہماچل پردیش سے لے کر مظفر آباد تک اور کوہ مری کی پہاڑیوں تک رائج تھا۔ ہماچل میں پہاڑی کو مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے ہمیر پوری، اونوی، سرموری، بھگائی، بھگاٹی، کنوری، مہاسوی، لاہولی، کلوی، منڈیالی، بلاس پوری، کانگڑی اور چمبیالی وغیرہ۔ ہماچل پردیش میں پہاڑی لکھنے کا چلن سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے، جہاں اس کی لپی ٹاکری تھی جو شاردا کا ہی بگڑا ہوا روپ ہے۔ لیکن آجکل ہماچل میں پہاڑی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور تمام مقامی بولیوں کو پہاڑی کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔

ہماچل پردیش کی طرح جموں وکشمیر کے پہاڑی گروہ میں چبالی، میر پوری، رام بنی، پونچھی، ہندکو، کاغانی اور ہزاروی نام پہاڑی کو دیئے گئے جو مقامی طور پر لفظ اور تلفظ کے ہیر پھیر کے باوجود ایک ہی زبان کے نام ہیں جسے آگے چل کر پہاڑی کہا گیا ہے جو ریاست کے پہاڑی خطہ میں عوام کی مادری زبان رہی ہے۔ 1977 میں پہاڑی دانشوروں نے ان تمام ناموں کی جگہ صرف 'پہاڑی' زبان نام دے کر اس زبان کی نئ پہچان اور شناخت کا سفر شروع کیا۔

پہاڑی زبان کا رسم الخط

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ پہاڑی زبان کا قدیمی رسم الخط شاردا یا برہمی لپی تھا جو وقت کے ساتھ حالات اور عقیدوں کے بدلنے کی وجہ سے ناپید ہو گیا۔ ہماچل پردیش میں اس کا بگڑا ہوا روپ ٹاکری اور جموں وکشمیر میں ٹاکری کا بگڑا ہوا روپ لُنڈے کی صورت

میں ایک عرصے تک جاری رہا اور بیسویں صدی کے آغاز تک پہاڑی گاؤں میں ساہوکار لوگ اپنے بہی کھاتے لُنڈے رسم الخط میں ہی لکھا کرتے تھے۔

لیکن جموں وکشمیر میں پہاڑی بولنے والے لوگوں کی اکثریت اہل اسلام سے تعلق رکھتی ہے جو لُنڈے رسم الخط سے نابلد تھے۔ جب ان کے ہمسایہ علاقہ پوٹھوہار، ہزارہ اور مغربی پنجاب میں لوگوں نے شاہ مکھی رسم الخط کو اپنی مادری زبان کے اظہار کا وسیلہ بنایا تو یہاں کے پہاڑی شاعروں اور ادیبوں نے بھی شاہ مکھی لپی کو اپنالیا۔ شاہ مکھی کی بنیاد فارسی رسم الخط پر پڑی ہے۔ چونکہ اس رسم الخط میں ابتدا میں صوفی شعرا حضرات شاعری کیا کرتے تھے جس میں اکثریت سید لوگوں کی تھی جن کو شاہ کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ اس لئے صوفی کلام کو لکھنے کے لئے جس رسم الخط کا استعمال ہوا اُسے شاہ مکھی یعنی شاہ (سید) صوفی حضرات کے منہ سے نکلی ہوئی زبان کہا گیا۔ اس رسم الخط میں آجکل پہاڑی زبان کا ادب تخلیق ہو رہا ہے جبکہ کہیں کہیں گورمکھی یا دیوناگری میں بھی پہاڑی لکھی جارہی ہے۔

شاہ مکھی پہاڑی کے مسائل

1892ء میں کھڑی شریف میر پور کے حضرت میاں محمد بخشؒ نے کشمیر میں بولی جانے والی پہاڑی کی پہلی کتاب ''مثنوی سیف الملوک'' شاہ مکھی رسم الخط میں لکھی اور پہاڑی کے دانشوروں کو مادری زبان میں اظہار کا وسیلہ فراہم کیا۔ لیکن پہاڑی کی آوازوں کو شاہ مکھی رسم الخط میں الفاظ کی شکل دینے میں کچھ مشکلات کا سامنا رہا ہے جن کا حل نکالنے کے لئے جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈیمی کی سرپرستی میں پہاڑی دانشوروں کی کچھ کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں اور 'ڑاں'، 'بھ' وغیرہ لکھنے کے لئے علامتوں کی تشکیل ہوئی جیسے بھائی، بھات، بھت وغیرہ کو پہاڑی میں ڈھالنے کے لئے اُن پر شہتیر نما ڈنڈ (-) جیسی علامت بنائی گئی تاکہ پڑھنے میں یہ لفظ اصلی صورت میں پڑھے جائیں مگر یہ طریقہ مقبول نہ ہوا۔

لیکن پہاڑی آوازوں کو لکھنے کے لئے برطانیہ میں پہاڑی لوگوں نے اہم کام کیا

ہے۔ 27 جنوری 2002ء میں عالمی پہاڑی کانفرنس میں اس کی لپی تیار کرنے کے لئے علامتیں اور حروف سامنے لائے گئے۔ اس کام کو انجام تک پہنچانے میں کئی سال لگے اور جدید علم لسانیات وٹیکنالوجی کا استعمال بھی کیا گیا۔ گلاسکو یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات نے پہاڑی زبان میں استعمال ہونے والی آواز 'ڑاں' کی شناخت کے لئے فونولاجیکل سروے کیا جس کی بنیاد پر پہاڑی آوازوں کے لئے علامتوں کا انتخاب ہوا اور پہاڑی پٹی دریافت کی گئی اور اختر امام رضوی نے آواز ''ڑاں'' کے لئے 'ڑ' اور دوہری 'ھ' کے اور 'گ' کو 'غ' کے ساتھ بولنے کے استعمال کا خیال پیش کیا جس پر کانفرنس کے شرکاء نے اتفاق کیا۔ اس طرح پہاڑی آوازیں جہاں 'ھ' کی آواز ہوتی ہے اُسے دوہری 'ھھ' میں بدل دیا گیا۔ اسی طرح 'ڑاں' آواز کو لکھنے کے لئے ''ں'' ڈال دی گئی جیسے جانڑاں کھانڑاں پانڑیں کو لکھنے کے لئے جاٹا، کھاٹا، پاٹی کی علامتیں بنائی گئیں۔ اُدھر بھت، بھالی بھاوی کو لکھنے کے لئے دوہری 'ھ' کا استعمال کر کے پھھت، پھھالی، پھھاوی بنایا گیا۔ اسی طرح لفظ مگروں کو لکھنے کے لئے 'گ' کو 'غ' کے ساتھ بدل کر مغروں بنایا گیا۔ چنانچہ پہاڑی آوازوں کو لکھنے کے لئے جو پٹی تیار ہوئی اُس میں کچھ علامتوں کا اضافہ کیا گیا جو حسب ذیل ہے۔

پٹی

(ا، آ، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، ......، و، ہ، ھ، ھھ، ء، ی، ئ، ے، ئے)

یاد رہے کہ اس کاوش میں شمس الرحمٰن اور علی عدالت کا اہم رول رہا جن کی رہنمائی میں برطانیہ میں یہ کام انجام پایا۔

پہاڑی زبان کی خصوصیات

مشہور تاریخ دان سکھ دیو سنگھ نے اپنی کتاب ''دی بیوٹی فُل انڈیا'' میں پہاڑی کی کچھ ایسی خصوصیات لکھی ہیں جو اسے ہمسایہ زبانوں سے الگ کرتی ہیں۔

(ا) پہاڑی میں ہندی اور پنجابی کی نسبت زیادہ صوتی اجزاء پائے جاتے ہیں۔

(۲) پہاڑی میں ہندی اور پنجابی سے زیادہ Consonants پائے جاتے ہیں۔ (یعنی ٹھوس حرف مثلاً کھ، گھ، خت، ٹ، ٹھ، ڈھ، ڑھ)

(۳) پہاڑی میں Soft Consonants کو Hard Consonants میں تبدیل کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا نکات سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑی اپنے آپ میں ایک مکمل زبان ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر ہے، جغرافیائی خطہ ہے۔ اپنا رسم الخط ہے اور اس کو بولنے والے پہاڑی خطے سے باہر بھی آباد ہیں۔ جموں وکشمیر میں یہ پہاڑی خطہ صوبۂ جموں میں پیر پنچال کے جنوب میں علاقہ پونچھ، سورن کوٹ، مینڈھر، تھنہ منڈی، راجوری، بُدھل، درہال، کالاکوٹ، نوشہرہ اور ایل۔ او۔ سی کے اُس پار بھمبر، میر پور، کوٹلی، تھکیالہ، پراواہ، سدھنتی، راولاکوٹ، باغ اور سدھرون علاقوں پر مشتمل ہے جہاں پہاڑی لوگوں کی اکثریت آباد ہے اور وہ اپنی زبان کے پس منظر، تمدنی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

جدید پہاڑی کا ابتدائی ادبی سفر

جموں وکشمیر میں پہاڑی لکھنے کا رواج بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ کھڑی شریف میر پور کے ولی حضرت میاں محمد بخشؒ کی مثنوی سیف الملوک کو پہاڑی زبان کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے۔ سیف الملوک شاہ مکھی رسم الخط میں تحریر ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایک اساطیری کہانی کو بنیاد بنایا گیا ہے اور پھر رمزوں، کنایوں اور اشاروں کی وساطت سے تصوف کی باتیں کی گئی ہیں۔ صوفیانہ اندازِ بیان نے کتاب کو ایک کہانی کے بجائے ایسا روحانی ماحول فراہم کیا ہے جو ذات سے ذاتِ پاک کے درمیان پردے ہٹانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ کتاب میں بیان کردہ ماحول ٹھیٹھ پہاڑی ہے۔ شعروں میں پہاڑی الفاظ کو لے کر اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ پہاڑی زبان پہلی بار والہانہ انداز میں سامنے

آتی ہے۔ معرفت کے رنگ میں رنگے ہوئے صوفیانہ کلام کو صوبہ جموں کے پہاڑی لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں اور لوگ اپنے گھروں میں قرآن شریف کے ساتھ سیف الملوک بھی احترام کے طور پر رکھتے، پڑھتے اور اس سے روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

سیف الملوک کے بعد پہاڑی میں معرفت کے جذبوں سے سرشار کلام لکھنے کا چلن شروع ہوا اور صوبہ جموں کے پورے پہاڑی خطہ میں درویشوں، پیروں اور سیدزادوں وفقیروں نے پورے علاقہ میں محبت کے فروغ اور روحانی تسکین کے لئے سی حرفیاں، بیت اور بارہ ماسے لکھنے شروع کئے۔ اُن شعرا میں چن زمان، نون پونچھی، حضرت بابا جی صاحب، حضرت میاں نظام الدین لاروی، سائیں قادر بخش، سائیں فقر الدین اور خدا بخش زار اور ذبیح راجوری کے نام سرفہرست ہیں، جنہوں نے 1947-1925ء کے درمیان تصوف اور روحانی شاعری سے پہاڑی زبان میں لکھنے کی شروعات کی۔ اس میں سب سے اہم رول حضرت میاں نظام الدین لاروی کا رہا۔ حضرت موصوف پونچھ راجوری، میر پور، کوٹلی اور بُدھل میں جب روحانیت کے فروغ کے لئے دورے پر آتے تو مُریدوں کے گھروں میں قیام کرتے تھے اور پہاڑی لوگوں کے ہاں بھی اُن کا قیام ہوا کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ مُریدوں کے علاوہ گوجری اور پہاڑی صوفی شاعروں کا قافلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ اکثر رات کے وقت روحانی مجالس منعقد ہوا کرتیں جن میں صوفی شاعر اپنا کلام پیش کرتے اور کلام کی درستی کا عمل ہوتا۔ اس طرح صوبہ جموں کے علاقہ پونچھ، راجوری، میر پور اور کوٹلی میں پہاڑی صوفی شاعروں کا ایک قافلہ آگے بڑھا۔ لیکن 1947ء کے واقعات کے بعد جب صوبہ جموں دو حصوں میں بٹ گیا تو سب سے زیادہ اثر پہاڑی لوگوں پر ہوا جن کے خاندان کے افراد سرحد کے آر پار رہ گئے اور وہ ایسے مسائل میں مبتلا ہوئے کہ ایک عرصہ تک اپنی مادری زبان کے فروغ کی طرف توجہ مرکوز نہ کر سکے۔

حضرت میاں نظام الدین لاروی نے 'اشعار نظامی' لکھ کر پہاڑی کے صوفیانہ کلام کو اور معتبر بنا دیا۔ کچھ شعر یوں ہیں ؎

ا۔ آچناں لے پیغام جاویں تری سجناں سنگ آشنا یاں او
تینوں دیکھداھووسی یار میرا ترے حسن تھیں گھر کھمایاں او
ہتھ بن کے دیں سلام میرا آکھیں تساندے ہجر مار مکایاں او
گیو چھوڑ غلام نظام تایں تساں یاریاں توڑ نہ لائیاں او

آزادی کے بعد یہ علاقہ تین جنگوں اور نامساعد حالات کے باعث بُری طرح متاثر ہوا جس سے عوام کو اپنی مادری زبان کی ترقی کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہ ملی۔لیکن 1975ء میں شیخ محمد عبداللہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے ریاست میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کے فروغ کا سلسلہ شروع کیا۔اس طرح پہاڑی زبان کی ترقی کی راہیں بھی ہموار ہونے لگیں۔1978ء میں کلچرل اکیڈیمی میں کریم اللہ قریشی کی قیادت میں پہاڑی شعبہ قائم ہوا۔1978ء میں پہلی پہاڑی کانفرنس سری نگر میں منعقد ہوئی جس میں ریاست بھر کے پہاڑی شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو شرکت کا موقع ملا۔اس کے ساتھ ہی قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ضلع اور تحصیل سطحوں پر ادبی کانفرنسوں کا سلسلہ بھی چل نکلا۔اُدھر اکیڈیمی کی جانب سے شیرازہ، استا ادب، لوک گیتوں اور کہانیوں کے نمبر شائع ہونے لگے اور تمدنی ورثے کے فروغ کے لئے کام مربوط طریقے سے ہونے لگا۔دوسری جانب ریاست کے پہاڑی دانشور ایڈوکیٹ نور اللہ قریشی کی قیادت میں پہاڑی کلچرل ویلفیئر فورم کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ پہاڑی زبان کے ورثے اور تمدن کو فروغ دیا جاسکے۔ اس فورم کے ابتدائی اراکین میں نور اللہ قریشی کے علاوہ غلام مصطفےٰ پنچھی، نذیر مسعودی، راجوری کے مرزا عبدالرشید، کالاکوٹ کے ٹھاکر کشمیر سنگھ، درہال کے صابر مرزا اور عبدالرشید ملک، سورن کوٹ سے سید مشتاق حسین شاہ بخاری، ایوب شبنم، حسام الدین بیتاب اور راقم الحروف شامل تھے۔ پہاڑی ویلفیئر فورم نے جہاں زبان وتمدن کے فروغ کے لئے جدوجہد شروع کی وہیں اس طبقہ کے دیرینہ مطالبات کے لئے بھی برسر پیکار رہا۔ یہ غیر سیاسی جماعت ادبی اور تمدنی فروغ کے لئے کاوشوں میں سرگرم رہی۔نتیجہ یہ ہوا کہ عوام

میں اپنی مادری زبان اور ورثے کے تئیں شعور پیدا ہوا اور احساس کمتری جاتا رہا اور قلم کاروں کا ایک قافلہ سامنے آ گیا۔ اُدھر ریڈیو کشمیر سرینگر اور آل انڈیا ریڈیو پونچھ سے پہاڑی زبان میں پروگرام نشر ہونے لگے۔ دوردرشن کیندر سرینگر اور جموں سے پہاڑی سیریل ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔ یوسف نسیم لاروی نے رسالہ گلشن ادب اور ظفر اقبال منہاس نے رسالہ ''شمس بری'' نکال کر پہاڑی ادب اور تمدن کے فروغ کے لئے اہم کام کیا۔ شمس الرحمان نے برطانیہ میں پہاڑی زبان کا ٹی وی چینل 'اپنا دیس' شروع کر کے اہم پیش رفت کی۔ اسی دوران ایل۔او۔سی کے اُس پار پہاڑی قلم کاروں نے بھی پہاڑی میں لکھنا شروع کیا اور وہاں کے ایک ریڈیو سٹیشن سے پہاڑی زبان میں پروگرام نشر ہونے لگے۔ اُدھر میر پور کے ایک قلم کار علی عدالت نے جو برطانیہ میں قیام کرتے تھے عالم ادبی سنگت کے زیر سایہ شمس الرحمان سے مل کر ''چٹکا'' رسالہ نکالا جو سرحد کے دونوں جانب مقبول ہوا۔ 2007ء میں علی عدالت برطانیہ سے جموں اور پھر پونچھ راقم الحروف کے پاس آئے اور ایک پہاڑی فلم کے منصوبے پر عمل شروع ہوا۔ فلم کو علی عدالت نے لکھا اور جموں کے ایک پرڈیوسر شیو دت نے اُسے شوٹ کیا جس کے گانے راقم الحروف نے لکھے تھے۔ اس فلم کے ٹائٹل سانگ کا ایک بند ملاحظہ کریں ۔

چھکن گئی ایہ ونڈ لیکر لوکو
ھوئی گیا دو پھاڑ کشمیر لوکو

یہ فلم سرحد کے دونوں جانب اور صوبۂ جموں میں نہایت مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ پہاڑی شاعروں اور ادیبوں کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پہاڑی کے اہم شعراء اور ادباء میں جو نام سرفہرست ہیں اُن میں پرویز مانوس، راجہ نذؔر بونیاری، جہانگیر دانشؔ، شیخ آزاد احمد آزؔاد، علی عدالت، شمس الرحمان، اختر امام رضوی، رفیق بھٹی، اقبال نازشؔ، شیخ ظہور، بشارت حسین بشارت، فاروق انوار مرزا، سید جاوید حقانی، فاروق جرال، شاہ پونچھی، نسیم ہاشمی، نثار راہیؔ، میاں کریم اللہ قریشی، میر حیدر ندیؔم، ڈاکٹر صابر مرزا، محمد مقبول

ساحلؔ، ڈاکٹر لیاقت نیر، محمد عظیم خان، سید امتیاز نسیم ہاشمی، شیخ شبیر احمد، رشید قمرؔ، محمد سرور ریحانؔ، بشارت حسین بشارت، پرویز ملک، گلشر ن سنگھ گلشنؔ، لعل دین مظلومؔ اور شیخ سجاد پونچھی ہیں۔

صوفی ازم اور پہاڑی

صوفیائے کرام کے مطابق صوفی ازم کا مرکزی دائرہ عشق ہے۔ وہ عبادت سے زیادہ عشق پر زور دیتے ہیں یعنی جب انسان ذات پاک سے محبت کرتا ہے تو اُس کے نزدیک چلا جاتا ہے۔ صوفی کے لئے اللہ سے محبت اُس نور کی طرح ہے جو ہر طرف روشنی بکھیرتا ہے۔ ذاتِ پاک کے ہجر میں تڑپنا، اُس کے عشق میں محو رہنا اور اس کی محبت سے فیض حاصل کرنا ہی صوفی کی زندگی ہے۔ ایک عربی دانشور لکھتے ہیں کہ محبت کا سچا روپ دھرم اور مذہب سے اوپر ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ محبت کا مذہب سب مذہبوں سے الگ ہے اور خداوند کے عاشقوں کا خدا کے بغیر کوئی مذہب نہیں ہوتا اور عشق وہ زینہ ہے جس کے ذریعے انسانی ذات کی ذاتِ پاک تک رسائی کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔

صوفی مانتے ہیں کہ کائنات کا وجود عشق کی بنیادوں پر ٹکا ہوا ہے۔ انسان کی ہستی کا مدعا بھی عشق ہے اور یہ چاند، سورج، ستارے عشق کی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ صوفی عشق اور محبت کو ایک طرح کی ریاضت مانتے ہیں۔

صوفی فلسفے کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے:

(Attraction) یعنی انسانی ذات کا محبت کے ذریعے ذات پاک کو اپنی طرف کھینچنا۔

مجذوب (Devotional) اگر دل میں عشق کا چراغ روشن ہے تو خدا بھی اُس کے دل میں گھر کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو سالک کہا جاتا ہے۔

عروج: وہ حالت جہاں عقل کا موثر اثر ہوتا ہے۔

صوبۂ جموں کے پہاڑی سماج میں مندرجہ بالا تینوں اقسام کے صوفی بزرگ ملتے ہیں جنہوں نے عارفانہ کلام کو رواج دیا اور عشق مجازی کی علامتوں کے ذریعے عشقِ حقیقی کی منزلیں طے کیں۔ پہاڑی سماج میں صوفی درویشوں کی زبردست اہمیت رہی ہے جو احترام اور محبت کو فروغ دیتے رہے اور ایک ایسے تمدن کو جنم دیا جو خلوص، رواداری اور میل ملاپ پر قائم ہے۔ یہ اسی تمدن کی دین ہے کہ صوفی درگاہیں جو تقریباً ہر پہاڑی علاقے میں قائم ہیں بلا امتیاز مذہب وملت قابل احترام مانی جاتی ہیں۔

صوبۂ جموں کی پہاڑی صوفی شاعری میں سائیں قادر بخش کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اُن کے کلام میں تصوف، درد، تڑپ، سوز اور ہجر کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ صوفی درگاہوں پر گزارا ہے اور صوفی تمدن کو اپنے اندر اُتارتے رہے۔ اُن کی سی حرفی ملاحظہ کریں ؎

ا۔ ایہجیہ دل نوں چرخ چڑھیا، نہ بہہ سکاں تہ نہ بہِن ہوندا
جس دم بچھوڑے نے جوف دتا، نہ ہس سکاں تہ نہ روِن ہوندا
ایسی انتظاری جس مت ماری، نہ جاگ سکاں تہ نہ سوِن ہوندا
قادر یار تُوں میرا آرام کھڑیا، نہ لیٹ سکاں تہ نہ کھلون ہوندا

(محبوب کی یاد میں میرے دل میں اس قدر اُبال آیا ہے کہ نہ بیٹھتا ہوں نہ بیٹھا جاسکتا ہے۔ جب جدائی تکلیف دینے لگتی ہے تو نہ ہنس سکتا ہوں اور نہ روسکتا ہوں۔ اس انتظار نے میری اس قدر مت ماردی ہے کہ نہ جاگ سکتا ہوں اور نہ سوسکتا ہوں۔ قادر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم نے میرا اس قدر آرام چھین لیا ہے کہ نہ میں لیٹ سکتا ہوں اور نہ کھڑا ہوسکتا ہوں)

سائیں قادر بخش صوفی شعرا میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی ذات کے اور ذات پاک تک رسائی حاصل کرنے کی منزلیں طے کی ہیں اور عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچنے کے راستے کھوجنے میں محور ہے۔ وہ عشق کی اس معراج پر جا پہنچے جہاں محبوب نہ ہوتے ہوئے بھی چاروں طرف جلوہ نما ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں

تصوف، درد، تڑپ اور ہجر کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ ایک سی حرفی کا بند ملاحظہ کریں ۔

د۔ دُکھ اندر پر کھے جان سارے، سنگی سو جو یار غم خوار ہووے
دولت دیکھ دوروں نیڑے آن ڈھکن مشکل دیکھ کیہڑا امدگار ہووے
جوبن حسن جوانی دے کئیں لا گی متر سو جو بڈھڑی وار ہووے
قادر ساتھ کیہڑا ابا ج رب جیہڑا دُکھ سکھ اندر ہنڈن سار ہووے

(دُکھ کے وقت اپنے اور پرائے کی پہچان ہو جاتی ہے اور ساتھی وہی اچھا ہوتا ہے جو غم بانٹ سکے۔ اس طرح تو دولت دیکھ کر بہت سے لوگ قریب آ جاتے ہیں لیکن مشکل کے وقت کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ جوبن، حسن اور جوانی کے کئی شیدائی ملیں گے لیکن دوست وہی ہوتا ہے جو بڑھاپے تک ساتھ نبھائے۔ قادر کہتا ہے کہ ایسا ساتھی اللہ کے بغیر اور کوئی نہیں ہے جو دُکھ سکھ میں ساتھ رہتا ہے۔ اس لئے اپنی لو اللہ سے لگانی چاہئے)

سائیں فقر الدین کا تعلق گجر قبیلے سے تھا لیکن انہوں نے صوفیانہ شاعری پہاڑی اور پنجابی میں کی ہے۔ وہ عشق حقیقی کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

عشق حقیقی گل مجازی پردے پوش تمامی
دانش مند معلوم کریسن جانے کوئی عوامی

(میں عشق حقیقی کو مجاز کی رمزوں کے ذریعے ادا کرتا ہوں جسے یا تو دانش مند سمجھ سکتا ہے یا پھر عوام سے کوئی رمز شناس جان سکتا ہے)

چن زمان آزادی سے قبل ایک مانے ہوئے پہاڑی صوفی شاعر تھے۔ آپ میر پور تھروچی کے رہنے والے تھے۔ انہیں چن نامی لڑکی سے عشق ہوا اور دین و دنیا کی سُدھ بُدھ بھُول گئے۔ پھر مجازی محبوب بھی ایک طرف رہ گیا اور عشق نے ایسا گھیرا ڈالا کہ دنیاداری سے دور ہو گئے اور تصوف کے رنگ میں رنگ گئے۔ اُن کی یہ سی حرفی ملاحظہ کریں ۔

ت۔ ترس نہ آوندا سنجاں نوں تیز نگاہ دے نال کٹ جاندے
کولوں لنگدے رکھ گھمان سوہنے نال نخریاں جگر نوں کٹ جاندے

جی کھس کے نال پیار پہلوں فر دوستی تھیں پیچھے ہٹ جاندے

سینہ چیر زمان دل کڈھ بچوں خالی تڑفدے بُت نوں سٹ جاندے

(میرا محبوب تیز نگاہ سے دیکھتا ہے تو دل کو چیر لگا دیتا ہے۔ قریب سے گزرتا ہے تو ناز نخروں سے جگر کو کاٹ دیتا ہے۔ پہلے دل پیار کر کے چھین لیتا ہے پھر دوستی سے انکار کر دیتا ہے۔ سینے کو چیر کر زمان چن کا دل نکال کر لے گئے اور خالی بُت کو تڑپنے کے لئے چھوڑ گیا)

پہاڑی صوفیانہ کلام کی بات تب تک ادھوری رہے گی جب تک حضرت میاں محمد بخش کی مثنوی سیف الملوک کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ صوفیانہ کلام پہاڑی عوام کی زندگی کے نہایت قریب ہے جس سے پہاڑی تمدنی زندگی کا ہر پہلو واضح ہوتا ہے۔ مثنوی کے کردار جذبہ عشق سے جوش کھا کر دین و دنیا کا ہوش گنوا دیتے ہیں اور اچھی خاصی بادشاہی اور دنیاداری چھوڑ کر گھر بار چھوڑ دیتے ہیں۔ امیری کا جامہ اُتار کر فقیری اپنا لیتے ہیں اور محبت کی اُس معراج تک پہنچ جاتے ہیں جہاں دُکھ میں سُکھ ملتا ہے۔ درد ہی دوا بن جاتا ہے اور سوز شعروں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ کریں کچھ اشعار ۔

کچّے پھانڈے نیوں لگانا تیری کیا دانائی

نیوں لا اُس کاری گر نال جس ایہہ شکل بنائی

(مجاز کی صورت کے ساتھ دل لگانا دانائی نہیں ہوتی۔ دِل تو اُس کاریگر کے ساتھ لگانا چاہیئے جس نے یہ صورت بنائی ہے۔)

سادگی اور ٹھیٹھ پہاڑی الفاظ کا سلیقے کے ساتھ برتاؤ اُن کے کلام کی خاصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام دیہات میں رہنے والے سیدھے سادھے اَن پڑھ پہاڑی عوام میں اتنا ہی مقبول ہے جتنا پڑھے لکھے لوگوں میں ہے۔ مثنوی سیف الملوک کے کچھ شعر ملاحظہ کریں ۔

جس دل دیکھو قید غماں دی کس خلاصی پائی

کرے خلاص محمد بخشا رحمت پاک خدائی

(جس طرف نظر اُٹھاؤ لوگ غموں کی قید میں ہیں جس سے کوئی رہائی نہیں ملتی۔اس قید سے صرف وہی نجات پاسکتا ہے جس پر خدا کی رحمت ہوتی ہے)

کامل عشق خدایا بخشیں غیر ولوں مُکھ موڑاں

ہکو تکاں ہکو جانا ہکو آکھاں لوڑاں

(اے اللہ! مجھے ایسا عشق عطا کر کہ میں غیر سے منہ موڑلوں اور تم ہی کو دیکھوں۔تم کو ہی جانوں، تمہارا ہی ذکر کروں اور تمہیں ہی تلاش کروں)

دانشمنداں دا کم ناہیں دنیا تے چِت لانا

اس بُوہٹی لکھ خاوند کیتے جو کیتا سو کھانا

(دانشمندوں کا کام دنیا سے دل لگانا نہیں کیونکہ یہ دُنیا ایک ایسی دُلہن ہے جس نے کئی خاوند بنالئے اور ہر خاوند کو کھا گئی)

ہر بیتے وچ رمز فقری جے تدھ سمجھ اندر دی

گل سُنا محمد بخشا عاشق تہ دلبر دی

(میں نے اپنے ہر شعر میں فقیری کی رمز میں عشقِ حقیقی کی بات کی ہے اور اس کو بیان کرنے کے لئے عاشق اور دلبر کو رمز بنایا ہے۔اس بات کو اگر تو سمجھ سکتا ہے تو سمجھ)

شہوت باز مجاز حرص دے ناز نیاز تہ جانن

راز گواون باز نہ آون ہتھوں باز و نجاون

(عشقِ مجازی میں شہوت باز فقط ناز ونخرے ہی جانتے ہیں اور اُسی پر وقت ضائع کر دیتے ہیں اور جو راز ہے اُسے بھول جاتے ہیں۔وہ اس سب سے باز نہیں آتے اور اپنے ہاتھ میں آئے ہوئے باز کو بھی ضائع کر دیتے ہیں)

اُس دا نور ہرہر تھائیں اوہ مالک ہرہر دا

رَب دا نام چِتارن والا کِسے میدان نہ ہردا

(ذاتِ الٰہی ایک ایسی طاقت ہے جو ہر چیز کی مالک ومختار ہے۔اُس کے نام کا وِرد کرنے والا

کسی بھی میدان میں ہارتا نہیں بلکہ فتح یاب ہوتا ہے)

پہاڑی لوک ادب

دوسری زبانوں کے لوک ادب کی طرح پہاڑی لوک ادب کو بھی دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔یعنی لوک کہانیاں اور لوک گیت۔لوک کہانیوں میں زندگی کی گہری چھاپ رمزوں کی صورت میں واقع ہوتی ہے۔لوک کہانیوں کا عوام کی زندگی اور تمدن کے ساتھ گہرا رشتہ ہے اور کئی ایسے موضوع ملتے ہیں جن سے عوامی زندگی آشکارہ ہوتی ہے۔کہیں سبق آموز قصے کہانیاں ہیں، کہیں فطرت کی آسودگی ہے، کہیں راجہ رانیوں کی حکایتیں ہیں، جنوں بھوتوں کا ذکر ہے تو کہیں غریبوں اور دبے کُچلے لوگوں کی اچھی زندگی گزارنے کی اُمنگ ملتی ہے۔کئی کہانیوں میں عورت کی بے بسی اور اس کے اندر زندگی کے فیصلے خود کرنے کی خواہش ملتی ہے۔انسان پر انسان کی زبردستی،محل اور جھونپڑی کی لڑائی، تقدیر اور تدبیر کے فیصلے، دُکھ اور سکھ کو بڑے میٹھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

پہاڑی کہانیوں میں بھمبر، کوٹلی، میر پور میں مشہور کہانیاں پیر بڑا کہ یقین، کھباکن، لالچ پھھری دنیا، کچی یاری، مہاڑے کولوں پچھ، پھلاں دی بارش، متکبر،مکو وی شک آسا،نخرا کھوتی دا،مٹی دیاں ڈھیریاں،سونے چاندی والا، بدھوشاہ، لال بادشاہ،لکڑ ہارا شامل ہیں۔اسی طرح پونچھ، اوڑی، راجوری، کرناہ علاقہ میں ڈاب نیلی،نصیب دوستی، دانش مند،صندل بڈھی، بے کار،منحوس،پھپھا کٹن ، ماترے حق دار، پونڈی راجہ، بدلہ وغیرہ بڑی مشہور پہاڑی کہانیاں ہیں جن سے پہاڑیوں کے تمدن کے خدوخال بھی سامنے آتے ہیں۔پہاڑی زبان کی شاہکار کہانی ''ڈاب نیلی'' ملاحظہ کریں جس سے آزاد زندگی کے لئے انسانی تڑپ ملتی ہے۔

شکار کی تلاش میں راجہ گھوڑے پر سوار آگے بڑھ رہا تھا اور لگام کھینچ کر گھوڑا دوڑا رہا

تھا جبکہ راجہ کے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔ تبھی راجہ کو پیاس لگی اور وہ پانی ڈھونڈنے نکلا۔ اُسے ایک تالاب نظر آیا۔ راجہ نے گھوڑے کو اُس طرف موڑا۔ جب وہ تالاب کے نزدیک پہنچا تو اسے ایک خوبصورت پہاڑی لڑکی ڈاب (تالاب) میں غسل کرتی دکھائی دی۔ وہ اس خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے لگا کہ جیسے آسمان سے کوئی حور اُتر آئی ہو۔ لڑکی خوشی اور ہنسی کے عالم میں غسل میں مشغول تھی اور راجہ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر فدا ہو رہا تھا۔ پھر لڑکی باہر نکلی اور ہنستی، مسکراتی مٹکتی ہوئی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ خوبصورت خدوخال کے علاوہ لڑکی کے ناز وادا راجہ کو اتنے بھائے کہ اُس نے گاؤں میں ڈیرہ ڈالا اور پھر لڑکی کو بیاہ کر محل میں لے گیا۔ جہاں ہر کوئی اس پر نظر رکھتا تھا لیکن باہر نکلنے نہیں دیتے تھے۔ محل میں اکیلا پن اُسے ڈسنے لگا۔ اُس نے روٹی پانی چھوڑ دیا، ناز ونخرے چھوڑ دیئے۔ اس کی ہنسی اور والہانہ پن غائب ہو گیا اور روز بروز اس کا حُسن مرجھانے لگا۔ راجہ نے اس کا دل بہلانے کی کوششیں کیں لیکن وہ تو روحانی بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی اور محل کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے روز بروز رانی کی حالت بگڑنے لگی۔ آخر حکیموں نے راجہ کو بتایا کہ اُسے محل کی بند زندگی پسند نہیں۔ یہ آزاد زندگی جینا چاہتی ہے۔ اس لئے اسے وہیں چھوڑ دینا چاہئے جہاں سے لایا گیا تھا۔ چنانچہ راجہ نے رانی کو ساتھ لیا اور اسی جگہ لے جا کر آزاد کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی ڈاب میں اتر گئی اور تیرنے لگی اور اس کی خوشی واپس لوٹ آئی اور کہنے لگی محلوں سے گاؤں کی آزاد زندگی ہزار درجہ بہتر ہے۔ جنگل کے پرندے بھی پنجرے میں خوش نہیں رہ سکتے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئیے۔ بس یہ آزاد زندگی میرے لئے نایاب تحفہ ہے۔

لوک ادب کی دوسری صورت لوک شاعری یا لوک گیت ہیں جو پہاڑی لوگوں کی تمدنی اور عوامی زندگی کی پہچان مانے جاتے ہیں۔ پہاڑی میں لوک گیتوں کا اہم سرمایہ موجود ہے۔ ان گیتوں میں بلا امتیاز مذہب وملت، ذات وفرقہ، رنگ ونسل لوگوں کی تمدنی تصویر سامنے آتی ہے۔ لوک رنگ اصل میں انسانی جذبات کے اظہار کا وسیلہ مانا جاتا ہے۔ کبھی وہ محبت کا گیت بن کر اُبھرتا ہے۔ کبھی جدائی کے رنگ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی جنگوں

میں فتوحات دکھانے والے پہاڑیوں کی تلوار بن کر سامنے آتا ہے۔ کہیں فطرت کی منظر کشی ملتی ہے تو کہیں موسموں، شادی بیاہ اور میلوں ٹھیلوں سے جڑے گیت بن کر دل جوئی کرتا ہے۔ پہاڑی لوک گیت صوبہ جموں میں کنٹرول لائن کے دونوں طرف عوام کی سماجی، ثقافتی اور تمدنی میراث کی علامت مانے جاتے ہیں۔ آیئے مختلف لوک گیتوں کے پس منظر کے بارے میں بات کریں۔

چن

چن محبوب کی پذیرائی میں گایا جانے والا گیت ہے۔ یہ گیت صوبہ جموں کے علاقہ پونچھ، راجوری، میر پور، کوٹلی، بھمبر، بُدھل، سدھنتی، راولاکوٹ اور باغ تک عوام کے دلوں کی آواز مانا جاتا ہے، جس میں نوجوان محبوب اور عاشق اپنے دلوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ چن گیت کے کچھ بول اس طرح ہیں:

چن مہاڑا چڑھیا تہ اُپر راجوریہ
بنی جایاں پکھنوں تہ ملی جایاں چوریہ

(میرا چاند وادئ راجوری میں طلوع ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ پرندہ بن جائے اور چُھپ کر مجھ سے آن ملے)

چن مہاڑا چڑھیا تہ جائی لگا پلندری
چٹے چٹے کپڑے تہ داغ سینے اندریں

(میرا چاند پلندری کے پہاڑوں سے طلوع ہوا ہے۔ اُس نے سفید کپڑے زیب تن کئے ہوئے ہیں لیکن سینے کے اندر جدائی کا داغ ہے)

چن مہاڑا چڑھیا تہ کوٹلی نی ڈھری
اِک مک ہوئی گئی جند تری میری

(میرا چاند کوٹلی کے اونچے ٹیلے پر سامنے آیا ہے جسے دیکھ کر میری اور اُس کی زندگی ایک ہوگئی)

قینچی

یہ گیت محبوب کی یاد میں گایا جاتا ہے اور صوبۂ جموں کے پہاڑی خطے میں مقبول ہے۔ یہ گیت درشی کے جنگلوں میں ایک ٹھیکیدار کے منشی اور مقامی لڑکی تانیاں کی محبت پر مبنی ہے۔ منشی کو تانیاں کے عاشق قتل کر دیتے ہیں۔ تانیاں پاگل ہو جاتی ہے اور جنگل جنگل گھوم کر اُسے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اس گیت کے کچھ بند اس طرح ہیں ؎

اچیا درختا تُوڑا سوہنا جیاء گھیرا
جتھے مہاڑے منشی نے آنی لایا ڈیرا
درشی نے بناں وچ کپنی آں دستے
گیا مہاڑا منشی تہ بھلی گئے رستے
درشی نے بناں وچ پھلی کاچ ماچ اوے
کپی گئے منشی کی روئے نِکی باچ اوے

(اونچے اور گھنیرے درخت کے نیچے میرے منشی نے آ کر ڈیرہ لگا دیا ہے۔ میں درشی کے جنگل میں لکڑی کے دستے کاٹ رہی ہوں۔ جب سے میرا منشی گیا ہے مجھے راستے بھول گئے ہیں۔ درشی کے جنگل میں رنگ برنگی کاچ ماچ پھول رہی ہے لیکن انہوں نے میرے منشی کو قتل کر دیا ہے جس کی یاد میں خاندان کے چھوٹے بڑے سب رو رہے ہیں)

جیندا

جیندا محبت کی ایک لافانی داستان ہے۔ جیندا امیر پور کا تھوری (سامان بیچنے ولا) تھا جو بیوپار کے سلسلے میں گبرا کرناہ آیا۔ یہاں اس کی ملاقات گکھڑ زادی ناہید سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن یہ بات جیندے کے ماما کو منظور نہ تھی کیونکہ وہ اپنی بیٹی کا بیاہ جیندے کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اُدھر گھر والوں نے ناہید کا بیاہ اپنے

خاندان میں کر دیا۔مگر ناہید اور جیندے نے مل کر ناہید کے گھر والے کو قتل کر دیا۔ دونوں پکڑے گئے اور اُنہیں چنار کے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ اُن کی محبت کی داستان پر میراثیوں نے بار (Ballad) جیندا بنائی اور گاؤں گاؤں سُنانے لگے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ پیش ہیں جیندا گیت کے کچھ اشعار۔

جیندا

جیندا اجی میر پورنا ٹھُوری

ہتھ نا ساز بجانا جوڑی۔۔۔جیندے کو نہ مارو

(جیندا میر پور کا تاجر ہے اور ہاتھ کا ساز جوڑی بجاتا ہے۔اسے مت مارو)

جیندا اجی مانوے دے کھر منگیا

مانویں سبزی جوڑا رنگیا۔۔۔ جیندے کو نہ مارو

(جیندے کی شادی ماما کی لڑکی کے ساتھ طے ہوئی ہے اور مامی نے شادی کے لئے سبز کپڑوں کا جوڑا رنگ لیا ہے۔جیندے کو نہ ماریں)

جیندا اجی ناہید نے سنگ لائی

ڈہڈی پریت سجن سنگ پائی ۔۔۔جیندے کو نہ مارو

(لیکن جیندا تو ناہید کی محبت میں گرفتار ہے اور اُس کے ساتھ پریت لگا چکا ہے۔اس لئے جیندے کو نہ مارو)

جیندا اجی کلئیہ لکھوئی ہوئی کُکڑی

تھاندار بلاندا ڈُیری۔۔۔ جیندے کو نہ مارو

(جیندے کے لئے کل سے مُرغی حلال کر کے رکھی ہوئی ہے۔لیکن اُسے تھاندار ڈُیری یعنے قلعے پر بلا کر لے گیا ہے۔۔۔جیندے کو نہ مارو)

جیندا اجی کلئیہ نے پکے ہووئے چاول

پہیڑی موت کریندی۔۔۔ جیندے کو نہ مارو

(جیندا کے لئے کل سے چاول پکا کر رکھے ہوئے ہیں لیکن وہ لوٹا نہیں۔شاید اُس کی موت جلدی ہونے والی ہے۔جیندے کو نہ مارو)

بجی ہٹیاں بکدا لون

سکے مانویں کیتا خون۔۔۔جیندے کو نہ مارو

(جیندا جی آپ کا بیچا ہوا نمک دکانوں پر بِک رہا ہے لیکن مامے نے جنیدے کا خون کروا دیا۔اُسے مت مارو)

دھوبن

دھوبن علاقہ پونچھ کا ایک خوبصورت گیت ہے جس میں کوئی راجہ دھوبن کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور شادی کر کے محل میں لے آتا ہے لیکن راجہ کی پہلی رانیاں خوبصورت دھوبن کو مار دیتی ہیں اور راجہ تڑپتا رہ جاتا ہے۔

ٹہا کیوں ٹُھلی ایہہ دھوبن وے۔ راجے نظر گھُمائی

شڑکیں پی ایہہ دھوبن وے۔ راجے باہاں پھڑیلی

بنی نہ پکڑیاں راجیہ وے میں جات جولاہی

جات نوں اساں کہہ کرنا۔ اساں صورت تک لیی

حکم کیتا راجے نوکراں کی ڈولا محلاں لے آؤ

اندروں بولیاں رانیاں او دھوبن دریا روہڑ آؤ

(دھوبن پہاڑ سے اُتر رہی تھی کہ راجے نے اُسے دیکھ لیا۔ جب وہ سڑک کے قریب پہنچی تو راجہ نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ دھوبن نے کہا میں ذات کی جولانی ہوں میرا بازو نہ پکڑو۔ راجہ نے جواب دیا مجھے ذات سے کیا لینا میں نے تیری صورت دیکھی ہے۔ اس لئے تجھ سے

شادی کروں گا۔ پھر راجہ نے نوکروں سے کہا کہ اس کی ڈولی محل میں لے آئیں لیکن اندر سے رانیوں نے کہا کہ ہم اسے اندر نہیں آنے دیں گی۔ اس کو دریا میں ڈبو کے آؤ)

مانگا

مانگا پہاڑی لوگوں کا ایک خوبصورت ناچ ہے۔ اگرچہ لٹھ بازی، شمشیر بازی، تمہال، لکڑی، تاڑی اور گتکہ جیسے کرتب اور ناچ بھی رائج ہیں لیکن مانگے ناچ کو پہاڑی زندگی میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ کلائی کے ساتھ رنگ برنگے رومال باندھ کر ہاتھوں اور پاؤں کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر یہ ناچ ہوتا ہے جسے دیکھنے والے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ علاقہ جموں میں آزادی سے پہلے پونچھ، باغ، سدھنتی، کوٹلی اور میر پور میں مانگا ناچ ناچا جاتا تھا۔ آج کل سرن کوٹ اور مینڈھر کے علاقوں میں نوجوان میلوں، تہواروں اور فصلوں کی کٹائی کے بعد مانگا ناچتے ہیں اور اُس وقت یہ گیت گایا جاتا ہے ؎

توں پہاڑی جیوین دار پہائی
توں لوکاں وچ سردار پہائی
بڈاں نے بچ ہل مار پہائی
توہڑے پھرن کوٹھار پہائی
توں رج کے ماہنگہ مار پہائی

(پہاڑی، تو زمیندار ہے اور عوام میں تیرا رتبہ سردار کا ہے۔ تو محنت کر کے فصلیں اُگا لے ترے غلہ کے کوٹھار بھر جائیں گے۔ پھر تو جی بھر کے ماہنگہ ناچ ناچنا)

ٹپے اور ماہیا

ٹپے اگرچہ پنجابی میں مقبول ہیں لیکن پہاڑی میں ٹپے اور ماہیا اپنا منفرد مقام

رکھتے ہیں۔ایک طرف ٹپے اور ماہیا میں ٹھیٹھ پہاڑی زبان استعمال ہوتی ہے اور پھر پہاڑی پس منظر، رہن سہن اور زندگی میں محبت کی وارداتیں ان ٹپوں میں بولتی ہیں۔پیش ہے ایک ٹپا ؎

پیر پنچالی چوٹیاں
تیری نیتاں ہے سن کھوٹیاں
اساں روئی روئی رات پوٹیاں
توں موڑ مہاراں یارجی
میں راہ نہاراں یارجی

(یہ پیر پنچال کی چوٹیاں ہیں اور محبت کا موسم ہے مگر تم نیت کے کھوٹے نکلے اور تمہارے بغیر ہم نے رورو کر راتوں کو گزارا ہے۔اس لئے تو واپس آجا۔میں آج بھی تیری راہ دیکھ رہی ہوں)

ماہیا

رتی لال پچھیری ہے
باج ترے سجنا
ہر پاسے ہنیری ہے

(میری چھوٹی گھوڑی کا رنگ لال ہے۔لیکن تیرے بغیر میری زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے)

پہاڑی لوگوں کی اکثریت کھیتی باڑی کرتی ہے۔اس لئے بہت سے لوک گیت ایسے ہیں جو زمین داری کے مختلف مرحلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔چاہے وہ مکئی کی گڈائی ہو، گھاس کاٹنے کا موقع ہو، شالی کے پودے لگانے (لیب) کا وقت ہو ان کاموں کو لوگ گیت گاتے ہوئے کرتے ہیں۔جیسے مکئی کی گوڈی کے موقع پر یہ گیت گاتے ہیں جسے ''بولی'' کہا جاتا ہے ؎

مکاں جمیاں اللہ جی

لمیاں لمیاں اللہ جی
ھن کہ کمیاں اللہ جی

(اب تو مکئی کی فصلیں اُگ آئی ہیں۔اللہ جی۔ یہ فصل روز بروز لمبی ہوتی جارہی ہے اللہ جی۔ اب کسی چیز کی کمی نہ رہے گی اللہ جی)

صوبۂ جموں میں سکونت کرنے والے پہاڑی لوگ شادی بیاہ کو دھوم دھام سے کرتے ہیں، جس میں ضیافت کے علاوہ گیت گانا، ناچ، ڈھول باجے اور شہنائی سبھی کچھ مِل کر بیاہ والے گھر میں خوشیاں اور رونقیں لگا دیتے ہیں۔ یہ گیت پہاڑی ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مشترکہ میراث اور تمدنی شناخت مانی جاتی ہے۔ یہ گیت شادی بیاہ کی مختلف رسوم کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ان گیتوں کا آغاز مہندی گیت سے ہوتا ہے۔

تری مہندی نا رنگ پیلہ
ترا کاج سنوار یہ قبیلہ
سوہنی میندی نا رنگ پیلہ

(تیری مہندی کا رنگ پیلا ہے اور قبیلے میں سب نے مہندی لگائی ہوئی ہے کیونکہ سب مل کر تیرے بیاہ کی خوشیوں میں شریک ہورہے ہیں)

مہندی کے بعد بیاہ کی تیاریاں ہوتی ہیں اور مختلف رسمیں ادا کی جاتی ہیں، جیسے دولہے کو غسل کرانا، گانا باندھنا، سرمہ لگانا، دانتن کرانا، بارات چڑھانا اور ڈولی لے کر آنا۔ مسلمان خاندانوں میں ان رسموں کے لئے یہ گیت ہے۔

گانا بنیاں نہ چھکیاں مہاڑے سونیاں بناں
سوہنے ڈوہلے نور چمکے مہاڑے سونیا بناں
سکڑ ملنیاں نہ چھکیاں مہاڑے سونیاں بناں
سوہنے ھوٹھاں نور چمکے مہاڑے سونیاں بناں
سُرمہ لانیاں نہ چھکیاں مہاڑے سونیاں بناں

سوہنے ڈھلے نور چمکے مہاڑے سونیاں بناں
سیرا ابنیاں نہ چھکیاں مہاڑے سونیاں بناں
سوہنے متھے نور چمکے مہاڑے سونیا ں بناں
ڈولی آننیاں نہ چھکیاں مہاڑے سونیاں بناں
سوہنی ڈولی نور چمکے مہاڑے سونیاں بناں

(تم گانا باندھتے ہوئے نہ شرمانا میرے خوبصورت دولہے۔تمہارے بازؤں پرتو نور چمک رہا ہے۔داتن سے ہونٹ رنگتے ہوئے نہ شرمانا کیونکہ تیرے ہونٹوں پرنور چمک رہا ہے۔ سرمہ لگاتے وقت مت شرمانا۔کیونکہ تیری آنکھوں میں نور چمک رہا ہے۔سہرا باندھتے ہوئے مت شرمانا۔ تیرے ماتھے پہ تو نور چمک رہا ہے۔تو روٹی لاتے وقت مت شرمانا میرے خوبصورت دولہا کیونکہ تمہاری خوبصورت ڈولی دلہن کے نور سے دھمک رہی ہے)

سیٹھاں

سیٹھاں ہنسی مذاق کے گیت ہوتے ہیں جن میں دولہا اور دلہن کی جانب سے عورتیں ایک دوسرے سے گیتوں کی صورت میں ہنسی مذاق کرتی ہیں جیسے ؎

چارے کوٹھریاں اک دانہ
معراجیہ نے پیونا کوٹ پرانا

(دولہے کے گھر چار کمرے تو ہیں مگر کھانے کوصرف ایک دانہ ہے۔دیکھو دولہے کے باپ نے پرانا کوٹ پہنا ہوا ہے)

چھند بھی سیٹھوں کا ہی روپ ہوتے ہیں جو ہندو عورتیں دولہے کی آمد پر گاتی ہیں، جیسے:

چھند پانواں چھندوے جھندیہ اگے اُن
منڈے نے ماپیولڑن لگے دوّے کوٹھے تھِوں بھُن

(میں چھند ڈال رہی ہوں تو پتہ چلا کہ لڑکے کے ماں باپ لڑنے لگے اور لڑتے لڑتے چھت

سے نیچے آ گرے)

بیاہ کی رسموں میں آخری پڑاؤ ڈولی کا آتا ہے۔اس موقعے پر ڈولی گیت گایا جاتا ہے، جس میں دلہن روتے ہوئے اپنے باپ سے التجا کرتی ہے کہ اُسے کچھ دن اور روک لیا جائے ؎

ڈولی مہاڑی رنگ رنگیگی
اُپر بیٹھا مور
اج نہ میکی ٹور بابُل
ڈک لیہ دو دن ہور بابُل

(میری ڈولی رنگ برنگی ہے جس کے اوپر مور بیٹھا ہوا ہے لیکن بابل (باپ) میری التجا ہے کہ آج مجھے الوداع مت کرنا۔اپنے گھر میں دو دن اور رکھ لینا)

کونجڑی

کونجڑی محبت کے جذبوں سے سرشار گیت ہے جس میں محبوب اپنے عاشق سے عشق کا اظہار کرتا ہے۔ملاحظہ ہو یہ گیت ؎

اُڈ بالو کونجڑ یئے رہ پُچھ لیہ توں راہیاں توں
موت پیاری ہے سہانوں تیریاں جدایاں توں

(اے کونج تو اُڑ کر اور راہیوں سے پتہ پوچھ کر میرے ساتھی تک پہنچ اور پیغام دے کہ اُس کی جدائی سے تو مجھے موت پیاری ہے)

اُڑ پہلا کونجڑ یئے حقہ چھک لیہ توں ڈم لا کے
جیہڑا مہاڑے دل بسّیا ٹُری چلیا ہے غم لا کے

(کونجڑی اب تو چین سے حقے پر کش مار۔کیونکہ جو میرے دل میں بسا تھا وہ تو غم دے کر

چل پڑا ہے)

اُڑ بالو کونجڑیئے ، اَساں زخم وی کھائے ہوئے نے
تساں کولوں بٹن چنگے جھیڑے سینے نال لائیے ہوے نے

(کونجڑی ہم نے محبت میں بہت زخم کھائے ہیں۔ میرے محبوب تم سے تو بہتر میری قمیض کے بٹن اچھے ہیں جو میرے سینے کے ساتھ لگے ہوئے ہیں)

چٹے چنے نی چانی

یہ گیت صوبۂ جموں کے پورے پہاڑی خطے میں مقبول ہے جسے میراثی ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی دُھن پر گاؤں گاؤں گایا کرتے تھے۔ یہ جہاں محبت کے جذبوں سے لبریز ہے وہیں ہمارے تمدن کا عکاس بھی ہے۔ صدیوں سے گایا جانے والا یہ گیت آج بھی دلوں کو چھو لیتا ہے۔ پیش ہیں دو شعر ۔

چٹے چنے نی چانی سرگی نیا تاریا لوچا دے
مہاڑا چھلہ گمائیی اوہ چا دے

(چاند کی ملگجی چاندنی اور سحر کے تارے مجھے مل کر روشنی دو۔ کیونکہ میرا چھلہ محبوب سے وصل کے وقت گر گیا ہے میں اسے ڈھونڈ سکوں)

چٹے چنے کی چانی سرگی نیا تاریالوئی آ لا
مہاڑہ ماہیا پھل خوشبوئی آلا

(چاند کی سفید چاندنی کے ساتھ سحر کا چمکنے والا تارہ بھی روشن ہو چکا ہے۔ لیکن میرا محبوب تو خوشبودار پھول کی طرح ہے جو اپنی مہک بکھیر رہا ہے)

چٹے چنے نی چانی مہاڑی پہاوی نیا منڈیا چپ دانے
جھیڑی مہاڑے نال کیتی ہیئی رب جانے

(چاند کی سفید چاندنی میں میری بھابی کا لڑکا دانے چبار ہا ہے لیکن اُس نے جو میرے ساتھ کیا ہے وہ خدا ہی جانتا ہے)

چٹے چنے نی چانی دیڈی نیاں سنگلاں کُس لائیاں

ماہی ستا رہیا میں کھیڈ آئی آں

(چاند کی سفید چاندنی میں ڈیوڑھی کا دروازہ کسی نے کھول دیا جہاں میرا ماہی سو رہا تھا۔ میں چپکے سے گئی اور محبت کر کے لوٹ آئی)

بولیاں

یہ محنت کشوں کے گیت ہیں جو کام کرتے ہوئے گائے جاتے ہیں۔ جیسے مکئی کی گُڑائی کرنی ہو، شالی کے پودے لگانے ہوں یا جنگل سے شہتیر لانا ہو تو محنت کشوں کو جوش دلانے کے لئے بولی گیت گائے جاتے ہیں جس میں ایک شخص شعر پڑھتا ہے تو باقی اللہ جی کہہ کر جواب دیتے ہیں۔ جیسے شہتیر لاتے وقت یہ بولی گیت گایا جاتا ہے۔

اللہ بیلی، اللہ جی

چھکو گیلی، اللہ جی

ہکو ھیلی، اللہ جی

(سب کا محافظ اللہ ہے۔ اُس کا نام لے کر شہتیر کھینچو اور ایک ہی بار کھینچو۔)

زور لگا کے، اللہ جی

جان لڑا کے، اللہ جی

ہاتھ بڑھا کے، اللہ جی

(اللہ کا نام لے کر زور لگاؤ۔ پوری طاقت لگا دو اور ہاتھ بڑھا کر شہتیر کو کھینچو)

شیر جواناں، اللہ جی

اومستانہ، اللہ جی

زور لگانا، اللہ جی

(تُو تو شیر جواں ہے اور جوانی کے نشے میں مست ہے۔ اس لئے اللہ کا نام لے کر زور لگا اور شہتیر کو آگے بڑھا)

مندرجہ بالا گیتوں کے علاوہ لکُو، کنگھی، گہنہ، جوگی، سپاہی، گھڑا، گھوڑی، نور بیگم، جیسے بے شمار پہاڑی لوک گیت ہیں جن میں پہاڑی لوگوں کے تمدن کی جھلک ملتی ہے۔

باریں:

باریں تاریخی واقعات سے جڑے ہوئے گیت ہیں۔ تاریخی لحاظ سے صوبۂ جموں کے پہاڑی لوگوں کے خطے کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ حملہ آوروں نے کشمیر فتح کرنے کے لئے سب سے پہلے اسی خطے کو روندا اور پھر درہ پیر اور توسہ میدان جیسے راستوں سے وادی پر حملہ آور ہوئے۔ اکثر ان علاقوں میں پہاڑی راجاؤں اور سلطانوں کی حکومتیں رہی ہیں۔ سرداروں میں راجوری کے راجہ اگر خان اور پونچھ کے شمس خان اہم تھے جنہوں نے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور پھر مہاراجہ گلاب سنگھ کے خلاف تلوار اُٹھائی اور مرتے دم تک لڑتے رہے۔

1837ء میں پونچھ میں مقامی سردار شمس خان نے زبردست بغاوت کی اور خود راجہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حُکم پر جموں کا راجہ گلاب سنگھ ایک بھاری فوجی لشکر لے کر پونچھ آیا اور سارے علاقے کو روند ڈالا۔ شمس خان کے 12/ ساتھیوں کی زندہ کھالیں بھی کھنچوائیں تا کہ علاقے میں دہشت پھیلے اور کسی طرح شمس خان پکڑا جائے مگر اس کا کوئی سراغ نہ مِلا۔ اُس وقت مہاراجہ نے شمس خان کے سر پر بڑا انعام رکھا اور علاقے میں اعلان کروایا کہ شمس خان کو زندہ یا مُردہ میرے روبرو پیش کیا جائے۔ تب مخبروں نے خبر دی کہ شمس خان سدھرون کے راجہ شیر باز خان کی پناہ میں ہے۔

راجہ گلاب سنگھ نے اُسے دھمکایا کہ شمس خان کواس کے حوالے کرے ورنہ اُس کی جاگیر تہس نہس کر دی جائے گی۔ان حالات میں شیر باز خان نے شمس خان اوراس کے بھتیجے راج ولی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ شام کے وقت پونچھ شہر کے قریب گاؤں دیگوار تیڑاوں میں آ گیا۔ جہاں محمد خان تیڑواں نے اُسے گھر میں پناہ دی۔تبھی شمس خان کی ٹوہ میں نکلے اگر خان اور دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے اور سازش کر کے شمس خان کے ہتھیار لے لئے اور اُسے روٹی میں زہر ملا کر کھلا دیا۔تب شمس خان اور ان کے بھتیجے راج ولی کو پتہ چلا کہ اُن کو مارنے کی تیاری ہو چکی ہے۔وہ باہر کی طرف نکلنے لگے مگر تب تک زہر اثر کر چکا تھا اور محمد خان تیڑواں اور اگر خان اور اس کے ساتھیوں نے راجہ شمس خان اور راج ولی کو قابو کر لیا اور تلواروں سے ان کی گردنیں کاٹ دیں۔پھر انہوں نے راجہ شمس خان اور راج ولی کے سروں کو نیزوں پر آویزاں کر کے جلوس کی شکل میں راجہ گلاب سنگھ کے روبرو لایا۔اس کے جسم کا ایک حصہ دیگوار میں دفن ہے جہاں میموریل بنایا گیا ہے۔راجہ شمس خان کی بار علاقہ جموں کے پہاڑی خطہ میں بہت مقبول ہے۔پیش ہے اس بار کا ایک بند۔

سچّا رب سوُرو جس نے دنیا بنائی ہے
بڑاوے راجہ رستم جس نے پونچھ بسائی ہے
اُس تھیں پچھ جمیا رستم خاں وے شپائی ہے
فرشمس خانے دتی سی بھاجڑ مچائی ہے
باراں قلعے جتّے اُس نے اگ سی بھڑکائی ہے
لٹیا اُس پنجڑہ نے سر ساویہ دھمک پائی ہے
اُس پنج سو بندوقاں سنگ فوج سی بنائی ہے
پھر کن تریاں مچھاں داڑھی رونق سی بدائی ہے

(سچے رب کو یاد کرو جس نے یہ دنیا بنائی ہے،جس نے راجہ رستم خان کو اقبال دیا،جس نے پونچھ کو بسایا ہے۔راجہ رستم خان کے بعد شمس خان پیدا ہوا جس نے بڑا ہو کر بغاوت کی اور

تمام علاقے میں کھلبلی مچا دی۔ شمس خان نے دیکھتے ہی دیکھتے بارہ قلعے جیت لئے۔ پنجبڑہ کو لوٹ لیا اور سرساوبیہ علاقے تک جا پہنچا۔ پھر اُس نے پانچ سو بندوقوں کے ساتھ اپنی فوج تیار کر لی۔ اُس وقت شمس خان کے چہرے پر مونچھیں اور داڑھی رونق بڑھا رہی تھی)

شمس خان کو قابو کرنے کے لئے راجہ گلاب سنگھ کے پونچھ آنے کے بارے میں یوں ذکر ہے:

سُنیاوے مہاراجہ خفگی بُہتی ساری آئی ہے
چڑھیا فِر مہاراج کم گئی پبھادشاہی ہے
اگہ بجن ترے باجے پچھے دھمک پیندی آئی ہے
فِرمنگ دے میدان اندر چھیڑی پیئی لڑائی ہے
ھن گڑکن وے بندوقاں پیندی سدھنا دی توائی ہے
شمس ماردا تلوار پنمبے دیندا سا اُڈئی ہے
پر مہاراج دی فوجیہ اگہ وس نہ چلدا کائی ہے
فرملی تہ سبز علی راجے پکڑ لیا جائی ہے
فرملی تہ سبز علی دی کھل وی لوائی ہے
فِر پُجیا شمس خان بچ سدھرونیہ اندر آئی ہے

(جب مہاراجہ کو پتہ چلا تو اسے بہت غصہ آیا۔ پھر مہاراجہ (یہاں مہاراجہ گلاب سنگھ کے لئے استعمال ہوا ہے) اتنی فوج لے کر حملہ آور ہوا کہ ساری بادشاہی کانپنے لگی۔ اُس کے آگے باجے بج رہے تھے اور پیچھے فوج مارچ کرتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ پھر جنگ کے میدان میں لڑائی شروع ہوگئی۔ بندوقیں چلنے لگیں اور سدھنوں میں شور مچ گیا۔ شمس خان تلوار کے ساتھ جی جان لڑ رہا تھا لیکن مہاراج کی فوج کے آگے اُس کی کوئی پیش نہ تھی۔ پھر شمس خان کے ساتھی سبز علی کو فوج نے پکڑ لیا اور اُن کی زندہ کھالیں اُتروائی گئیں۔ ان حالات میں شمس خان جنگ کے محاذ سے نکل کر سدھرون میں آ گیا)

پھر چغل خوراں راجے کی خبر دتی جائی ہے
اُٹھیا شمس خان لیی ایہہ نام خدائی ہے
پیڑی نیلی کھوڑی ایہہ دیگوار سا جائی ہے
اُتھے محمد خان تیڑویں دتا ٹھشا توغی لائی ہے
چھنگے اُس قران نالے کہر لے بلائی ہے
ہتھوں لئے ہتھیار اندر چھوڑے سن چھپائی ہے
فرڈائی سوہنی کھٹ اُپر کھشی وی بچھائی ہے
جتھے بیٹھے شمس خان راج بلی جۓ شپائی ہے
ھن پھرکن تریاں مچھاں رونق داڑھی سی بدھائی ہے

(پھر چغل خوروں نے راجہ کو اطلاع دی کہ شمس سدھرون میں چھپا ہوا ہے تو فوج پیچھا کرنے لگی۔اب شمس خان خدا کا نام لے کر اُٹھا۔ نیلی گھوڑی پر سوار ہوا اور سدھرون سے دیگوار آ گیا۔ جہاں محمد خان تیڑویں نے اُسے دھوکہ دیا اور قرآن کی قسم اُٹھا کر اور اس کے بھتیجے راج ولی کو گھر لے گیا اور چار پائی پر کمبل بچھا کر انہیں بٹھایا اور اُن کے ہتھیار لے کر اندر چھپا دیئے۔اُس وقت شمس خان کی مونچھیں اور داڑھی اُس کے چہرے کی رونق بڑھا رہی تھیں)

رکھی یارو روٹی کنی شمس گے آئی ہے
روٹی نے بچ یارو دتا زہر سا پکوائی ہے
تینوں راج بلی کہنا چاچا اجل نیڑے آئی ہے
تاں اُٹھیا شمس خان کرنا باہردار تھائی ہے
ھن مارے چوہدری جنوں شمس خان لے ٹھائی ہے
ھن محمد خان تیڑویں راج بلی لیہ ٹہائی ہے
فرکڈی وے تلوار محمد خانیہ توغی لائی ہے
دوجی فر تلوار اگر خانے توغی لائی ہے

تیجی فِر تلوار سراندازیہ توغی لائی ہے
ست سو تلوار چلی کٹ نہ کردی کائی ہے
مڑدا اتنی زیارہ قوت نور نامے اند آئی ہے
ھن کھولیا نورنامہ منڈی کپی اُسے جائی ہے
ھن ماریہ راج بلی وی قبلے سرنوائی ہے
ھن پھرکن تریاں مچھاں رونق داڑھی نے بدھائی ہے

(اب شمس خان کے آگے روٹی رکھی گئی جس میں زہر ملایا گیا تھا۔ اس وقت راج ولی کہنے لگا کہ چاچا اب موت نزدیک آن پہنچی ہے۔ تب شمس خان اُٹھا اور باہر بھاگنے لگا مگر چودھری نے اُسے گرایا۔ پھر محمد خان نے راج ولی کو بھی قابو کرلیا۔ پھر محمد خان، اگر خان اور سرانداز خان نے تلواروں سے شمس خان اور راج ولی پر حملہ کردیا۔ سات سو تلواریں چلیں مگر شمس خان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ شمس خان کے گلے میں نور نامہ تھا یہ اُسی کی طاقت تھی۔ پھر شمس خان کے گلے سے نور نامہ کھولا گیا اور اس کی گردن تن سے جُدا کردی گئی۔ پھر راج ولی کو بھی قتل کیا گیا۔ اس وقت بھی شمس خان کی موچھیں اور داڑھی اُس کے چہرے کی رونق بڑھا رہی تھیں)

ھن کپیاں ساریاں منڈیاں دتیاں راجے کول پُچائی ہے
مڑدا تکی راجے منڈیاں اوہ کمیا اُسے جائی ہے
ہیف سراندازہ چھوڑے لعل توں کھڑائی ہے
پیڑیو گھنے تُس چٹی شمس چھوڑنا سا چھڑائی ہے
ھن ہندا راجے دودھ داڑھی شمس تہوائی ہے
فِر پنج سوجوان دتے منڈیاں سنگ لائی ہے
چھنگو وے تُس منڈیاں دیو آدھی ٹھک پُہچائی ہے
جتھے راجے منڈیاں چھوڑیاں قلعے سنگ ٹنگوائی ہے

ھن تڑی گیا شمس اپنے نامے کی بدائی ہے
دھن وے شمس خان نالے دھن تری مائی ہے
ھُن مڑداں دی اے بار اساں مڑداں کی سُنائی ہے

(اب دونوں سر جوتن سے جدا تھے راجہ کے پاس بھیج دیئے گئے۔ راجہ مُنڈیوں کو دیکھ کر کانپ گیا۔ اُس نے سرانداز سے کہا تم نے قیمتی انسان کو مار دیا ہے۔ اگر شمس کو زندہ میرے پاس لے آتے تو میں انعام دیتا۔ پھر راجہ نے شمس خان کی داڑھی کو دودھ سے نہلایا اور پانچ سو جوانوں کو ساتھ لے کر قلعے کے باہر منڈیوں کو ٹنگوادیا۔ اس طرح شمس خان اپنے نام کو اونچا کر کے چلا گیا۔ شاباش شمس خان کو اور شاباش اس کی ماں کو جس نے اسے جنم دیا۔ مردوں کی یہ بار ہم نے مردوں کو سُنائی ہے)

بھدرواہ

جموں کا سب سے خوبصورت علاقہ بھدرواہ مانا جاتا ہے۔ بھدرواہ بٹوٹ سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور جموں سے اس کی دوری 125 رمیل ہے۔ بھدرواہ وادیوں، گھاٹیوں، جنگلوں، ندیوں اور آبشاروں کے لحاظ سے چھوٹا کشمیر کہلاتا ہے۔ بھدرواہ قصبے کی سطح سمندر سے بلندی 5400 فٹ ہے۔ اس طرح بھدرواہ کے موسمی حالات سرینگر کے جیسے ہیں۔

بھدرواہ کی تقریباً آدھی آبادی کشمیری ہے۔ یہاں کے قدیم باشندوں کو بھدرواہی کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ان کی اپنی زبان ہے جسے بھدرواہی کہتے ہیں۔ یہ مغربی پہاڑی زبان کی ہی ایک شاخ ہے جو اس علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بھدرواہ قصبے کا ثقافتی سرمایہ بڑا بیش قیمتی ہے۔ یہاں کئی تمدن آ کر ملتے ہیں۔ بھدرواہ کیلاش یاترا کے لئے بھی مشہور ہے۔ کیلاش ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں پہاڑ کی

بلندی پر ایک خوبصورت جھیل ہے جسے کیلاش کنڈ کہا جاتا ہے۔ کیلاش کنڈ بھدرواہ شہر سے 15 میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں بھادوں کے مہینے میں میلہ لگتا ہے جس میں دُور دُور سے عقیدت مند یاترا کے لئے آتے ہیں۔

کلہن کی راج ترنگنی کے مطابق بھدرواہ کو عہد قدیم میں بھدروکاش (1122-28ء) یعنی رہنے کے لئے بہترین خطہ سے تعبیر کیا ہے۔ بھدرواہ راجواڑہ پندرہویں صدی عیسوی میں بلور یہ خاندان نے وجود میں لایا تھا لیکن بعد میں یہ علاقہ چمبہ کے راجاؤں نے اپنے کنٹرول میں لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست بارہویں صدی عیسوی میں وجود میں آئی تھی لیکن سولہویں صدی تک کے واقعات تفصیل سے نہیں ملتے۔

ناگ لوگ اور باسک ناگ مندر

شہنشاہ اکبر کا دور تھا اُس زمانے میں بھدرواہ پر راجہ مہاپال کی حکومت تھی۔ وہ ناگ دیوتا کا پجاری تھا۔ اُس کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اُس نے ناگ دیوتا سے بیٹے کے لئے منت مانی۔ کچھ عرصہ بعد اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کی پیٹھ پر ناگ کی دُم کا نشان تھا۔ چنانچہ بیٹے کا نام ناگپال رکھا گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ناگپال راجہ بنا۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ راجہ سانپ کی دُم والا ہے۔ شہنشاہ اکبر کو علم ہوا تو اُس نے راجہ ناگپال کو طلب کیا۔ شہنشاہ نے یہ نشانات دیکھ کر اُسے خلعت وغیرہ سے نواز کر واپس بھیج دیا۔ ناگپال نے بھدرواہ میں ایک مندر تعمیر کیا جو باسک دہرہ یعنی باسودیو کے مندر سے مشہور ہوا۔ آج کل اس مندر کو باسک ناگ مندر کہتے ہیں۔ جہاں پتھر کی دو مورتیاں ہیں۔ ایک باسک ناگ کی اور دوسری راجہ ناگپال کی۔ ناگ پال ناگ دیوتا کا بہت بڑا پجاری تھا۔

بھدرواہی لوگ جن روحانی طاقتوں کو مانتے ہیں اُن میں واسک ناگ، گوردرشن ناگ، کمانی ناگ، تکھشک ناگ، کالی ناگ، سکھ ناگ اور ناگ سین وغیرہ مشہور

ہیں۔ان ناگ روحانی سرداروں کے نام پر مندراورزیارتیں بھدرواہ،ڈوڈہ،کشتواڑ،بلاوراور رام نگروغیرہ میں ملتی ہیں۔واسک ناگ قبائل کا روحانی دیوتااورجنگی سردارتھا۔اُس کا بڑامندر بھدرواہ قصبے میں موجود ہے جس کے ساتھ لوگوں کو بہت عقیدت ہے۔ واسکی پران کے مطابق آریاؤں نے واسکی ناگ کوبس میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

کیلاش کوہ سے گاٹھا تک واسکی ناگ کے چھپنے کی جگہ تھی۔آریہ اس مقام کا پتہ نہ لگا سکے۔اُس نے آریاؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈوڈہ سے ہماچل تک ناگ ریاست قائم کی تھی۔ضلع کشتواڑ بھدرواہ علاقہ،ڈوڈہ،رام نگراودھم پوراور کٹھوعہ میں آج بھی ناگ مت کے پیروکارموجود ہیں اورناگ پوجا بھی ہوتی ہے۔

کڈ میلہ

جب اس قبیلے کے لوگ فصلیں سمیٹتے ہیں تو سب سے پہلے ناگ مندر میں بھوگ لگتا ہے اور ناگ میلے منعقد ہوتے ہیں جنہیں''کڈ'' کہا جاتا ہے۔گاؤں کے لوگ شام کے وقت مندر کے قریب جمع ہوتے ہیں،الاؤ جلاتے ہیں اور ناگ مندر کے اردگرد مرد و زن ناچتے ہیں جسے ڈھول کہتے ہیں اور میلے کے دوران بڑی رونق اور گہما گہمی رہتی ہے۔

میلا پٹ

بھدرواہ کا سارا علاقہ میلے اور تہواروں کے لئے مقبول عام ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ گہما گہمیوں اور رونقوں کے لئے بھی جانا جاتا ہے کیونکہ یہاں کی تہذیب وتمدن پر مبنی روایتی میلوں کو منعقد کرنے کا رواج صدیوں پُرانا ہے۔اگست،ستمبر اور اکتوبر مہینوں میں فصلوں کی کٹائی اور ان کو سمیٹنے کے موقعے پر لوگ خوشیاں منانے کے لئے میلے تہوار منعقد کرتے ہیں جن میں علاقے کے تمدن کی جھلک ملتی ہے۔میلہ پٹ بھی ان میلوں میں سے ایک ہے جس

میں بلاامتیاز مذہب وملت اور ذات وفرقہ لوگ شرکت کرتے ہیں کیونکہ میلہ پٹ بھدرواہ کےعوام کے تشخص اور سر بلندی کی علامت کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ میلہ شہنشاہ اکبر کی بھدرواہ کے راجہ ناگ پال کے ساتھ ملاقات کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

کیلاش یاترا کے بعد بھدرواہ قصبے میں تاریخی کھکھل محلّہ کے واسُکی ڈیرہ میں اس میلے کا انعقاد ہوتا ہے۔ اُس روز راج گُرو کے گھر سے ڈھول تاشوں کے ساتھ جھانکی نکالی جاتی ہے جس کے دوران شہنشاہ اکبر کی طرف سے بھدرواہ کے راجہ ناگ پال کو دیئے گئے سونے، چاندی، ہیرے اور جواہرات کے تحفوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ میلے میں شرکت کرنے والے روایتی رنگ برنگے کپڑے پہن کر ''کڈ'' ناچ ناچتے ہیں اور مقامی زبان بھدرواہی کے علاوہ سراجی، ہندی اور سنسکرت میں بھجن کرتے ہیں۔ ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور میلہ کمیٹی کی طرف سے میلے میں شریک ہونے والے ہندو اور مسلمان لوگوں کو رواداری اور بھائی چارے کا پیغام دیا جاتا ہے۔

میلہ پٹ ناگ پنچمی کے دن منعقد ہوتا ہے اور تین دنوں تک جاری رہتا ہے۔ روایت ہے کہ 1580ء میں پہلی بار یہ میلہ منعقد ہوا تھا جب بھدر کاشی (موجودہ بھدرواہ) کا راجہ ناگ پال شہنشاہ اکبر کے دربار سے سرخرو ہوکر واپس آیا تھا۔ واسُکی ناگ پران کے مطابق بھدرواہ کا راجہ ناگ پال اپنے اشٹ دیو واسکی ناگ کے علاوہ کسی کے آگے سر نہ جھکاتا تھا۔ اسی دوران شہنشاہ اکبر نے پہاڑی راجاؤں کو دہلی طلب کیا۔ راجہ ناگ پال بھی اس میں شرکت کے لئے دہلی گئے۔ دہلی دربار میں روایت تھی کہ چھوٹے راجہ شہنشاہ کے آگے جھکا کرتے تھے۔ راجہ ناگ پال نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور سیدھے اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ شہنشاہ اکبر طیش میں آگئے اور راجہ ناگ پال کو سزا دینے کا حُکم دیا۔ اسی وقت راجہ ناگ پال نے اپنے اشٹ دیو واسکی ناگ کو یاد کیا۔ تو اُن کی رنگ برنگی پگڑی سے پانچ سروں والا ناگ نکلا اور دربار میں گھومنے لگا۔ یہ دیکھ کر شہنشاہ اکبر حیران رہ گیا اور راجہ ناگ پال کی کرشمہ سازی سے نہایت متاثر ہوا۔ اسی دوران ناگ غائب ہوگیا۔

چنانچہ شہنشاہ اکبر نے راجہ ناگ پال کو ہیرے جواہرات اور سونا چاندی دے کر رخصت کیا۔ یہ واقعہ 1580ء کا ہے۔ اُس کے بعد راجہ ناگ پال وطن آیا اور اکبر کے دربار میں سرخرو ہونے کی خوشی میں میلہ منعقد ہوا جو آج تک جاری ہے اور میلہ پٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بھدرواہی زبان

بھدرواہ کے باشندوں کی اپنی مادری زبان ہے جسے بھدرواہی کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت میٹھی اور رسیلی زبان ہے۔ جو لوگ بھدرواہی بولتے ہیں اُن کا لب و لہجہ مخصوص ہوتا ہے۔ جب وہ اُردو یا ڈوگری بولتے ہیں تو اپنے لہجے کے باعث پہچانے جاتے ہیں۔ پروفیسر اودھے چند ٹھاکر نے لکھا ہے کہ تمام پہاڑی بولیوں میں بھدرواہی سنسکرت کے زیادہ نزدیک ہے۔ صدیوں سے اس زبان نے اپنا منفرد تشخص بنائے رکھا ہے۔

بھدرواہی مغربی پہاڑی کا ہی ایک روپ ہے جو بھدرواہی، بھلیسوی اور پاڈری پر مشتمل ہے جبکہ پاڈری، پاڈر علاقے میں بولی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما تحریر کرتے ہیں کہ بھدرواہی مُلک کی ایک اہم زبان ہے۔ اس میں ایسے الفاظ محفوظ ہیں جو صرف ویدوں میں ملتے ہیں جبکہ اس کا گرائمر پراکرت سے بھی پرانا ہے۔

ڈاکٹر پریتم کشن کول کا خیال ہے کہ بھدرواہی میں فوک لور (لوک ادب) کی اعلیٰ روایات موجود ہیں۔ اس زبان میں 1930ء کے آس پاس تخلیقی ادب کا عمل شروع ہوا جب جموں میں جدید ڈوگری ادب کی سرگرمیوں کی ابتدا ہوتی تھی۔ بھدرواہی شعر و ادب پر نظر دوڑاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ پہلا شاعر گھمبیر چند تھا جو بقول رسؔا جاودانی بھدرواہ کے ایک چندر بنسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹھاکر اودھے چند نے اپنے ایک مضمون میں

نوٹ: (بھدرواہ میں میلہ پت بادشاہ اکبر اور ناگ پال کی ملاقات کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ میلہ تین دن جاری رہتا ہے۔ ہر سال بھادوں کے مہینے میں یہ میلہ لگتا ہے جس میں علاقے کے مرد اور عورتیں شریک ہوتی ہیں۔)

گھمبیر چند سے یہ اشعار منسوب کئے ہیں۔

چامے متی لایی لایی
گھوروٹاں کولپورے لایہ
انتیروں نا میل سے بریاں نہانے سے
آتما تدندی زان
اسی مانہہ تُو کر اشنان
تاں تیڑو بھولو کلیان

(تو اپنے ضمیر کو نہانے سے پاک نہیں کرسکتا۔ روحانی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے اپنی آتما کو ندّی جان کر اُس میں نہانا چاہئیے)

گھمبیر چند کی شاعری ایک عرصے تک پس پردہ رہی لیکن 1930ء میں پنڈت گوری شنکر بھدرواہی ایک اور اہم شاعر اُبھرے جنہوں نے سری مد بھگوت گیتا کا بھدرواہی میں منظوم ترجمہ کیا۔ ماسٹر مادھولعل پاہدا کا اندازہ ہے کہ مذکورہ ترجمہ 1939ء کے قریب ہوا۔ اس لئے پنڈت گوری شنکر بھدرواہی کو پہلا صاحبِ تصنیف شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

دوسرے دور میں جن شعراء نے بھدرواہی میں کلام لکھا اُن میں پنڈت پرکاش رام، ماسٹر چونی لعل، جان محمد تشنہ، پنڈت ایشور چند، لال چند شرما، لیکھ راج، بال کشن چوہان، امر چند ہتیشی، مُول راج اور فلیل چند قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر مادھولعل پادہ نے بھڈ لائی شیکھا نام سے بھدرواہی کا قاعدہ (گرائمر) مرتب کرکے نام کمایا۔ یہ گرائمر 1971ء میں شائع ہوا جسے کافی پسند کیا گیا۔ 1979ء میں ''بھدرواہ اور بھدرواہی'' کے نام سے کتاب مرتب ہوئی۔ 1988ء میں ماسٹر ہنس راج نے تُلسی داس کی لکھی ہوئی رامائن کا بھدرواہی میں منظوم ترجمہ شائع کرکے اس زبان کو زرخیز کیا۔

سری بال کشن چوہان نے 1988ء میں بھدرواہی سنستھا کا قیام عمل میں لایا جو ابھی تک کام کررہی ہے۔ 1973ء میں انہوں نے ''ہنسیان'' نام سے بھدرواہی ثقافت کا

ایک جائزہ شائع کرایا۔ آگے چل کر بال کشن بھدرواہی نے ڈکشنری کے لئے بھی اہم کام انجام دیا۔ کلچرل اکیڈیمی کے مطابق بال کشن چوہان، جان محمد تشنہ، موہن لعل پاہدا، امر چند ہستی، چونی لعل کوتوال، ہنس راج ہنس، لال چند بیتاب، جسونت سنگھ چاڈک، اوم کار سنگھ پردیسی اور مول راج منہاس اکیڈیمی کے مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔

اس وقت آل انڈیا ریڈیو جموں سے بھدرواہی زبان میں ہفتہ وار پروگرام نشر ہو رہا ہے جس سے بھدرواہی زبان کے گیت مقبول ہو رہے ہیں۔ دورِ حاضر میں پریتم کشن کول نے بھدرواہی لوک گیتوں کو محفوظ کرنے میں اہم کام کیا ہے۔ اُن کے بھدرواہی گیتوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بال کشن اور پریتم کشن صحیح معنوں میں بھدرواہی لوک ادب کی تشہیر میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

بھدرواہ کے لوگوں کا لباس

بھدرواہ کے راجواڑہ کے تمام علاقوں یعنی بھلیس، مرمت (کھسال) چرالہ، اٹھکھار، مٹھولہ اور کیلاڑ وغیرہ میں لوگ خصوصی طور پر اُونی پٹو کے سفید یا بھورے رنگ کے چوغے، کن ٹوپ، کمر بند اور پٹو سے بنے ہوئے ''پاتو'' اور اونی جرابیں پہنتے تھے۔ اس لباس کی جھلک کسی حد تک کنڈ کے میلے اور تہواروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اچھے پٹو سے بنے ہوئے کوٹ کا اب بھی کہیں کہیں استعمال ہوتا ہے۔ برف باری کے دنوں میں گاؤں میں شالی کے خوشوں سے بنی ہوئی رسیوں والی جوتی کا استعمال ہوتا تھا جسے پولہیں کہا جاتا تھا۔ پولہو سے پھسلن کا خطرہ نہیں رہتا۔ خواتین چدّر کے نیچے ''زوجی'' پہنتی تھیں اور اس کے اوپر مسلمان عورتیں سر پر کساب لگاتی تھیں۔

سردیوں میں پھیرن کا استعمال ہوتا تھا۔ پھیرن کے اندر کانگڑی رکھ کر جسم گرم رکھا جاتا تھا۔ مرد بھی پھیرن پہنتے اور سر پر صافہ باندھتے تھے۔ لڑکیاں شلوار، قمیض اور تنگ

چوڑی دار پاجامہ لگاتی تھیں۔لڑکے کوٹ،سویٹر اور تممی (شلوار) پہنتے تھے۔لڑکوں کو سکول آتے وقت صافے کا استعمال لازمی ہوتا تھا جبکہ کچھ لڑکے کنٹوپ اور ٹولی بھی پہنتے تھے۔ لیکن 1947ء کے بعد رواج یکسر بدل گئے۔مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں کے لباس میں خاص فرق نہیں ہوتا تھا۔قصبہ بھدرواہ کے لوگ چوڑی دار پاجامہ، پگڑی اور گرم کُرتے یا پھیرن اور پٹو کے کوٹ پہنتے تھے۔چوڑی دار پاجامہ اور پگڑی پہننے سے یہاں کے لوگوں پر ڈوگرہ تہذیب کے اثرات بھی ملتے تھے جبکہ باقی ملبوسات پر وادی کشمیر کا اثر تھا۔اُن دنوں کوٹ پینٹ تعلیم یافتہ یا افسر لوگ ہی پہنتے تھے۔اونی یا سوتی واسکٹ پہننے کا رواج پہلے سے ہی تھا جو اب بھی رائج ہے۔پھر دھیرے دھیرے نئے دور کے لباس مقبول ہونے لگے۔ اب لڑکیاں شلوار قمیض اور چادریں زیب تن کرتی ہیں جبکہ لڑکیوں اور خواتین میں برقعہ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔نئی پود اور ملازم پیشہ لوگ پینٹ کوٹ قمیض، پاجامہ، شیروانی، جیکٹوں، ٹائی اور قراقلی ٹوپی کا استعمال کرتے ہیں لیکن پہاڑی گاؤں میں اب بھی پٹو کے کپڑے پہننے کا رواج ملتا ہے۔

علاقہ بھدرواہ، ڈوڈہ اور کشتواڑ کے ناگ قبائل

ناگ ہندوستان کے اصلی باشندے مانے جاتے ہیں جو شمالی ہندوستان کے پہاڑوں کے دامن میں اور چشموں کے کنارے سکونت کرتے تھے۔کلہن نے راج ترنگنی میں کئی جگہ ناگ قبائل کا ذکر کیا ہے جو کشمیر میں رہتے تھے۔کشمیر کے پرانے مندروں میں ایسی مورتیاں ملتی ہیں جن میں سانپ کو کنڈلی مارے ہوئے دکھایا گیا ہے لیکن آریاؤں کی آمد کے بعد ناگ نسل کے لوگوں کا خاتمہ ہو گیا اور بہت سے خاندانوں نے علاقہ جموں کے اُن پہاڑی علاقوں میں پناہ لے کر اپنے آپ کو بچایا جہاں آریوں کی پہنچ نہ تھی۔ان میں پاڈر، کشتواڑ، بھدرواہ، ڈوڈہ، مرمت، بسنت گڑھ، بلاور، رام نگر، سُدھ مہادیو، لاٹی،

پوگل پرستان وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

راجہ نیل کے بعد کشمیر میں ناگوں کا زور ختم ہوگیا لیکن جموں کے پہاڑی علاقوں میں ناگ مت اصلی حالت میں قائم رہا۔ یہ لوگ واسک ناگ کو اپنا دیوتا مانتے ہیں اور شِو کی پوجا کرتے ہیں۔ان کے بہت سے تہوار سانپوں اور بھگوان شِو سے تعلق رکھتے ہیں۔اُن کا چشموں، سانپوں اور شِو پر پختہ یقین ہے۔ ناگوں کا اپنا منفرد سماجی اور ثقافتی پس منظر ہے جس میں ناگ دیوتا کی عظمت کا ذکر ہے۔ پھر لوگ ناگ مندر میں جاتے ہیں اور واسک ناگ و دیگر ناگ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔

ناگوں کا دیوتا شنکر اور شنکر کی شکتی پاربتی کو مانتے ہیں۔اُن کی عقیدت کے مطابق شنکر کیلاش پربت پر رہتا تھا۔ یہ لوگ بھی کیلاش پربت کی یاترا کر کے سکون حاصل کرتے ہیں۔کیلاش بھدرواہ میں پڑتا ہے۔

ڈوڈہ علاقے میں ژنڈی کے تین استھان ہیں۔ سرما تا اشٹ بُجا کا استھان پرسکون جنگل میں واقع ہے۔ یہاں زائرین کی آمدرفت جاری رہتی ہے۔ دوسرا پاڈر کشتواڑ میں مچیل کے مقام پر استھان ہے اور یہاں عقیدت مند یاترا کی صورت میں آتے ہیں۔ یہ یاترا چھڑی مبارک چنوٹ بھدرواہ سے نکل کر واسک ناگ کے دربار میں گاٹھا میں رُکتی ہے۔ وہاں پوجا کے بعد یاترا مچیل کی طرف روانہ ہوتی ہے جو ایک ہفتے کی پیدل یاترا کے بعد مچیل پہنچتی ہے۔

تیسرا استھان ڈوڈہ کے مغرب میں 'دہدنی' ہے جو مرمت علاقے میں چراگاہوں کی گود میں واقع ہے۔ یہاں موسم گرما اور بہار کے دنوں میں عقیدت مند روحانی تسکین کے لئے آتے ہیں۔ یہاں نوراتروں کے ایام میں میلہ لگتا ہے اور قربانی پیش کی جاتی ہے۔

واسک ناگ کو بھدرواہ کے تمدنی منظر نامے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جہاں ایک بڑا مندر قائم ہے۔ روایت ہے کہ واسک ناگ سانپ کی شکل میں ہے جسے بھگوان شِو نے اپنے گلے کے گرد لپیٹ کر رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس پر واسک ناگ مہربان

ہوجائے اُسے واسکھ ناگ کا سایہ ہر دم محسوس ہوتا ہے۔

ناگ عقیدے کے مطابق مہاتما بدھ بھی ناگ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ناگ قبیلے کی کچھ رسمیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہسٹری اینڈ کلچر آف کشتواڑ میں دونی چند شرما ناگوں کی کشتواڑ میں آمد کے بارے میں بتاتے ہیں:

"کچھ ناگ کنبوں کو دریائے اسی کنی (چناب) کے ساتھ کشتواڑ کی جانب پیش قدمی کرنے میں رہنمائی کی گئی۔ کشتواڑ کی خوبصورتی کو دیکھ کر وہ یہیں سکونت کرنے لگے۔ وہ ناگ یا سانپ کے پجاری تھے۔ ناگ تہذیب کے اثرات علاقہ پاڈر میں آج بھی واضح طور سے نظر آتے ہیں۔ پاڈر کے ہر گاؤں میں مندر کے دروازے پر آج بھی ناگ کی کُھدی ہوئی تصویریں موجود ہیں"۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناگ کشمیر سے نکل کر پہلے علاقہ کشتواڑ کی طرف آئے پھر بھدرواہ، ڈوڈہ، اودھم پور وغیرہ علاقوں میں پھیلتے گئے۔

کشتواڑ

کشتواڑ جموں سے 248 ؍کلومیٹر شمال مشرق میں پڑتا ہے اور بٹوٹ سے اس کی دوری 149 ؍کلومیٹر ہے۔ یہ سطح سمندر سے 5300 ؍فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور دریائے چناب کے کنارے ایک خوبصورت وادی کے عین درمیان واقع ہے۔ کشتواڑ کا تاریخی اور تمدنی سفر کشمیر وادی کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ پنڈت سانگرام کول کی کتاب "مہاراجہ گلاب سنگھ" کے مطابق کشتواڑ کا ذکر نیل مت پران میں بھی ملتا ہے۔ روایت ہے کہ جب کشمیر کی سرزمین ایک جھیل تھی تو کشپ رشی کشتواڑ سے آئے تھے اور یہاں سے ہی کشمیر کی طرف بڑھ کر کونسر ناگ کے پہاڑ پر بیٹھ کر جھیل کا پانی نکالنے کے لئے ریاضت کی تھی۔

جب کشمیر میں ناگ قوم سکونت کرتی تھی تو اُن کی ایک جماعت نے کشتواڑ کو اپنا مسکن بنایا۔ آج بھی ناگ قوم سے وابستہ کچھ علاقوں کے نام ملتے ہیں۔ جیسے ناگ ایشور،

گوداش ناگ، کالی ناگ، گمانی ناگ، ناگ سین وغیرہ۔ پھر آریہ نسل کے قبائل نے کشتواڑ کی طرف پیش قدمی کی اور ناگ قبیلوں کو دور بھگا دیا۔صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کشتواڑ میں ناگ اور آریہ قبائل کے خدوخال الگ الگ نظر آتے ہیں۔

روایت ہے کہ پانچویں صدی کے وسط میں راجگان گوڑ بنگال کے راجاؤں سے راجہ کاہن پال سری امر ناتھ سوامی کی یاترا کے لئے فوج کے ساتھ نکلا تو اسے کشتواڑ کا علاقہ بہت پسند آیا اور اُس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔اس وقت مقامی قبائل پنج ساسی جو یہاں حکومت کرتے تھے جنہیں کاہن پال نے قابو کرکے یہاں حکومت قائم کی۔کاہن پال کے بعد راجہ گندھوب سین، راجہ مہا سین، راجہ پرتھو دیو، راجہ رائے راج، راجہ لچھمن دیو، راجہ راج سنگھ، راجہ بجے سنگھ، راجہ بہادر سنگھ، راجہ پرتاپ سنگھ، راجہ گور سنگھ، راجہ جگت سنگھ، راجہ بھگوان سنگھ، راجہ مہا سنگھ نے 1656ء تک حکومت کی۔راجہ مہا سنگھ نے 1656ء میں اپنے بیٹے جے سنگھ کو راجہ بنایا اور خود گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

جے سنگھ کے عہد میں اُسے اپنے چھوٹے بھائی جے سنگھ کو دہلی دربار میں بطور یرغمال بھیجنا پڑا۔ پھر جے سنگھ کی اپنے تیسرے بھائی سردار سنگھ سے نالش ہوگئی۔سردار سنگھ دہلی فریاد لے کر پہنچا تو جے سنگھ کو اپنا بیٹا کیرت سنگھ دہلی بھیجنا پڑا۔ جے سنگھ کے عہد میں کشتواڑ قصبے کی آبادی پانچ ہزار تھی اور لوگ بڑے خوش حال تھے۔

راجہ جے سنگھ کے عہد میں ایک مسلم بزرگ سید محمد فریدالدین اپنے چار مریدوں کے ساتھ بغداد سے کشتواڑ پہنچے اور اشاعت اسلام میں جٹ گئے۔ان کی تبلیغ کے باعث کشتواڑ کے راجہ جے سنگھ نے اسلام قبول کرلیا جس نے اپنا نام بختیار خان رکھا اور 1763ء میں انتقال کیا۔

راجہ جے سنگھ عرف بختیار خان کے بعد اُس کا بیٹا راجہ کیرت سنگھ عرف سعادت یار خان، راجہ عنایت اللہ سنگھ، راجہ محمد تیغ سنگھ نے یکے بعد دیگرے کشتواڑ پر حکومت کی۔ 1820ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے گلاب سنگھ ڈوڈہ کشتواڑ کی فتح کے لئے نکلا۔

جب وہ ڈوڈہ پہنچا تو محمد تیغ سنگھ نے ڈوڈہ آ کر اطاعت قبول کر لی اور کشتواڑ پر گلاب سنگھ کا قبضہ ہو گیا اور گلاب سنگھ نے اپنا پہلا گورنر میاں چنن سنگھ کو تعینات کیا۔ بعد میں معاہدہ امرت سر کے تحت یہ علاقہ ریاست جموں وکشمیر کا حصہ بنا۔

1823ء میں جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے زورآور سنگھ کو کشتواڑ کا گورنر بنا کے بھیجا جس نے 1841ء تک کشتواڑ کی انتظامیہ کو چلایا۔ کشتواڑ میں ہی زورآور سنگھ نے لداخ فتح کرنے کا عزم کیا اور 1833-1841ء تک اُس نے چار بار لداخ پر حملہ کیا۔ 1836ء میں اُس نے پاڈر پر حملہ کر کے چمبہ کی فوج کو بھگا دیا۔ 1841ء میں چوتھی بار زورآور سنگھ نے کشتواڑ کے عوام کی مدد سے لداخ پر حملہ کیا اور لداخ سے صدیوں پرانی نمگیال خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا پھر مہم جاری رکھی اور تبت کی طرف کوچ کیا۔ جہاں 12/دسمبر 1841ء میں ڈویو کے مقام پر مارا گیا۔ 1842ء میں میاں جیوا سنگھ کشتواڑ کا حاکم بنا۔ 1846ء میں کشتواڑ مہاراجہ گلاب سنگھ کی ریاست جموں وکشمیر کا حصہ بن گیا اور ضلع اودھمپور کی ایک تحصیل قرار پایا۔ 1847ء کے بعد جب ضلع ڈوڈہ کی تشکیل ہوئی تو کشتواڑ اس ضلع کی ایک تحصیل کے طور پر وجود میں آیا۔ اس وقت کشتواڑ کو ضلع کا درجہ حاصل ہے۔

تمدنی سرمایہ

کشتواڑ ریاست میں حضرت سید فرید الدین ولیؒ کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور انہیں دینی و روحانی کاوشوں کے لئے جانا جاتا ہے۔ یہ بزرگ بغداد کے ایک مشہور روحانی رہنما تھے اور حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ المعروف غوث الاعظم دستگیر صاحبؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشتواڑ میں اسلام ان کی تبلیغی کاوشوں کی بدولت فروغ پایا۔ آپ کی کاوشوں سے مقامی راجہ جے سنگھ نے اسلام قبول کیا اور آپ نے کشتواڑ کو بغداد ثانی میں تبدیل کیا۔

لوگ

کشتواڑ میں عہد قدیم میں مقامی ناگا قبائل آباد تھے جنہیں آریائی قبائل نے آکر اکھیڑ دیا اور انہیں پہاڑی علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ جب یہاں راجپوت خاندان نے حکومت کی داغ بیل ڈالی تو یہاں باہر سے لوگ آنا شروع ہوگئے اور حکمران راجپوت خاندان کے ٹھکر قبائل بھی وارد ہوئے۔ ان کے بعد دلت لوگ بھی آئے۔ لیکن برہمن بہت کم کشتواڑ کی طرف متوجہ ہوئے۔ پاڈر علاقہ میں ٹھکر اور دلت آبادی اکثریت میں ہے جبکہ برہمنوں کے بھی کچھ گھر ہیں۔

مغلیہ عہد میں حضرت سید فریدالدینؒ کے مزار پر راجہ جے سنگھ نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن مذہبی طور پر یہ راجہ روادار واقع ہوئے تھے اور مسلمان ہونے کے باوجود مسلم اور غیر مسلم رعایا سے برابر کا سلوک کرتے تھے۔ مسلم راجہ ہندو اور اسلامی نام دونوں رکھتے تھے اور اُن کے باقاعدہ پروہت مقرر ہوتے تھے۔ شادی کے موقعے پر برہمنوں کو انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے مذہبی مقامات کے لئے جاگیریں وقف تھیں۔

کشتواڑ کے پاڈر اور کچھ دوسرے پہاڑی علاقوں میں بدھ دھرم کے ماننے والے لوگ بھی سکونت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عہد قدیم میں یہاں بدھ دھرم عروج پر تھا لیکن کشمیر میں بدھ مت کا سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی کشتواڑ میں بھی ہندو دھرم کا سکہ رائج ہوگیا اور کشمیر کا شِو فلسفہ یہاں فروغ پا گیا اور یہ علاقہ عرصے تک علم و دانش کا مرکز رہا۔ راجہ بھریندر سین 51-749ء کے عہد میں ''سنگت سنگرہ'' نامی کتاب لکھی گئی جو علمِ موسیقی سے تعلق رکھتی تھی۔ کتاب کے مصنف وان ہیں۔ 1655ء میں پنڈت رتن کنٹھ نے کشمیر سے کشتواڑ آکر امرکوش تشریحات لکھی۔ کشتواڑی برہمنوں نے سنسکرت میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ سترہویں صدی میں جب کشتواڑ کے راجہ دائرہ اسلام میں آئے تو سنسکرت زبان کو زوال شروع ہوگیا اور دھیرے دھیرے عوام نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

کشتواڑ میں مسلمانوں کا اثر ورسوخ بڑھ جانے کی وجہ سے اسلامی علوم وفنون کو فروغ ملا۔ فارسی کا دائرۂ اثر بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم بھی فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور اس زبان میں شعر گوئی کیا کرتے تھے۔ راجہ بہادر سنگھ 1605-1570ء کے عہد میں فارسی نے راج دربار میں قدم جمائے۔ اسی عہد میں یعقوب شاہ کی بیوہ شنکر خاتون کشتواڑ میں آئیں اور زندگی کا آخری حصہ یہاں گزارا۔ شنکر خاتون علماء کی بڑی قدر دان تھیں۔ اُن کے ذاتی ملازموں میں شاعر، حافظ اور عالم دین تھے۔ راجہ کیرت سنگھ 1764ء کے عہد میں کشتواڑ میں شاعر اور ادیب بہت تھے۔ آستانہ سید محمد اسرار الدینؒ کے سجادہ نشین اور اس خاندان کے حضرت نصیر الدین جو خاندان قاسمیہ سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے تاریخِ کشتواڑ کا سنسکرت سے پہلی بار فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

کشتواڑی زبان کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ کشمیری کا ہی روپ ہے۔ پروفیسر محی الدین حاجنی لکھتے ہیں کہ:

''آج یہ بات درست ثابت ہوچکی ہے کہ بدھ عالم ناگ سین بھی کشمیری تھا جس نے اپنی کتاب ملندہ پانہہ اُس زمانے کی کشتواڑی کشمیری میں لکھی تھی جس کا پالی اور سنہائی میں ترجمہ ہوا تھا۔ اصل کتاب ناپید ہے، اگرچہ ترجمہ باقی ہے۔''

1821ء میں کشتواڑ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جموں صوبہ کا حصہ بنا تو علاقے میں ڈوگری زبان کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ آخری کشتواڑی راجاؤں اور جاگیرداروں کے پٹے اور سندیں ڈوگری میں ملتی ہیں۔

کشمیر میں کشمیری لوگ پھیرن یا پیرہن پہنتے ہیں۔ گول ٹوپی کا استعمال کرتے ہیں اور چاول کھاتے ہیں اور مکانات سلامی دار اور کئی منزلہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہی کشمیری جب ہجرت کر کے کشتواڑ آئے تو پھیرن کی جگہ انگرکھے نے لے لی۔ گول ٹوپی سروں سے غائب ہوگئی اور لداخیوں کی وضع کے کنٹوپ نے لے لی۔ مکی کی روٹی عام خوراک ہوگئی۔ سلامی دار

نوٹ: فریڈرک ڈریو کے مطابق جے سنگھ مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ اُس کا بیٹا کیرت سنگھ حضرت شاہ صاحبؒ کے اثر میں آکر مسلمان ہوا تھا اور اورنگ زیب عالمگیر نے اُس کا نام سعادت یار خان رکھا تھا۔

کئی منزلہ مکانوں کی جگہ چوڑی چھتوں والے کوٹھے رہ گئے۔ زبان کشمیری رہی لیکن لہجہ بدل گیا اور کشتواڑ کے کشمیری لوگ جنوبی علاقوں کے لوگوں سے متاثر ہونے لگے۔

کشتواڑ کے لوگوں کے تہوار موسمی حالات سے منسلک ہیں۔ بھادوں سے اسوج تک جگہ جگہ میلے لگتے ہیں۔ ہٹہ کے گاؤں میں جہاں دیوی اشٹ بھوجہ کا مندر ہے پہلے یاترا منعقد ہوتی ہے۔ یاترہ میں پروگرام پیش کرنے والے نقال اور بھانڈ مسلمان ہوتے ہیں۔ چوگان کے وسط میں کٹک یاترا کا میلہ ہوتا تھا جس میں ہاتھی کی شکل بنائی جاتی تھی۔ ناچ گانا ہوتا تھا۔ بھیڑوں اور مینڈھوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھاگن کے مہینے میں سدھان، ساتن، کاکل اور نکاس نام کے تہوار مقرر تھے۔

کشتواڑ کی تاریخ میں جاگیرداری نظام کا دور دورہ رہا ہے۔ حکمران اور اُن سے وابستہ لوگ خوشحال رہے لیکن عوام پسماندہ اور غریب رہے۔ غریبوں میں ضعیف الاعتقادی بہت رہی۔ توہم پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشتواڑ خاص اور علاقہ جات میں ڈائنوں کا ہونا (witches) اور اُن کا تدارک کرنے والے 'بارونوں' کا طوطی بولتا رہا ہے۔

اب عام آدمی کی عادتیں بدل چکی ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ جو اور باجرہ کھاتے تھے اور اچھی قسم کے چاول اور گندم فروخت کر دیا کرتے تھے۔ پہننے کے لئے گھروں میں لگی ہوئی کھڈیوں پر پٹو اور اونی کپڑے خود تیار کرتے تھے اور بارہ مہینے گرم کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن اب عوام کی زندگی موجودہ دور سے آملی ہے اور آج کے زمانے کی ہر آسائش سے کشتواڑ کے لوگ بھی محظوظ ہو رہے ہیں۔

کشتواڑ کو آج بھی شاعروں اور ادیبوں کی زمین کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آخر سے آج تک کئی ادبی شخصیات نے یہاں جنم لیا۔ جن میں پیر غلام محی الدین محی، پیر بہاؤالدین، خواجہ غلام رسول کامگار، غلام مصطفےٰ عشرت کاشمیری، غلام رسول نشاط، کشمیری لعل روپ، فتح جو فتح، ہنس راج وزیر، ولی محمد اسیر کشتواڑی، لسہ جو رانا، غلام نبی ڈول وال، غلام حسین ارمان، چندر پرکاش چندر، رویل سنگھ رانا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1935ء میں بزم ادب کشتواڑ قائم ہوئی۔ غلام حیدر قیصر اس کے صدر اور عشرت کاشمیری سیکریٹری بنے۔ غلام نبی ڈول وال کشتواڑ کے فن کاروں میں سب سے اہم نام ہیں۔ سارا کشمیر اس فنکار سے پیار کرتا ہے۔ ڈول وال ادبی میدان میں جانباز کے نام سے مشہور تھے اور انہوں نے کشمیری موسیقی میں چلنت نامی گانے کی طرز کا اضافہ کیا ہے۔

کشتواڑی زبان

محمد یوسف (پنجاب یونیورسٹی پاکستان) نے شعبۂ کشمیری کے نگران کی حیثیت سے کشتواڑی اور کشمیر کا تقابلی مطالعہ اپنی کتاب ''کشمیری زبان و ادب کی مختصر تاریخ'' میں یوں لکھا ہے:

> ''کشمیری خاص کی ایک اہم بولی کشتواڑی ہے جو کشمیری خاص کی طرح ہی لکھی جاتی ہے اس کے قواعد کی تشکیل صرف ونحو وغیرہ کشمیری سے میل کھاتے ہیں۔ لب ولہجہ میں خفیف سا فرق ہے۔ مقامی ڈوگری زبان کے میل کے باعث کہیں کہیں کشمیری خاص سے الگ لگتی ہے۔ جیسے کشمیری خاص میں شُر کہتے ہیں لیکن کشتواڑ میں اس کو بکت کہیں گے۔ اسی طرح بہت سارے الفاظ جو کشتواڑی میں ملتے ہیں کشمیری خاص بولنے والے کو کچھ نامانوس لگتے ہیں۔ جہاں تک سراجی، پوگلی بولیوں کا تعلق ہے اُن پر مقامی بولیوں کا زیادہ اثر ہے۔ کیونکہ ان زبانوں میں ادیب اور شعراء اب کام کر رہے ہیں جو ان بولیوں کو کشمیری کے قریب لانے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔''

پروفیسر محی الدین حاجنی نے اپنی کتاب 'کشمیری شاعروں کے تعارف' میں لکھا ہے کہ بدھ عالم ناگاسین نے اپنی کتاب 'ملندہ پنہہ' کشتواڑی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ پالی اور سنہالی میں ہوا تھا۔ اگر یہ درست ہے تو یقیناً ناگ سین کشتواڑی تھا۔ کشتواڑی کے متعلق خیال ہے کہ یہ قدیم کشمیری کا ہی روپ ہے۔ سنسکرت نے اس زبان کے دامن کو مالا مال

کیا۔ چونکہ اس کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہوئی اس لئے شاعروں اور ادیبوں نے اس طرف کم توجہ دی۔ 'مہانے پرکاش' واحد کشمیری کتاب ہے جو اپنی صحیح حالت میں محفوظ رہی۔ یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ کشتواڑی سرینگر کی کشمیری آسانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ لیکن سری نگر کے کسی باشندے کے لئے کشتواڑی بولنا مشکل ہے۔ کیونکہ کشتواڑی میں ایسے الفاظ ہیں جنہیں اس نے پہلے کبھی نہ سُنا ہوگا۔ اگر چہ کشتواڑی پر فارسی زبان اثر نہ ڈال سکی لیکن اس پر ڈوگری کا اثر پڑا ہے۔ ککڑی، بسان، ترکالن وغیرہ الفاظ ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ پروفیسر اسداللہ وانی اپنی کتاب ''شیخ العالمؒ'' میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں نے پرانی کشتواڑی کے چلن کو جاری رکھا اور مسلمانوں نے وادی کے زیر اثر فارسی آمیز کشمیری اپنائی۔ مثلاً کشمیری برقعہ کشتواڑی میں جنڈ، خوشوُن (سوندر) شرارت (کرور) کمبل (چیچڑ) جیسے بہت سے الفاظ جو اب کشمیری میں رائج نہیں مگر کشتواڑی ہندوؤں نے ابھی محفوظ رکھے ہیں۔

کشتواڑی لوک گیت بڑے اثر انگیز ہوتے ہیں۔ جب کوئی فن کار انہیں گانے لگتا ہے تو کشتواڑ کی خوبصورت وادی اور صدیوں سے چلے آرہے آپسی بھائی چارے کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ایک بار ابھینو تھیٹر میں مرحوم ڈول وال نے اپنے خاص لہجے میں ''سوندر میا نے کشتواڑ تھوک تُو اس دیس'' گایا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اسی طرح جہاں آراء جانباز 1987ء میں 'بھارت کا لوک اُتسوٗ منانے کے لئے سویت روس گئیں تو وہاں مشہور کشتواڑی گیت ''گنگا نوادل جانے تہ میرے گنگاوا'' گا کر بڑا نام کمایا۔ کشتواڑی لوک گیت کشتواڑ سے باہر گانے کا سہرا ڈول وال مرحوم کے سر بندھتا ہے۔ کشتواڑی دو گیتوں کے اقتباسات پیش ہیں:

(ا) گونگا نہِ واہ دل جانے
میرے گونگا نہ واہ
استان گرٹھیو سلامے

تے کھیڈ یو چوگان ہالے
تہ میرے گونگا نوا

اسمانہ پکن کوتر جوڑے
اکس زبہُ تس پوڑے
برونٹھ جانہ وُ چھہ مے بادام چشمن
یتہِ ژاپے نازنین جانے
تہ میرے گونگا نوا

(۲) آستان گرژھیو سلامے تَے
کھیڈ یِ ہالہ چوگان مدنو
میأنو مدنو
کونگہِ پوے تھِ آسہِ نس منڈ لس شؤ بان
تہِ پاڈرتھ نیلم کان مدنو
میأنو مدنو

یتہِ ریٹھ رلی ملی پایہ ژنی تالی اُسی
ہنٛدری تے بنیہِ مسلمان مدنو
میأنو مدنو

کشتواڑی کا پہلا نثر نگار ناگ سین ہے لیکن پہلے شاعر کا علم نہیں۔البتہ محی الدین کشتواڑی کے گیت بہت اچھے ہیں۔جو شاعر ابھی لکھ رہے ہیں اُن میں بدری ناتھ تلماڑی، سوہن لعل گنجو، موہن غریب، سنت رام سناتن، چندر کشتواڑی، اُلفت کشتواڑی، جگدیش راج

دیگر، رویل سنگھ رانا قابل ذکر ہیں۔ سنت رام سناتن کے کچھ اشعار ترجمہ کے ساتھ ملاحظہ کریں۔

گھرچِہ لڑائی تھس یتھ کُن تراوے
پریمک شربتھ اکھ اَکس چاو
(گھریلولڑائی ایک طرف رکھتے ہوئے محبت کا شربت ایک دوسرے کو پلایئے)

دیوتر آے تعصب بنو انسانے
دور کڑھ دُین آسہ لوکن دھیانے
(تعصب چھوڑیں۔انسان بنیں۔ہم لوگوں کو مستقبل دھیان دینا چاہئے)

گھرہ گنڈ گامہ گنڈ ہیمس آسیہ
تِمن دشمن کیاہ کھوسہ باسہ
(جن لوگوں کے گھر گھر اور گاؤں گاؤں متحد ہیں انہیں دشمن کی فکر نہیں ہوتی)

پاڈر

پاڈر کشتواڑ سے 40 میل کی دوری پر پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہے۔ پاڈر کشتواڑ کا حصہ ہے۔ یہاں سُم چام کے مقام پر نیلم کی کان ہے۔اس علاقے کا رقبہ چمبہ سے ملتا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے علاوہ بدھ مت کے ماننے والے بھی سکونت کرتے ہیں۔ بدھ خاندان گاؤں لوٹن، کاباں، لوسن، بنگل، ھولو وغیرہ میں آباد ہیں۔ان کی آبادی ایک ہزار سے اوپر ہے۔ یہ لوگ زانسکار کے بدھ قبائل کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور لداخی تہذیب کے اثرات سے متاثر ہیں۔

پاڈر کے پرانے حکمران رانا ہوا کرتے تھے جنہوں نے پاڈر پر تین سو سال تک حکومت کی۔ یہاں ہر گاؤں کا اپنا رانا ہوتا تھا۔ ان راناؤں کو چمبہ کے راجہ چتر سنگھ نے

1650ء کے آس پاس زیر کیا۔ پھر یہ علاقہ صدیوں تک چمبہ کا حصہ رہا۔ 41-1837ء کے درمیان کشتواڑ کے ڈوگرہ گورنر زورآور سنگھ نے پاڈر پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا تھا۔

پاڈر کا تمدنی سرمایہ بڑا وسیع ہے۔ یہاں کی تہذیب اپنی منفرد شناخت بنائے ہوئے ہے۔ یہاں ایک خوبصورت قلعہ ہے جسے چمبہ کے راجہ چتر سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ فن تعمیر کے لحاظ سے بڑا انوکھا اور مضبوط قلعہ ہے۔ اس کے کھنڈرات اور آثار اٹھوں گاؤں کے قریب دستیاب ہیں۔ پاڈر کے لوگوں کی اکثریت ٹھاکر خاندانوں پر مشتمل ہے جبکہ دلت اور مسلمان بستیاں بھی ملتی ہیں۔ یہاں زبردست برف باری ہوتی ہے۔

پاڈری زبان

کشتواڑ کے علاقہ پاڈر میں جو پہاڑی زبان بولی جاتی ہے اُسے پاڈری کہتے ہیں۔ اس زبان کا علاقہ پانچ پنچائتوں اور 32 گاؤں پر مشتمل ہے۔ اٹھونی جو پاڈر کا صدر مقام ہے اب ایک قصبہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ پاڈری زبان کے بارے میں دونی چند شرما لکھتے ہیں:

> ''علاقہ پاڈر بھوٹنہ نالہ اور اشتھان نالہ کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے کے عوام کی منفرد مادری زبان ہے جسے پاڈری کہتے ہیں جو پہاڑی زبان کے گروہ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ ہانگو، بالٹی، سم، چام، لبن اور تن کے علاوہ باقی تمام علاقے میں لوگ پاڈری بولتے ہیں۔ یہ بولی جگہ جگہ اپنی شکل وصورت بدلتی رہی ہے۔ صوتیات اور اُتار چڑھاو کے لحاظ سے پاڈری کی مچیل وادی اور اشتھاری گندھاری وادی میں الگ الگ صورتیں ہیں۔''

پاڈر کی شری چنڈی دیوی مچیل یاترا

یہ استھان پاڈر میں واقع ہے۔ مچیل کی بلندی 8500 فٹ ہے۔ یہ مندر سر بلند برفانی پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ ماہ اگست میں مچیل یاترا چنوت بھدرواہ سے نکل کر

کشتواڑ کے راستے پاڈر چلی جاتی ہے۔ روایت ہے کہ کلبیر سنگھ نامی سب انسپکٹر مچیل میں چوکی افسر ہوا کرتا تھا اور چنڈی دیوی کی پوجا میں مگن رہتا تھا۔ جب اُس کی تبدیلی ہوئی تو مندر میں جا کر رونے لگا۔ پھر اُسے اپنے کمرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ کوئی اُسے کہتا تھا 'جذباتی مت بنو میں آپ کے گھر آؤں گی اور آپ کے باغ کی زمین سے نکلوں گی'۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چنڈی دیوی چنوت بھدرواہ میں زمیں سے ظاہر ہوئی۔ اُسے ایک جلوس کی صورت میں کلبیر سنگھ کے گھر پہنچایا گیا اور دور دور سے لوگ دیوی کے درشن کو آنے لگے۔ اسی واقعے کی یاد میں عقیدت مند چنوت سے مچیل تک جلوس کی شکل میں جاتے ہیں۔ یاترا واسک ناگ مندر واقع گاٹھا سے چلتی ہے اور کشتواڑ سے ہوتے ہوئے اٹھولی اور پھر چشوتی میں پڑاؤ ڈالا جاتا ہے۔ پانچویں دن یہ سالانہ یاترا مچیل پہاڑی پر پہنچتی ہے۔

ڈوڈہ

ڈوڈہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں روایت ہے کہ جس زمانے میں ڈوڈہ ریاست کشتواڑ کا حصہ تھی تو کشتواڑ کے ایک راجہ نے ملتان سے ایک برتن بنانے والے کاریگر کو لاکر اس مقام پر آباد کیا تھا۔ اس کاریگر کا نام ڈیڈہ تھا۔ اس کے یہاں برتنوں کا کاروبار کرنے کے باعث دوسرے لوگ بھی یہاں آباد ہونے لگے اور دھیرے دھیرے یہ قصبہ کی صورت اختیار کرنے لگا اور لوگوں نے اس قصبہ کا نام کاریگر کے نام پر ڈیڈہ رکھا جو آگے چل کر ڈوڈہ ہو گیا اور پھر پورے علاقے کا نام ڈوڈہ پڑ گیا۔

ڈوڈہ کا اپنا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رہا ہے اور یہاں کی مخلوط تہذیبی روایات رہی ہیں۔ یہاں کے عوام مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ مسلم آبادی اکثریت میں ہے لیکن اکثریت اور اقلیت میں کبھی تناؤ دیکھنے کو نہیں ملا۔ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور پرانے ضلع ڈوڈہ میں کشمیری، ڈوگری، بھدرواہی، کشتواڑی، سراجی، پوگلی،

کھسائی، گوجری، پاڈری، پنجابی، اُردو اور پہاڑی بولی جاتی تھیں اور یہ ضلع پرانے زمانے میں دو ریاستوں یعنی کشتواڑ اور بھدرواہ پر مشتمل ہوتا تھا لیکن 2006ء کی تقسیم کے بعد اب ضلع ڈوڈہ سکڑ کے رہ گیا۔

پوگلی

تحصیل بانہال کا علاقہ پوگل لسانی اعتبار سے الگ امتیاز رکھتا ہے جہاں پوگلی بولی جاتی ہے۔ پوگل پرستان کے علاوہ پوگلی نیل چھلواس اور چک نٹر داو تک بولی جاتی ہے۔ یہ کشتواڑی کی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ بانہال قصبہ اور اس کے نواحی علاقے میں کشمیری کا دبدبہ ہے لیکن دیہات میں لوگ پوگلی بولتے ہیں۔ ڈاکٹر مرغوب بانہالی پوگلی کو کشمیری زبان کی ایک اہم بولی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گریرسن تیرہ زبانوں اور اُن کی بائیس شاخوں کی نشاندہی کرتے ہیں مگر وہ شینا، کشتواڑی اور پوگلی بولیوں کو صاف طور پر کشمیری کے کھاتے میں ہی ڈالتے ہیں۔ پوگل پرستان کے لمبے پہاڑی علاقے میں پوگلی بولی نے تین الگ لہجے پیدا کئے۔ پہلا پوگل خاص اور مالیگام کا لہجہ، دوسرا نیل خاص اور کھروش تر گام کا لہجہ، تیسرا سیناپتی لہجہ۔ اس کا نام پوگلی کیسے پڑا اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم کلہن کی راج ترنگنی میں بانہال کا ذکر ہونے کے بعد کھش قبیلے یعنی کھہہ اور ان کے سردار باگیگا کی اس طرح بات ہوئی ہے کہ لگتا ہے یہ لفظ گیگا سے ہی اس علاقے کو پوگل اور بولی جانے والی زبان کو پوگلی کہا گیا۔''

ضلع ڈوڈہ کی دیگر زبانوں کی طرح پوگلی بولی میں بھی لوک ادب کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔ یوں تو اس بولی میں کئی شاعر پیدا ہوئے ہوں گے لیکن پیر مشکور صاحب جو علاقہ کپرن کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اس بولی کے پہلے صاحب تصنیف شاعر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ علاقہ پوگل میں مریدوں کے ہاں قیام کرتے اور پوگلی و کشمیری میں شعر کہتے تھے۔ لیکن اُن کا

مجموعۂ کلام نایاب ہے۔ غیر پوگلی اشخاص میں ماسٹر غلام محی الدین روشن پہاڑی استاد تھے جو پوگل میں ملازمت کرتے تھے اور پوگلی میں اشعار کہتے تھے۔

موجودہ دور میں مشتاق پوگلی، عبدالرشید ذوالفقار، عبدالجبار منظور کی تصنیفات شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ذوالفقار پوگلی کا مجموعہ کلام ''یاداشت ذوالفقار'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اگرچہ مجموعہ کلام بہت چھوٹا ہے لیکن پوگلی میں شائع ہونے والے مجموعات میں سے ایک اچھا شعری مجموعہ ہے۔

''تو یہی چھوس میہر بان'' (آپ ہی تو مہربان ہیں) منظور پوگلی کی تصنیف ہے۔ یہ مجموعہ 1981ء میں شائع ہوا۔ بطور نمونہ منظور صاحب کے کچھ شعر ملاحظہ کریں:۔

زندگی منز امتحان کھل نسم

(زندگی میں میرا امتحان کب لوگے)

فکر ناکیمی لین پانے ژلن

(فکر اور ناکامی خود بخود ختم ہوجائیں گے)

ٔبلہ منظور تس سٔہ دیوِ ارحان یکھ

(منظور کو صحت اور تندرستی عطا کردو)

منشور بانہالی نے بھی پوگلی میں شعر کہے ہیں۔ ڈاکٹر مرغوب بانہالی کی دختر نیک اختر نے ایم فل کے لئے پوگلی زبان پر لکھی گئی تھیسز کشمیر یونیورسٹی کو پیش کرتے ہوئے اہم کام کیا ہے۔

سراجی

سراج تحصیل ڈوڈہ کا وسیع علاقہ ہے جو زبان وہاں کی آبادی بولتی ہے اُسے سراجی کہا جاتا ہے۔ محمد اشرف زرگر ''انوار فریدیہ'' میں شائع ایک مضمون ''سراج: ماضی اور حال کے آئینے میں'' علاقہ سراج کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پرستان پوگل سے لے کر محالہ وگندنہ تک کا یہ خطہ راجاؤں مہاراجوں کی

ستم کاریوں سے محفوظ رہا۔ کچھ لوگ اسے سہ راج (تین راج) کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ سراج اصل میں سیراج (تیس راج) ہے اور کچھ سوراج (آزاد یا خودمختار) کہتے ہیں۔ لیکن علاقے کے بزرگوں کے مطابق سراج سراز کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ وادیٔ کشمیر آج بھی تین خطوں کمراز، مراز اور یمراز میں منقسم ہے۔ اسی طرح کشمیری لوگوں نے اس خطہ کو سراز کہا جو آگے چل کر سراج ہو گیا۔''

فرید احمد فریدی اپنے مضمون ''سراج۔ ایک ثقافتی اور لسانی جائزہ'' میں لکھتے ہیں کہ:۔

''علاقہ سراج نتوارہ سے شروع ہو کر رام بن کے گاؤں زون دھار پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن بارشلا کا مشرقی علاقہ جو کافی دور تک غیر آباد ہے اُس کے آگے نتواڑہ کے گاؤں آباد ہیں، اگر چہ سراجی بولتے ہیں لیکن اُن پر کشتواڑی ثقافت کے اثرات نمایاں ہیں''۔

اُدھر سی۔ ای۔ بیٹس ''اے گزیٹیر آف کشمیر'' میں لکھتے ہیں کہ:۔

''سراج اُس ضلع کا نام ہے جو صوبۂ کشتواڑ کے مغرب میں واقع ہے۔ لدر نالہ اس کے بیچوں بیچ گزرتا ہے اور دوڈہ سے درّہ براری تک جانے کا راستہ یہاں سے ہی گزرتا ہے''۔

ڈوگرہ شاہی اہلکاروں کی آمد و رفت کی بدولت سراج کا مشرقی علاقہ بالخصوص جودھپور اور محالہ دیہات ڈوگرہ کلچر کے گرویدہ ہو گئے۔ ڈوگرہ اور سراجی کے میل جول نے سراجی بولی میں قدرے بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اُدھر مشرقی سراج کا علاقہ بھدرواہی بولی سے زیادہ قریب ہے۔ محالہ اور جودھپور یا بارشلا کے دیہات ڈوڈہ سے زیادہ بھدرواہی علاقوں کے قریب ہیں۔ اس لئے ان علاقوں میں سراجی بولی میں بھدرواہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ علاقہ دلیسہ کے زن و مرد سراجی تو بولتے ہیں لیکن ہر کلمہ فصل کے آخر پر ''سِس'' کا ایک صوتی ٹکڑا جوڑتے ہیں۔ مثلاً تو کُو کرا سِس (تم کیا کر رہے ہو)۔ سراجی بولی میں ادب یا آداب کے لئے کلمات مفقود ہیں۔ علاقہ دلیسہ کی سراجی میں اس کا اہتمام ہے مثلاً

"دتس گو کراستھ"۔ جس سے مشرقی سراجی بولی میں بھدرواہی بولی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح دلیسہ کی سراجی میں پوگلی بولی کے الفاظ عام ملتے ہیں۔ وادیٔ لدر سے گلہ دھار کے ساتھ ساتھ راج گڈھ اور ہالہ سے آگے رام بن کے عین بالائی دیہات تک اسی نوع کی سراجی بولی کا چلن ہے۔ سراجی بولی ضلع ڈوڈہ کی اہم بولیوں میں سے ایک ہے۔ فریڈرک ڈریو نے درمیانی پہاڑی سلسلے میں مروج بولیوں کو کشمیری زبان سے مستند قرار دیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ جیسے ڈوگری ہندی کے قریب ہے اسی طرح پہاڑی بولیاں رام بنی، بھدرواہی، پاڈری، کشتواڑی اور سراجی کشمیری زبان کی پڑوسنیں ہیں۔ اُن کے مطابق رام بنی، ڈوگری اور کشمیری کے درمیان واقع ہے جبکہ بھدرواہی، پاڈری، کشتواڑی اور سراجی اس درمیانی پڑاؤ سے کافی آگے کشمیری زبان کے قریب ہیں۔

سراجی بولی لوک ادب کے خزانے سے مالا مال ہے۔ اس بولی کے قدیم شاعروں میں سے تقریباً سبھی گمنامی کی حالت میں فوت ہوگئے۔ تاہم پرانے سراجی شاعروں میں سے مرحوم وانی عبدالرحیم گراٹال کے گیت ابھی تک علاقہ سراج میں مقبول ہیں۔ اُن کے ایک گیت کے کچھ شعر پیش ہیں۔

گیت

نالہ چھے قمیض تے دُرگہ ٹاکی
سونڑو انٹر گنگو مینوں نبڑو ڈاکی
ہیر بُھے موگٹو تو ہنسی چھتہ راہ
مالنڑہ کَھی تولے تولکہ تہ چاہ
کوہوے تو نہرے کی راکھی
سوہنڑوانٹر گنگو مینوں نبڑ ڈاکی
چل بھئی موگٹو گھام کاسی

مٹھرو ته بستو اِپی آسی
سَرولی لامے پوشاکی
سونٹر وانٹر گنگو مینیوں نبڑ ڈاکی

شورین بوبچھو صوبے رانو
تنیِ کھادو ھوڑ لنو تے کھانو
تیلہ پتہ کھرے نہ بوای تھاکی
سونٹر وانٹر گنگو مینیوں نبڑ ڈاکی

دورِ جدید میں ٹھاکر چڑھت سنگھ (دھندل)، جگد یوسنگھ (شامٹھی)، ہری چند کیسری (ٹاپ نیل)، بشیر احمد شاہ (جیٹھلی پریم نگر)، تلک راج شرما (پریم نگر)، جے مل سنگھ (بیجارنی بھاگواہ)، گنڈاسنگھ (کالستی گڈھ)، لال دین بٹ (ٹاپ نیل) اور جگدیش راج (پریم نگر) وغیرہ سراجی شعروادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کی ڈوڈہ شاخ کی طرف سے سراجی زبان کے مشاعروں کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ نئی نسل کے تخلیق کاروں نے سراجی ادب کو بہت زرخیز کیا ہے۔

گدی اور پسی قبائل

گدی اور پسی لوگ خالصتاً قبائلی زندگی گزارنے والے شمالی صوبۂ جموں کے اہم قبائل ہیں جن کی الگ پہچان ہے اور عہد قدیم میں ٹھوس آریائی قبائل کی زندگی گزارتے ہیں۔ گدی اور پسی قبائل کا اصل وطن چمبہ ہے جہاں سے ان کے کاروان مختلف ادوار میں راوی عبور کر کے صوبۂ جموں کے جنوب مشرقی حصوں میں داخل ہوئے اور بسوہلی، بھدرواہ، کشتواڑ، ڈوڈہ، رام نگر، بسنت گڑھ اور اودھم پور کے کچھ علاقوں تک پھیلتے چلے گئے۔ روایت ہے کہ یہ لوگ گندھار سے ریوڑ چراتے چراتے ہماچل پردیش میں داخل

ہوئے اور پھر وہاں سے علاقہ جموں میں آئے۔ ان میں سے وہ لوگ جن کے بڑے بڑے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں اور جو کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ گدی کہلاتے ہیں اور جو خاندان ریوڑ چراتے اور ان کی حفاظت کرتے ہیں وہ سپی کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اہم پیشہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پالنا اور مویشیوں کے چارے کی تلاش میں نقل مکانی کرنا ہے۔

جموں کے گدی قبائل ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بہار کی آمد میں اپنے خاندانوں اور بھیڑ بکریوں کے کاروانوں کے ساتھ بسوہلی، بھدرواہ، کشتواڑ، پاڈر، ڈوڈہ اور رام نگر کے بالائی پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور پڑاؤ در پڑاؤ قیام کرتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں اور جون کے وسط تک یہ اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کھلی چراگاہیں، معتدل موسمی حالات اور آزاد زندگی ان کا استقبال کرتی ہے۔ ستمبر تک بالائی ڈھوکوں مرگوں میں قیام کے بعد گدی اور سپی واپس گاؤں اور کنڈی علاقوں کی طرف لوٹنا شروع کرتے ہیں اور سردیوں کا موسم چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں میں واقع چراگاہوں میں گزارتے ہیں۔

گدی قبائل کی اپنی زبان ہے جسے وہ گدی یا گاڈی کہتے ہیں۔ یہ زبان مغربی پہاڑی گروہ کی ایک شاخ ہے۔ اس زبان کو ہماچل میں برموری بھی کہا جاتا ہے۔ اس زبان کا رسم الخط ٹاکری رہا ہے جس میں پرانے زمانے کا مواد دستیاب ہے لیکن زیادہ تر ادب لوک گیتوں اور لوک کہانیوں پر ہی مبنی ہے۔ اُن کے لوک گیت بڑے میٹھے اور لبھاؤنے ہوتے ہیں اور ہمسایہ پہاڑی زبانیں بولنے والے لوگ انہیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں جیسے یہ بند پیش ہیں۔

وے گدیا چمبے رہیا
توں اجڑیا شہر لاہوروں
تے سرولیاں آبرہمو
او گدیا چمبے رہیا

(اوچمبے کے باسی گدی تو لاہور شہر سے اجڑا اور اب برہمو میں آباد ہوا)

ہوں رولی میرے چکن ری

کچھی وہ برّیا بھلے ہو

ھوں کچھی تاتروئی تروئی

دل را پر تین ہو

(مجھے میرے سجن کی یاد آ رہی ہے۔ یہ بہار کیسے بھولے گی جب تو دُور ہے لیکن دل کے نزدیک ہے شاید پہاڑوں میں کھو گیا ہے۔ یہ بہار کیسے بھولے گی)

ہابر اہنڈا جھنگر راجی نا

وہ بریا بھلے ہو

(اس موسم میں تو واپس لوٹ آئے تو بہار اور بھی خوبصورت ہو جائے)

شہر بزار میں بیڑیاں بکھاؤں

چچورے میرے لائیو

مہنگا بسھوں ہے کانھو لیو

بھائیورے لیہ لائیو

(شہر کے بازار میں بیڑیاں بک رہی ہیں۔ میرے چاچا میرے لئے لانا۔ بہت مہنگا ہے۔ کیسے خریدوں۔ میرے بھائی میرے لئے لانا)

گدی پسی قبائل اگر چہ الگ الگ علاقوں میں سکونت کرتے ہیں لیکن ان کی ماں بولی گدی زبان نے ان کو آپس میں جوڑا ہوا ہے۔ یہ لوگ ناچ گانے کے شوقین ہیں اور شادی بیاہ پر ان کے اپنے ناچ ہوتے ہیں۔

گدیوں کے روایتی مکانات کشادہ ہوتے ہیں۔ گھر کے اہم کمرے کو ''بھور'' کہتے ہیں جہاں خاندان زیادہ تر وقت گزارتا ہے۔ اس کمرے کے کونے میں رسوئی اور

نہانے کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ پانی گرم کرنے کے لئے ''ہار پوز'' میں رکھا جاتا ہے۔ بھور کے سامنے بالکونی یا برآمدہ ہوتا ہے جسے ''دراگرا'' کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ کام کاج کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ گھر ایک سے زیادہ منزلہ ہوتا ہے اور کھڑکیوں کی جگہ دائرہ نما سوراخ ہوتے ہیں جنہیں ''ٹوہو'' کہا جاتا ہے۔ شادی بیاہ اور تہواروں کے موقعوں پر گھر کے باہری حصے پر بیل بوٹے اور رنگ دار تصویریں بنا کر اُسے سجایا جاتا ہے۔ مکان پتھر، مٹی اور لکڑی کے استعمال سے بنائے جاتے ہیں۔ گدی خاندانوں کے لوگ گھر بنانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مکان کے نواحی علاقے میں جانوروں کے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ جبکہ مکان بناتے وقت ایک خاص جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جہاں مذہبی چلے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اب گدی لوگ دھیرے دھیرے گاؤں اور شہروں میں آباد ہو رہے ہیں اور گھروں کو ریت، سیمنٹ اور سریا کے استعمال سے عام گھروں کی بنیاد بناتے ہیں۔

گدیوں میں دن میں تین وقت کھانا کھایا جاتا ہے۔ صبح کے ناشتے کو نہاری کہا جاتا ہے جس میں وہ رات کے پکے ہوئے کھانے میں تازہ دودھ اور مکھن ملا کر کھاتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کو دوفیری کہا جاتا اور رات کو 'سانجھ کی روٹی' کہتے ہیں۔ عام طور پر مکی کی روٹی، دال، بھوجری وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے لیکن اب گدی لوگ جو مکمل طور پر سکونت اختیار کر چکے ہیں وہ صوبۂ جموں میں کھائی جانے والی عام خوراک کا استعمال کرتے ہیں۔

گدی تمام تر ہندو قبائل ہیں۔ ان میں برہمن، راجپوت، ٹھاکر، کھتری، رزماپسی، اہیر وغیرہ ذاتیں آتی ہیں۔ برہمن لوگوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے جو شادی بیاہ کراتے اور دوسری رسومات ادا کرتے ہیں۔ گدی شِو جی کے پُجاری ہیں اور ان کے اپنے مندر ہوتے ہیں۔ عام طور پر گاؤں میں ان کے گھر مندروں کے قریب ہوتے ہیں۔ سال میں ایک بار گدی قبائل کو اکٹھا ہونے کا موقع ملتا ہے اور یہ موقع مچھل یاترا پر انہیں حاصل ہوتا ہے۔ آجکل گدی لوگ مچیل یاترا اگست کے مہینے میں پکاڈنگہ جموں سے نکالتے ہیں جس میں دور دور سے آئے ہوئے گدی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تاترا جموں سے نکل کر چنڈی دیوی مندر

مچیل تک جاتی ہے۔
پرانے وقتوں میں لوگ اونی کپڑے پہنتے تھے اور پٹو کے لمبے لمبے چوغے اور پاجامے زیب تن کرتے تھے۔ اونی کمر بند اور اونی جرابیں استعمال کرتے تھے جبکہ عورتیں شلوار قمیض پہنتی ہیں اور اُن کا لباس ہمسایہ ڈوگرہ قبائل سے ملتا تھا۔ فرق صرف ٹوپی کا تھا۔ گدی لوگ سر پر کنٹوپ نما ٹوپی کا استعمال کرتے تھے۔ آجکل اس لباس کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

بازی گر

صوبۂ جموں کے ڈوگر علاقے میں بازی گر (مداری یا کرتب دکھانے والے) لوگوں کا ایک گروہ بھی آباد ہے جو اپنے کھیل تماشوں سے عوام کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مقامی نہ تھے باہر سے آ کر یہاں کرتب دکھاتے تھے مگر دھیرے دھیرے عوام نے اس گروہ کو اپنی تمدنی زندگی کا حصہ بنالیا۔ انہیں گاؤں اور بستیوں کی خالی جگہوں میں رہنے کے چھپر یا تمبو لگانے کی اجازت دی تا کہ ان کھیلوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ڈوگر علاقوں میں ان لوگوں کو عوام سے اتنا پیار ملا کہ یہ لوگ اصلی وطن بھول گئے اور یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ آزادی کے بعد ان لوگوں نے رہنے کے لئے زمین کا مطالبہ کیا۔ انہیں زمینوں کے چھوٹے چھوٹے قطعے الاٹ کرائے گئے مگر انہیں ملکیت کا حق نہ دیا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے گھر کوٹھے بنائے۔ کھیتی باڑی بھی شروع کی اور کرتب دکھا کر اپنا گزارہ کرنے لگے۔ اس وقت ڈگر علاقہ اودھمپور، جموں، اکھنور وغیرہ میں بازی گروں کی بستیاں موجود ہیں اور یہ لوگ اب بازی گری کے علاوہ دوسرے شعبوں سے بھی وابستہ ہو چکے ہیں۔ بازی گر نسل کے لحاظ سے منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ سانولہ، بال کالے، جسم چھریرہ اور پھرتیلا، ناک تیکھی، آنکھ کالی، گال پچکے ہوئے اور کمر لچکدار ہوتی ہے۔ یہ لوگ دوڑ لگانے میں ماہر

جانے جاتے ہیں۔جسم کی بناوٹ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ بازی گر درجہ فہرست قبائل کا حصہ ہیں۔

مذہب کے لحاظ سے بازی گر دو حصوں میں منقسم ہیں یعنی ہندو اور مسلمان۔ مسلمان بازی گروں کی اہم بستیاں سینی، نگروٹہ، جھجہ واتلہ، اودھمپور میں بٹل بٹیان، ڈڑواہ، رٹھیان، رام بن میں کنیال، جندرہ کا پوتا، جندرہ مجالتہ، سلہ پتیاس، ریاسی میں جگانوں اور نمی میں ان کے گھر اور بستیاں ہیں۔لیکن اکثر وہ جگہ بدلتے اور نقل مکانی کرتے رہتے ہیں۔

ہندو بازی گر پورلا کالوٹ (25 گھر)، پونی ریاسی (12 گھر)، براوری ریاسی (12 گھر)، اکھنور نزدیک کا میشور مندر (125 گھر)، سکار (40 گھر)، دیہارن (40 گھر)، مشری والا (40 گھر)، پرکھو (20 گھر)، کوہ منہاساں (35 گھر)، باغ بہو (100 گھر)، کھلیسال جموں (35 گھر)، سرور (60 گھر)، سلاتھیہ موڑ (35 گھر)، وجے پور (25 گھر)، رتنال (25 گھر) آباد ہیں۔

اگرچہ دورِ جدید میں بازی گری کے کرتب دوسرے مقامی مشاغل کی طرح عوام کی توجہ کا زیادہ مرکز نہیں رہے اور بازی گری کے پیشے کو سخت دھکا لگا ہے۔اس کے باوجود بازی گروں نے اپنا روایتی ہُنر جاری رکھا ہوا ہے جو اُن کی الگ شناخت ہے۔ پہلے ہندو اور مسلمان بازی گروں کا ذریعہ معاش کرتب کرنے اور کھیل تماشے دکھانے پر منحصر ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ ڈگر دیہات میں عوام کی دل جوئی کیا کرتے اور جو حاصل ہوتا اس سے پیٹ پالتے تھے۔ان کے کھیل نہایت مشکل ہوتے تھے۔ یہ دو بانسوں کے درمیان رسی باندھتے تھے اور پھر اُس رسی پر چلتے تھے۔کبھی دوسرا بانس پکڑ کر اس کو پھلانگتے تھے۔کبھی رسی پکڑ کر نیچے لٹکتے تو کبھی اوپر چڑھتے تھے۔اُن میں سے ایک آدمی بانس پکڑ کر کھڑا ہوتا تو دوسرا اُس کے کندھے پر چڑھتا۔ پھر تیسرا دوسرے کے کندھے پر سوار ہوتا۔ پھر تیسرا بازی گر پہلے بازی گر کے پکڑے ہوئے بانس کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر بہت اونچے چڑھ کر نمائش بینوں کو محظوظ کرتا۔اس کھیل کو دیکھ کر سب حیران ہو جاتے تھے۔ رسی پر چلنے کے کھیل کو یہ ڈھولا چڑھنا کہتے ہیں جو نہایت خطرناک کھیل ہے۔اس کے علاوہ بازی لگانا، اُلٹی چھلانگیں لگانا،

لوہے کے گول چکر سے جسم کو آر پار کرنا، گانا بجانا، دیوی دیوتاؤں کی بھینٹیں گانا، کافیاں گانا ان کے اہم مشغل رہے ہیں۔ لیکن آج کے دور میں دل جوئی کے انداز بدل چکے ہیں لوگوں کا ڈگر علاقے کے اس روایتی کرتب کی طرف رجحان کم ہورہا ہے اور یہ لوگ اپنا کاروبار بدلنے پر مجبور ہورہے ہیں۔ اب یہ لوگ بازی گری کے علاوہ زراعت، مزدوری، بُت تراشی سے بھی روزی روٹی کماتے ہیں۔

مسلمان بازی گروں نے گجر لقب اختیار کرلیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گجر درجہ فہرست قبائل کے زمرے میں آتے ہیں جبکہ بازی گر درج فہرست ذاتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کئی سال پہلے ان کے خاندانوں میں راجہ منڈ لیک کی پوجا ہوتی تھی لیکن اب یہ روایت ختم ہوچکی ہے۔ کئی بازی گروں کی سنگیت کے ساتھ رغبت ہوا کرتی تھی جبکہ دوسرے بھیڑ بکریوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ بازی گری کے ہُنر میں جنہوں نے نام کمایا اُن میں کلو، بلا شیرا، حاجی طالب حسین، حاجی چراغ علی، چھتو، حسنہ اور گیت کار ہاشم دین کا بڑا نام ہے۔

ہندو بازی گر پانچ ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں یعنی ستم شوت، سلہ، بتیسے، شال، منانے۔ ان میں سے کئی کا گوتر گویار ہے۔ کئی دُھبے اور لس کالیہ برہمن بھی کہلاتے ہیں۔ جنم سے پہلے خاندان میں کوئی سنسکار نہیں ہوتا۔ بچے کے پیدائش پر اُسے گھڑی دی جاتی ہے۔ ساتویں روز ودھانی ہوتی ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے اور حلوہ تقسیم ہوتا ہے۔ ایک سے پانچ برسوں کے درمیان دھمان ہوتا ہے جس میں برادری بلاکر چار بوتلیں شراب کی پیش کی جاتی ہیں جو لڑکے کے ننہال والے دیتے ہیں۔ اس دن گانا بجانا اور ناچ ہوتا ہے اور لڑکے کو بازی گر سماج کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ پہلے مختلف قسم کی شادیاں ہوتی تھیں۔ لڑکیوں کو خریدا بھی جاتا تھا۔ بٹا میں لڑکیوں کی ادلا بدلی بھی ہوتی تھی۔ اس رسم کو دواٹھی کہتے تھے۔ لیکن اب ہندو رواج کے تحت لڑکی کا کنیا دان ہوتا ہے اور ہندو رسم ورواج کے تحت مرنے والے کو جلاتے ہیں۔ بازی گروں کی اپنی پنچایت ہوتی ہے جو طلاق، لڑائی، جھگڑے اور دوسرے معاملوں میں فیصلے کرتی ہے۔

میراثی

میراثی لفظ کا ماخذ میراث ہے۔ میراث تمدنی ورثے کی علامت مانی جاتی ہے۔ صوبۂ جموں میں وہ لوگ جنہوں نے عوامی لوک ورثے کو سنبھالے رکھا، لوک موسیقی کو فروغ دیا اور اس فن کو اپنا پشتنی پیشہ سمجھ کر آگے بڑھایا وہ 'میراثی' کہلائے جن کی اکثریت مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پرانے وقتوں میں صوبۂ جموں کے خاص پہاڑی علاقوں میں دل جوئی کے وسائل بہت کم میسر رہے ہیں اور میراثی ہی وہ طبقہ تھا جو اپنے فن کے ذریعے عوام کی دل جوئی کیا کرتا تھا۔ عوامی زندگی میں میراثیوں کا اہم رول ہوتا تھا۔ شادی بیاہ ہوں، ختنہ یا منڈن ہو، میلے تہوار ہوں میراثیوں کے بغیر ادھورے سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ میراثی مرد عورتیں گھر گھر جا کر عوام کو لوک گیت اور لوک باریں سناتے، ناچتے گاتے، ہنسی مذاق کرتے اور لوگوں کا دل بہلایا کرتے تھے۔

صوبۂ جموں کے خطہ پیر پنچال کے علاقہ پونچھ، راجوری، بُدھل، مینڈھر، سورن کوٹ اور کنٹرول لائن کے اُس پار بھمبر، میر پور، کوٹلی، سدھنتی اور باغ کے ہر گاؤں میں میراثیوں کے گھر اور محلے ہوا کرتے تھے جو اپنے مخصوص سازوں یعنی ڈھول شہنائی (ٹوٹا) اور سارنگی کے ساتھ لوک گیت اور لوک باریں سناتے اور ان کی عورتیں شادیوں میں گانے کے علاوہ ناچ دھمال بھی کیا کرتی تھیں جس سے بیاہ والے گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ شادی بیاہ میں میراثی کئی کئی دن پہلے آ جاتے اور اپنے فن سے بیاہ میں شامل ہونے والوں کا دل بہلایا کرتے تھے۔ میلوں اور تہواروں میں علاقہ بھر سے میراثی اکٹھے ہوتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ ادھر گھاس کاٹنے کے وقت 'لیتری' ہو یا پھر شالی کے پودے لگانے کے وقت 'لیب' ہو میراثی ڈھول بجا کر کام کرنے والوں کو جوش دلایا کرتے تھے۔ میراثی ہمارے مخلوط کلچر اور سانجھی وراثت کی علامت مانے جاتے تھے اور اُن کے گائے ہوئے گیت کسی خاص مذہب سے جڑے ہوئے نہ ہوتے تھے بلکہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے

مشترکہ کلچر کے عکاس ہوا کرتے تھے کیونکہ میراثی عام طور پر محبت، جدائی، فصلوں سے جڑے گیت، شادیوں کی مشترکہ رسموں یعنی سہرا، سرمہ، سکڑا، ڈولی اور علاقے کے سرفروشوں کی داستانیں یعنی باریں سُنا کر دل جوئی کرتے تھے۔

میراثیوں کے گھر اور محلے ہر گاؤں میں ہوا کرتے تھے اور گاؤں کے ہر خاندان کا حق اُن پر مانا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر زمین دار فصل کی کٹائی کے وقت کھلیان سے ہی میراثیوں کا حصہ الگ کر دیتے تھے جسے کھلین کہا جاتا ہے۔ یہ کھلین ہی میراثیوں کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا تھا جو وہ ہر کسان سے وصول کیا کرتے تھے۔ یہ کھلین شالی یا مکی کی صورت میں دی جاتی تھی اور پھر سارا سال وہ گاؤں میں گانا بجا کر عوام کی دل جوئی میں محو رہا کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ میراثی لوک ورثے اور تمدن کی علامت ہوتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ میراثی ہی تھے جنہوں نے لوک شاعری کو سنبھالا ہوا تھا۔ لوک گیتوں کو آگے بڑھا رہے تھے اور لوک باروں (Ballad) سے علاقے کے تاریخی پس منظر سے عوام کو روشناس کرایا کرتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ لوک ورثے میں مناسب تبدیلیاں بھی کیا کرتے تھے تاکہ لوک ورثہ تازہ اور نو بہ نو رہے۔ وہ بہادر اور سرفروش جو وطن کے دفاع کے لئے برسرِ پیکار رہے اور لڑتے لڑتے شہید ہوئے اُن کی باریں بنانا بھی میراثیوں کے ذمے ہوتا تھا اور وہ منہ زبانی تاریخی کرداروں کی نظمیں تیار کر کے عوام میں پیش کیا کرتے تھے۔ صوبۂ جموں میں بار ڈیڈو (ڈوگری)، بار شمس خان (پہاڑی)، بار جندا (پہاڑی)، بار نورہ (گوجری)، بار جنگ باز اور ڈھنڈی (گوجری) کی طرح کئی باریں میراثیوں کی دین ہیں جن سے علاقے میں وطن پر مر مٹنے والوں کا صرف پتہ نہیں چلتا بلکہ ان باروں سے تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میراثیوں کی باریں ہماری تمدنی میراث کا اہم حصہ رہی ہیں۔

میراثیوں کے گیت سنگیت کا سلسلہ مسلمان اور ہندو راجاؤں کے دور میں مسلسل جاری رہا ہے اور ان کو شاہی درباروں تک رسائی حاصل ہوا کرتی تھی۔ لیکن دورِ جدید کے

نئے وسیلوں کے باعث میراثیوں کےفن پر زبردست مُضر اثرات رونما ہوئے ہیں اور یہ لوگ اپنےفن سے ہی نہیں بلکہ علاقوں سے بھی کٹ گئے ہیں۔

ایک بار پونچھ کے قریب میراثی محلّہ میں ایک بوڑھی میراثن نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا ''ہم بڑے خوش حال اور خوش باش لوگ ہوا کرتے تھے۔ بیاہ کسی گھر میں ہو خوشیاں ہمارے گھروں تک آجاتی تھیں کیونکہ ہر شادی بیاہ اور میلے تہوار میں ہمارا ہونا لازمی ہوتا تھا۔اس طرح ہمارے گھروں میں تقریباً ہر روز شادی بیاہ کا ماحول بنا رہتا تھا جہاں ہمیں اپنےفن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا وہیں دعوتیں کھانے میں بھی ہمیں شامل کیا جاتا تھا۔ہم لوگ اپنےفن اورعوام کی محبت سے نہایت خوبصورت زندگی جی رہے تھےلیکن حالات نے پلٹا کھایا۔'' چنانچہ گاؤں میں اُن کے لئے روزی روٹی کا مسلہ بن گیا تو مراثیوں نے یا تو صدیوں پرانا پیشہ چھوڑ کر مزدوری اور دوسرے کام کرکے پیٹ پالنا شروع کیا یا پھر اپنے گاؤں سے ہجرت کر گئے۔اس کے باوجود کچھ خاندان ایسے تھے جنہیں اپنے ہُنر،فن اور وراثت پر ناز تھا وہ فن تو نہ چھوڑ سکے لیکن اپنے گاؤں اور علاقے چھوڑ دیئے اور پونچھ کے قریب لاکھا ڈھیری کے ٹیلے کو کھود کر اپنے گھر کوٹھے بنا کر رہنے لگے اور گانے بجانے کا پیشہ جاری رکھا۔ آگے چل کر یہ جگہ میراثی محلّہ سے منسوب ہوئی ہے۔ یہاں آج بھی گاؤں سے اُجڑ کر آئے ہوئے میراثی سکونت کرتے ہیں اور پونچھ شہر میں شادیوں کے موقع پر ساز بجاتے ہیں اور جہاں بھی موقع ملتا ہے لوک گیت، لوک باریں اور ناچ گانے پیش کرتے ہیں۔لیکن ان فن کاروں کی اقتصادی زندگی اتنی خستہ ہے کہ ان کو اکثر دوسرے کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اورعورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرکے پیٹ پال رہی ہیں۔اب چند فنکار ہی ایسے بچے ہیں جو اس ہُنر کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میراثیوں کی شیرازہ بندی ہو، ان کےفن کی پذیرائی ہو، ان کے ہُنر کی عکس بندی اور صدابندی کی جائے اور ان کی مالی معاونت کی جائے تاکہ وہ اپنے روایتی پیشے اور گانے بجانے کے ہُنر کو آگے بڑھا سکیں۔

......☆......

مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

(دورِ جدید کی آندھی میں پامال ہوتا ہوا تمدنی ورثہ)

لوک ساز

مثل مشہور ہے کہ موسیقی سے روح کوسکون ملتا ہے اور تھکے ہوئے ذہن کوراحت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے جینے کے لئے جس طرح کھانا پینا ضروری ہوتا ہے ایسے ہی روحانی تسکین پانے کے لئے کچھ من پسند سازوں کی موسیقی بھی ضروری ہوتی ہے۔ دنیا جب سے شروع ہوئی تب سے گیت گانے کا چلن ہوا۔ ساتھ میں سُر، لے اور تان بھی جڑ گئے جو دوسرے الفاظ میں موسیقی کے زمرے میں آتے ہیں۔ دنیا کے ہر علاقے کا اپنا لوک سنگیت ہوتا ہے جسے لوگ فرصت کے لمحوں میں بجاتے اور ایک دوسرے کی دل جوئی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح صوبۂ جموں کے عوام کے بھی کچھ اپنے ساز ہیں جن سے سنگیت تیار کر کے روح کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کے مشہور سازوں میں بانسری، الغوزہ اور جوڑی ہیں جو انفرادی طور پر لوگ بجاتے ہیں۔ بانسری کے اور چھ سوراخ ہوتے ہیں جبکہ ایک سوراخ سے پھونک ماری جاتی ہے اور باقی سوراخوں پر انگلیوں سے سُر نکالے جاتے ہیں۔ یہ ساز لکڑی کا بھی ہوتا ہے اور پیتل کی بانسری بھی ہوتی ہے۔ یہ ساز سریلی آواز والا ہوتا ہے اور اسے عام طور پر جموں کے میدانی، پہاڑی اور کنڈی علاقوں میں لوگ بجاتے ہیں۔

الغوزہ:

بانسری سے ملتا جلتا ساز ہے۔ اس کے سوراخ بھی چھ ہوتے ہیں۔ یہ لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اس میں پھونک سوراخ سے نہیں ماری جاتی بلکہ اس کا سر قلم کے خط کی

طرح تراشا جاتا ہے۔ پھراس میں لکڑی یا نرم پودے کی جیبھ ڈالی جاتی ہے جس میں ہوا گزرنے کا راستہ ہوتا ہے۔الغوزہ صوبہ جموں کے پہاڑی علاقے کا مقبول ساز ہے۔

جوڑی:

دو الغوزوں کو جوڑ کر جب اُسے بجایا جاتا ہے تو اسے جوڑی کہتے ہیں۔ جوڑی ڈھوکوں، مرگوں اور پہاڑی علاقوں میں پہاڑی لوگ اور درج فہرست قبائل بجاتے ہیں۔

بانسری جوڑی اور الغوزہ کی تان اکثر گاؤں میں گونجتی ہے۔ پرانے وقتوں میں رات کے وقت نوجوان فصلوں کی درندوں سے رکھوالی کرنے کے لئے جاگتے تھے اور بانسری یا الغوزہ پر پہاڑی تان چھیڑ دیا کرتے تھے۔ یہ تان سارے علاقے میں گونجتی تھی اور گھر بیٹھے ہوئے لوگ روح کی تسکین حاصل کیا کرتے تھے۔ بانسری، الغوزہ اور جوڑی محبت کرنے والے اپنے محبوب کا دل رجھانے کے لئے بھی چھیڑا کرتے تھے جو محبوب کا دل روحانی سرور سے بھر دیتی تھی۔اس طرح یہ ساز گاؤں میں محبت کے اظہار کا وسیلہ بھی ہوتے ہیں۔ بانسری، الغوزہ اور جوڑی کنٹرول لائن کے دونوں طرف صوبۂ جموں کے علاقہ میں مقبول ہے۔

سارنگی:

صوبۂ جموں کا ایک اہم ساز ہے جو جموں، راجوری، پونچھ، بھدرواہ، کٹھوعہ اور کنٹرول لائن کے اُس پار بھمبر، کوٹلی، راولاکوٹ، میر پور اور باغ کے ہر گاؤں میں مقبول ہوتا تھا۔ اس ساز کو میراثی لوگ بجاتے تھے۔تقریباً ہر گاؤں میں میراثی ہوتے تھے، جو اسے بجا کر اس کی تان پر لوک گیت، باریں اور کارکیں سُنا سُنا کر عوام کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ میراثی سارنگی کی لے پر وہی گیت شروع کرتے ہیں جو عوام میں مقبول ہوتے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے دور سے قبل میراثی گھر گھر گھوم کر سارنگی بجاتے اور لوک گیت سُنایا کرتے

تھے۔اس طرح عوام اپنے تمدنی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ جڑے رہتے تھے اور عوض میں میراثیوں کو سالانہ جنس کے طور پر اُن کی اُجرت دی جاتی تھی۔اگر یہ کہا جائے کہ صوبہٗ جموں کی تمدنی میراث کو آگے بڑھانے کے لئے میراثیوں اور سارنگی سازوں کا اہم رول رہا ہے تو غلط نہ ہوگا۔اگر چہ نئے دور کی دھول میں ہمارا روایتی سازینہ دھندلا ہوا ہے لیکن آج بھی میلے،تہواروں اور شادیوں میں میراثی سارنگی کی تان پر جب کوئی لوک گیت یا لوک بار گاتے ہیں تو لوگ ہمہ تن و گوش اُسے سنتے اور لطف اُٹھاتے ہیں۔

ڈھول:

ڈھول جسے صوبہٗ جموں میں ٹھول کہا جاتا ہے یہاں کی تمدنی میراث کی علامت مانا جاتا ہے۔ٹھول صوبہٗ جموں میں کنٹرول لائن کے دونوں طرف ایک جیسا مقبول ساز ہے۔اسے شادیوں میں،تہواروں کے موقعوں پر،میلوں ٹھیلوں میں، لیتری یعنی گھاس کی کٹائی کے وقت،کڑیاں (یعنی جنگل سے مکان کے لئے شہتیر لاتے وقت) بنی پکڑنے کے وقت، بگدر (یعنی پتھر اُٹھاتے ہوئے) کھیل کے وقت یا پھر جانوروں کی لڑائیوں کے وقت عموماً بجایا جاتا ہے۔جموں کے علاقوں میں لوہڑی کے تہوار پر جب چھجے کی جھانکی نکالی جاتی ہے یا پھر ہولی کھیلی جاتی ہے تو ڈھول بجا کر جوش اور جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔

ڈھول عام طور پر گاؤں میں میراثی لوگ بجاتے ہیں جبکہ ٹھول کی چھوٹی قسم جسے ڈھولکی کہا جاتا ہے۔شادیوں کے موقعے پر لڑکیاں ڈھولکی لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور پھر اس کی تھاپ پر اپنی پسند کے گیت گا گا کر بیاہ والے گھر میں سماں باندھ دیتی ہیں۔ڈھولکی کا استعمال مندروں میں بھی ہوتا ہے جہاں عقیدت مند ڈھولکی کی تھاپ پر بھجن کیرتن کرتے ہیں۔ڈھولکی کو ہاتھ سے بجایا جاتا ہے جبکہ ڈھول کو لکڑی سے بنائی گئی تیلی سے اور 'ایل' کی شکل والے ایک ڈنڈے سے بجاتے ہیں۔بڑے ڈنڈے کو ڈنڈا جبکہ چھوٹے ڈنڈے کو ''چھٹی'' کہا جاتا ہے۔

سُرنائی یا ٹوٹہ:

سُرنائی صوبۂ جموں کا ایک اور مقبول ساز ہے جسے میراثی بجاتے ہیں۔ یہ صوبہ جموں میں کنٹرول لائن کے دونوں جانب عوام کا من پسند ساز ہے۔ کئی جگہ اسے ٹوٹہ بھی کہتے ہیں۔ یہ آلہ آم یا ٹاہلی کی لکڑی سے تیار ہوتا ہے اور میراثیوں میں ہی کچھ لوگ یہ ساز تیار کر لیتے ہیں۔ اس کا آگے والا حصہ کُھلا ہوتا ہے جبکہ پیچھے والا حصہ الغوزہ کے برابر ہوتا ہے۔ اس میں بھی سُر نکالنے کے لئے سوراخ ہوتے ہیں اور منہ کے قریب والے حصے میں لکڑی کی جیب لگی ہوتی ہے جسے میراثی لوگ رِیٹ کہتے ہیں۔ سرنائی عام طور پر ڈھول کے ساتھ بجائی جاتی ہے۔ شادیوں میں رنگ جمانے کے لئے سرنائی کی گونج اور پہاڑی اور ڈوگری دُھنوں پر تانیں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جموں کے علاقہ ڈگر اور پہاڑ میں کوئی شادی سرنائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی جبکہ میلے تہواروں میں بھی ڈھول کے ساتھ ساتھ سرنائی بجائی جاتی ہے۔ شادیوں کے علاوہ منڈن اور ختنہ کے موقعہ پر بھی یہ ساز بجا کر علاقے میں دھوم مچائی جاتی ہے۔ اصل میں سرنائی اور ڈھول کا آپس میں نزدیکی رشتہ ہے اور دونوں کے ساتھ سے علاقہ ڈگر کا تمدنی ورثہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

چنگ:

یہ پونچھ کے مغربی حصے کا مقبول موسیقی کا آلہ ہے۔ یہ لوہے سے تیار ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی چار انچ کے برابر ہوتی ہے اسے منہ میں رکھ کر بجایا جاتا ہے اور سوراخوں پر انگلیوں کو مہارت کے ساتھ حرکت میں لایا جاتا ہے۔

ناد:

صوبۂ جموں کے پہاڑی علاقوں میں گجر قبائل کا من پسند موسیقی کا ساز ہے۔ یہ مٹی کا ہوتا ہے اور آوے میں پک کر تیار ہوتا ہے۔ یہ ساز موسیقی کے لئے کم اور جنگلی درندوں

کوڈرانے کے لئے زیادہ کام میں لایا جاتا ہے۔کئی علاقوں میں جو جنگلوں کے قریب ہوتے ہیں وہاں جب مکی کی فصل تیار ہوتی ہے تو جنگلی درندے رات کے وقت کھیتوں میں گھُس کر فصل تباہ کردیتے ہیں، اس لئے اکثر نوجوان رات رات بھر ناد بجا کر جنگلی جانوروں کو دور بھگاتے ہیں۔کئی فقیر اور درویش بھی ناد اپنے ساتھ رکھتے تھے لیکن اب ناد بجانے کا رواج جاتا رہا ہے۔

چمٹہ:

چمٹا صوبۂ جموں میں عام استعمال میں لایا جاتا ہے۔خاص کر ہندو لوگ اسے شادیوں میں لوک گیت گانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔مندروں میں بھجن کیرتن کے لئے چمٹہ بجایا جاتا ہے۔یہ چمٹہ عام طور پر دو سے ڈھائی فٹ لمبا ہوتا ہے اور ہر چار انچ کے فاصلے پر دو پتریاں جوڑی جاتی ہیں۔پھر جب اسے بجایا جاتا ہے تو چمٹے کے کھڑ کنے کے علاوہ پتریاں چھن چھن کی آواز سے موسیقی پیدا کرتی ہیں۔علاقہ پونچھ، راجوری میں پتریوں کے بغیر خالی چمٹے کو بجا کر بھی آواز نکالی جاتی ہے۔اس علاقے میں چمٹے کو اُچا کہا جاتا ہے۔

کنگ:

یہ ایک طرح کا اِک تارا ہوتا ہے۔یہ تار دو تونیوں سے بندھے ہوتے ہیں۔اس کی دُھن پر اکثر بھجن یا چار بیت گائے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ کھڑتالیں یعنی چولی مجیرے بجائے جاتے ہیں۔یہ لکڑی کے ہوتے ہیں۔یہ ساز علاقہ ڈگر میں مقبول ہے۔اسی طرح ڈوگری خطہ میں وہ گیت جنہیں ڈھول کے ساتھ گایا جاتا ہے انہیں ڈھولڑو کہتے ہیں اور وہ گیت جن کے ساتھ مرد ناچتے ہیں انہیں گیتڑو کہا جاتا ہے۔گیتڑو اور ڈھولڑو علاقہ اودھمپور، رام نگر، بنی، بلاور میں مقبول ہیں۔

مندرجہ بالا سازوں کے علاوہ کہیں کہیں بین، گھڑا باجا بھی بجایا جاتا ہے۔یہ تمام ساز گیتوں کو رس دار اور رنگدار بنادیتے ہیں۔صوبۂ جموں میں کچھ گیت ایسے بھی ہیں جو

سازوں کے بغیر گائے جاتے ہیں کیونکہ وہ ایسی دُھن اور لمبی تان پر گائے جاتے ہیں جس کے ساتھ موسیقی کا جوڑ نہیں ہوتا جیسے ڈگر علاقہ میں 'پاکھاں' ہیں جو بحر اور عروض سے مُبرا ہیں۔ یہ گیت مل کر گانے والے نغموں کے زمرے میں آتے ہیں۔ جماعت کا پیشوا ایک ہاتھ کان پر رکھتا ہے اور دوسرا ہوا میں فنکارانہ انداز میں اوپر اور نیچے ہلاتا ہے۔

ادھر علاقہ پونچھ، راجوری اور کنٹرول لائن کے اُس پار صوبۂ جموں کے علاقوں میں بھی موسیقی کے بغیر گیت گانے کا چلن صدیوں سے رائج ہے جو صوفیانہ کلام گانے کے لئے وقف ہے۔ صوفیانہ کلام جو روحانی جذبے سے شرابور ہوتا ہے اُسے موسیقی کے بغیر، درگاہوں، آستانوں، سماجی موقعوں، میلے اور تہواروں میں گایا جاتا ہے۔ اس کلام کو سی حرفیاں اور بیت کہتے ہیں اس کی اپنی لے اور دُھن مخصوص ہوتی ہے اور گانے والا دوزانوں بیٹھ کر کان کو انگلیوں سے دبا کر سریلی پاٹ دار آواز اور لمبی پہاڑی تان پر کلام چھیڑتا ہے تو لوگ احترام کے طور پر خاموشی کے ساتھ یہ کلام سُنتے اور روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ اکثر پہاڑی میلوں، شادیوں، ڈھوکوں اور مرگوں میں لوگ معتبر صوفی شاعروں کی سی حرفیاں اور بیت گاتے ہیں۔ مرگوں میں الاؤ کے نزدیک بیٹھ کر رات کے وقت بزرگ لوگ اپنے پیر کے بیت اور سی حرفیاں گا کر فطرت کے ماحول میں روحانیت کے رنگ بھر دیتے ہیں اور قبیلے کے لوگ احترام کے ساتھ یہ روحانی کلام سُنتے ہیں۔ بغیر موسیقی کے گایا جانے والا یہ کلام دلوں سے اُمڈ آتا ہے اور دِلوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

تعمیرات

صوبۂ جموں میں تعمیرات کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی وہ تعمیرات جو عہد قدیم کی ہیں اور جن کے آثار دستیاب ہیں۔ ان میں پانڈوؤں کے دور کی تعمیرات بھی آتی ہیں جیسے پانڈو مندر، پنج ناڑ سیال سوہی جو علاقہ کالاکوٹ میں واقع ہے۔ پانڈو محل سخی

میدان پونچھ اور علاقہ پونچھ، سورن کوٹ، مینڈھر، تھنہ منڈی اور بدھل میں پانڈووں کے دور کی باولیاں اور باولیوں کے ساتھ بت تراشی کے انمول نمونے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو عہد قدیم کی تہذیبی پہچان ہیں۔ پھر جموں کے شہر اکھنور کے قریب انباراں گاؤں میں بدھ تہذیب کا عکس لیے ہوئے آثار، مٹی کی مورتیاں اور برتن جبکہ علاقہ پونچھ میں کرشنا گھاٹی پہاڑ کی چوٹی گانی میں یونانی بدھ تعمیرات کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ صوبۂ جموں کا پرانا شہر بیور اور کرمچی کے مندر بھی ان تعمیرات میں آتے ہیں۔

مغل عہد میں جب 1586ء میں شہنشاہ اکبر نے کشمیر فتح کیا تو مغل شاہی کاروانوں کی لاہور سے کشمیر آمد شروع ہوگئی۔ شاہی قافلوں کی سہولت اور آسائش کے لئے گجرات پنجاب سے سری نگر تک 170 کلومیٹر شاہراہ مغل شہنشاہوں نے تعمیر کرائیں اور مغل انجینئر علی مردان خان نے اس شاہراہ کو چودہ پڑاؤوں میں تقسیم کیا اور ہر پڑاؤ پر قلعے، سرائیں، بالا دریاں، مساجد، حمام اور دوسری عمارات تعمیر کی گئیں جو پکی اینٹوں، سرخی اور چونے کے استعمال سے بنیں۔ پھر ہر پڑاؤ یعنی گجرات، بھمبر، سیدآباد، نوشہرہ، نارپو، چنگس، راجوری، تھنہ منڈی، چندی مڑھ، علی آباد سرائے، شوپیان، کنک پورہ اور راموں میں مغل تعمیرات کے اردگرد بستیاں بسائی گئیں جو آگے چل کر شہر اور قصبے بن کر اُبھرے اور باری دری، سیدآباد سرائے، چنگس سرائے، تھنہ منڈی سرائے اور نوشہرہ سرائے اور چندی مڑھ بارہ دری کے آثار مغلیہ عہد کی چھاپ رکھتے ہیں۔

اُدھر علاقہ جموں میں ڈوگرہ عہد کے قلعے، محلات اور دیگر پناہ گاہیں آج بھی صحیح حالت میں ملتی ہیں۔ اگرچہ پرانا جموں، کرمچی اور بیبور کی تہذیب دیوک ندی کے کنارے عمارتوں اور مندروں کے آثار اور جسر وٹہ کے کھنڈروں سے عہد قدیم کی تہذیب کی خوشبو آتی ہے لیکن ڈوگرہ عہد میں تعمیر شدہ عمارات میں سے کچھ ابھی بھی صحیح حالت میں دکھائی دیتی ہیں جیسے باہو قلعہ، مبارک منڈی کمپلکس، امر محل، زیارت بابا روشن شاہ ولی، رگھوناتھ مندر، قلعہ بھیم گڑھ ریاسی، قلعہ منگل دیہی نوشہرہ، قلعہ رام در ہال، قلعہ ڈنی دھار راجوری اور

قلعہ رامکوٹ میر پور شامل ہیں۔ یہ تمام تعمیرات حکمرانوں نے علاقے کے تحفظ کرنے، اُن پر تسلط قائم رکھنے، باغیوں کو قید کرنے، جنس کی صورت میں مالیہ وصول کرنے اور فوج کی رہائش اور سہولیت کے لئے بنوائی تھیں۔

تعمیرات کا دوسرا حصہ عوامی تعمیرات سے تعلق رکھتا ہے جن میں عوام کے گھر اور رہائش گاہیں شامل ہیں۔ آزادی سے قبل جموں شہر، راجوری، پونچھ، جسر وٹہ، رام نگر، اودھمپور، بھدرواہ، کشتواڑ، میر پور، بھمبر، کوٹلی جیسے شہروں اور قصبہ جات میں لوگ پکے مکان بناتے تھے جو تراشے ہوئے پتھروں اور اینٹوں سے بنائے جاتے تھے۔ امیر خاندانوں کے مکان حویلیاں کہلاتے تھے جو بہت سے کمروں اور وسیع باغوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ تجارت پیشہ لوگ پکے مکان بناتے تھے جبکہ شہروں کے مضافات میں غریب لوگ اور زمیندار پیشہ افراد کچے مکانوں میں رہائش کیا کرتے تھے۔ اُدھر گاؤں میں تقریباً سب خاندان کچے مکانوں میں سکونت رکھتے تھے۔ کچھ لوگ جھونپڑیاں اور کلوں میں بھی رہائش کرتے تھے لیکن کچے مکانوں کے مکین بڑے سلیقے اور وضع داری کے ساتھ رہتے تھے۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ گھر سادہ، دلکش اور جاذب نظر ہوتے تھے۔ اکثر کچے مکان مٹی، گارے اور پتھروں کے استعمال سے بنائے جاتے تھے۔ چھت پر پہلے شہتیر ڈالے جاتے تھے پھر چھوٹی لکڑیوں کا جال بچھایا جاتا تھا جس پر خاص قسم کی بغیر کانٹوں والی جھاڑی بچھائی جاتی اور پھر مٹی سے چھت لاد دی جاتی تھی۔ تعمیر گاؤں کا مستری کرتا تھا جو اجداد سے سیکھے ہوئے ہُنر سے مکان بناتا تھا۔ اگر پتھروں کو تراش کر مکان تعمیر کیا جاتا اور سرخی چونے کا استعمال کیا جاتا تو اسے مٹی کا لیپ نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر ان گھڑے پتھروں سے مکان بنایا جاتا تو پھر پہلے مٹی کا لیپ کیا جاتا تھا۔ پھر پیلے رنگ کی مٹی سے لیپ ہوتا۔ آخر میں سفید مٹی سے گھر کی سفیدی ہوتی تھی۔ اُس کے بعد رنگ برنگے بیل بوٹے اور نقش نگاری دیواروں پر کی جاتی تھی اور گھروں کو سجایا جاتا تھا۔ گھر عموماً رسوئی خانے، بیٹھک، سونے کے کمروں، غلہ رکھنے کے لئے کمرے، کُھلے وارانڈے، اچھے خاصے آنگن پر مشتمل

ہوتا تھا جہاں خاندان والے روزمرہ کی زندگی گزارتے تھے۔ مکانوں کے قریب مویشی خانہ بھی ہوتا تھا۔ جموں علاقے میں گاؤں اکٹھے گھروں پر مشتمل ہوتے تھے جہاں لوگوں کا آپس میں ملنے جلنے کا رواج ہوتا تھا۔ عام طور پر گاؤں کی دکان پر لوگ اکٹھا ہوتے اور حالات پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ شام کو لوگ مندر میں پوجا پاٹھ کے لئے اکٹھے ہوتے تھے جبکہ صبح کے وقت باولی چشمے یا دریا پر لوگ مسواک کرنے کے بعد اشنان کرتے تھے۔ اکثر باولیوں کے قریب مورتیاں ہوا کرتی تھیں جہاں اشنان کے بعد لوگ اپنے دیوتا کے درشن کرتے اور پھر گھر آ کر روزمرہ کی زندگی شروع کرتے تھے۔

ادھر ڈگر علاقہ کے پہاڑی لوگوں اور گجر قبائل کے علاقہ پونچھ، راجوری، میرپور، بھمبر، باغ، کوٹلی اور سدھنتی میں روایتی گھر بنانے کا انداز تقریباً ملتا جلتا ہے لیکن گھر پہاڑوں کی ڈھلوانوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں ہوتے ہیں اور ان کی جہاں زمینیں ہوتی ہیں وہیں گھر بھی بنائے جاتے ہیں۔ روایتی گھر مٹی گارے، پتھر اور لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ رسوئی والا کمرہ اور درمیانی کمرہ جہاں لوگ بیٹھتے ہیں یہاں ایک دو چارپائیوں کے علاوہ جائے نماز بھی رکھی جاتی ہے جو شالی کے خوشوں سے تیار کی جاتی ہے۔ گھر کے افراد یہاں نماز ادا کرتے ہیں۔ بیٹھک جسے آرام گاہ بھی کہا جاتا ہے اور غلے والا کمرہ میں کپڑے اور دیگر قیمتی اور ضروری سامان رکھا جاتا ہے جبکہ باہر کھلا وارانڈا ہوتا ہے، جہاں ایک چھوٹی رسوئی بھی ہوتی ہے۔ جدھر گرمیوں کے دنوں میں کھانا پکتا ہے جبکہ سردیوں میں بڑی رسوئی جو مکان کے اندر ہوتی ہے وہاں کھانا بھی بنتا ہے اور خاندان رات کو دیر تک گپ شپ بھی کرتا ہے۔ یہ کمرہ چولہے میں آگ جلنے کی وجہ سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ مکانوں کے ساتھ مویشی خانہ بھی ہوتا ہے۔ جو مکان کے نچلے حصے میں ہوتا ہے۔ یہ ایک لمبا چوڑا کمرہ تقریباً ہر طرف سے بند ہوتا ہے۔ بس دیوار میں ایک چھوٹا سا روشن دان رکھا جاتا ہے۔ یہاں مویشی باندھے جاتے ہیں اور سردیوں کے موسم میں خاندان کے افراد بھی اسی میں آ جاتے ہیں اور یہیں کھانا وغیرہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اس حصے کو ڈب کہا جاتا ہے اور بانڈی بھی کہتے ہیں۔ گاؤں میں ذیلدار

لوگ کہیں کہیں پکے مکان بھی بناتے تھے اور ساہوکار بھی اکثر پکے مکانوں میں رہائش کرتے تھے جو تراشے ہوئے پتھروں، سرخی اور چونے سے بنائے جاتے تھے۔ عام گھروں کو پیلی یا سفید مٹی سے پوتا جاتا تھا اور ہاتھ سے نقش نگاری بھی کی جاتی تھی۔ گھروں کے سامنے ورانڈا اور اس کے آگے کھلی جگہ رکھی جاتی تھی جہاں اکثر نوجوان بینی پکڑتے تھے (یہ طاقت آزمانے کا کھیل ہوتا ہے جس میں ایک نوجوان دوسرے کی کلائی پکڑتا ہے اور دوسرا زور لگا کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے) کُھلی جگہ کے آگے میوہ دار درخت یعنی خوبانی وغیرہ لگائے جاتے ہیں اور گھر کے دائیں بائیں مرچ، لہسن، پیاز اور سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ اُس کے آگے جو زمین ہوتی ہے وہاں مکی کی فصل اور راج ماش اگائی جاتی ہے۔ گاؤں میں بڑے زمینداروں کے گھر اونچی ٹیکری پر ہوتے ہیں اور عام گھروں کے مقابلے میں وسیع اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان گھروں کو 'دُیری' کہا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں میں دُیری کو ایک چھوٹے قلعے کے طور پر بنایا جاتا تھا جہاں گاؤں کا سردار رہا کرتا تھا۔ گھروں میں رسوئی نہایت دیدہ زیب ہوتی ہے۔ دو غالچوں والا محراب دار چولہا جو دیوار کے ساتھ ہوتا ہے، اسی دیوار میں برتن رکھنے کے لئے مٹی کے خانے بنائے جاتے ہیں اور ان خانوں کو بیل بوٹوں سے سجایا جاتا ہے۔ رسوئی میں روشنی کے لئے دینی (لکڑی جو دیر تک جلتی ہے اور شمع کی طرح روشنی دیتی رہتی ہے) کا استعمال کیا جاتا تھا پھر مٹی کے تیل کی چمنی جلائی جاتی تھی اور آجکل بجلی کے قمقمے کی روشنی سے رسوئی روشن ہوتی ہے (اور اب آگ جلانے کی جگہ گیس نے لے لی ہے) رسوئی میں بیٹھنے کے لئے شالی کے خوشوں کی چٹائیاں اور کھیڑے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ شام کے وقت خاندان کے افراد ساتھ مل بیٹھ کر رسوئی میں کھانا کھاتے ہیں۔

ادھر جموں صوبہ کے پہاڑی علاقوں اور پونچھ، راجوری، میر پور، کوٹلی اور راولاکوٹ باغ میں اکثر لوگ گرمیوں کے موسم میں اپنے مال مویشیوں اور ریوڑوں کے ساتھ پہاڑی بلندیوں پر واقع ڈھوکوں اور مرگوں میں نقل مکانی کرتے ہیں۔ جہاں تقریباً پانچ ماہ تک

فطرت کے قریب معتدل موسمی حالات میں آزاد، بے ساختہ اور آلودگی سے پاک زندگی گزارتے ہیں۔ ڈھوک اُس سرسبز قطعہ زمین کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے جنگل سے گھری ہوتی ہے۔ اس قطعہ میں جو پناہ گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں انہیں ڈھارہ کہتے ہیں۔ ڈھارہ پتھر، گارے اور لکڑی کے استعمال سے بنایا گیا ایک بڑا کمرہ نما مکان ہوتا ہے جس کے آگے کا حصہ عموماً کھلا رکھا جاتا ہے۔ اس میں کھانا بنانے، مویشی رکھنے اور رہائش اختیار کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ جبکہ سونے کے لئے خاندان والے ڈھارے کے ایک حصے میں لکڑی، بغیر کانٹوں والی جھاڑیوں اور کمبلوں سے ایک چارپائی نما جگہ بناتے ہیں جسے ڈنگی کہا جاتا ہے۔ ڈنگی کئی چارپائیوں کے برابر ہوتی ہے جہاں خاندان کے افراد سوتے ہیں۔

مرگ اُس مقام کو کہتے ہیں جو سطح سمندر سے ہزاروں فٹ سے اوپر سرسبز گھاس اور چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھولوں والے میدان ہیں۔ یہاں جنگل ختم ہوجاتے ہیں۔ ان علاقوں میں یا تو ڈھارے بنا کر رہائش اختیار کی جاتی ہے یا پھر خیمہ بستیاں آباد کی جاتی ہیں۔ خیمہ بستیوں میں عموماً بکروال قبائل قیام کرتے ہیں اور پھر پت جھڑ کے آغاز میں ان کے قافلے اور کاروان واپس آنا شروع ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں پہاڑی لوگ بھی ہوتے ہیں، گجر اور بکروال قبائل بھی ہوتے ہیں جبکہ بھدرواہ، اودھمپور، کشتواڑ، بنی اور پاڈر میں گجروں اور بکروالوں کے علاوہ ہندو گدّی اور سپی لوگ بھی اپنے ریوڑوں کے ساتھ نقلِ مکانی کر کے شوالک اور پیر پنچال کے بالائی ڈھوکوں اور مرگوں میں جایا کرتے ہیں۔

لیکن آج کے جدید دور میں لوگوں نے گاؤں میں پکے مکان تعمیر کئے ہیں جہاں بجلی، پانی، سڑک، گیس جیسی سہولتوں نے روایتی زندگی کو یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ ڈھوکوں، مرگوں اور بالائی علاقوں کی طرف ان کی نقل مکانی میں مختلف وجوہات کی بنا پر رکاوٹیں آئی ہیں۔ ایک تو نامساعد حالات کے باعث ڈھوکوں مرگوں میں خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ دوسرے عوام نے بچوں کو سکولوں میں داخل کرانا شروع کر دیا ہے اور یہ سہولتیں ڈھوکوں مرگوں کے قریب میسر نہیں۔ اُدھر عوام کو گھروں کے نزدیک روزگار کی گارنٹی بھی ملی ہوئی ہے

جس کی وجہ سے وہ مشکل ترین حالات میں غربت کی زندگی گزارنے کے بجائے گاؤں میں ہی رہنا پسند کرنے لگے ہیں اور اب آبادی کا صرف 35 فیصد حصہ ہی ڈھوکوں مرگوں کی طرف رُخ کرتا ہے۔

زراعت

صوبۂ جموں کے دیہات میں آبادی کی اکثریت کی روزی روٹی کا انحصار زراعت اور زراعت سے جڑے شعبوں پر منحصر ہے۔ کسان محنت مشقت کر کے زمینوں سے غلہ حاصل کرتے ہیں۔ وہیں مال مویشی بھی پالتے ہیں۔ صوبہ کے میدانی علاقے ہیرانگر، کٹھوعہ، سانبہ، نواں شہر اور اکھنور کے علاقے میں شالی اور گندم کی فصل بھرپور ہوتی ہے۔ اگرچہ پہاڑی اور کنڈی علاقوں میں بھی کہیں کہیں شالی اُگائی جاتی ہے لیکن زیادہ تر لوگ مکی کی فصل اُگاتے ہیں جو بارش کے پانی سے پنپ جاتی ہے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر بھی اُگتی ہے۔ جبکہ پونچھ، راجوری میں عام طور پر خریف کی فصلیں یعنی مکی، دریاؤں اور ندی نالوں کے قریب شالی اور ربیع میں کچھ علاقوں میں گندم بھی اُگائی جاتی ہے لیکن صوبۂ جموں کے شمالی پہاڑوں میں واقع گاؤں میں اور کشتواڑ کے کچھ علاقوں میں خریف کی فصلیں ہی ممکن ہوتی ہیں کیونکہ سخت سردی اور برف باری کے باعث دوسری فصل نہیں ہوتی۔ جب پہاڑی علاقوں میں مکی کی فصل لہلہانے لگتی ہے تو کسان کی خوشی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اکثر مکی کی گوڑی کرتے ہوئے کسان مرد اور عورتیں یہ گیت گاتے ہیں جسے بولی کہا جاتا ہے۔

بولی

مکاں جمیاں علی اللہ جی
لمیاں لمیاں علی اللہ جی
ھن کے کمیاں علی اللہ جی

(کھیتوں میں مکئی اُگ آئی ہے۔ پودے لمبے ہو رہے ہیں۔اب کس بات کی کمی ہے)

لنگ لگاساں علی اللہ جی

خوب کماساں علی اللہ جی

رجے کے کھاماں علی اللہ جی

(بھرپور محبت کریں گے۔خوب فصل کمائیں گے اور پیٹ بھر کے کھائیں گے)

علاقے کی بیشتر آبادی کے خواب فصلوں کی پیداوار سے جڑے ہوتے ہیں جس سے وہ پیٹ بھرتے ہیں اور کچھ حصہ فروخت کر کے ضروریات زندگی کی دوسری اشیاء حاصل کرتے ہیں جیسے آرائش اور زیبائش کا سامان اور دلجوئی کے لئے جدید آلہ جات خریدتے ہیں، شادیوں کا انتظام کرتے ہیں۔تہواروں پر فراخدلی سے خرچ کرتے ہیں لیکن اگر فصل آفاتِ سماوی کی شکار ہو جائے تو کسان مصیبتوں میں گھر جاتا ہے مقروض ہو جاتا ہے یا پھر محنت مزدوری کے لئے اُسے دور جانا پڑتا ہے۔

اُدھر گندم اور شالی کے علاوہ صوبۂ جموں کا کسان مرچ، لہسن، آلو، راجماش، مونگ، ماش وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں اور مختلف اقسام کی سبزیاں یعنی کریلہ، کدو، کاشی پھل، بھنڈی، شلغم، مٹر، پالک، پیاز وغیرہ اُگاتے ہیں جبکہ ربیع میں گندم کے ساتھ ساتھ سرسوں بھی اُگائی جاتی ہے جس کا ساگ کھانے کے کام آتا ہے اور بعد میں سرسوں کے بیج بھی حاصل کئے جاتے ہیں جسے مقامِ گھانی پر بھیج کر تیل اور کھلی حاصل کی جاتی ہے۔تیل تو گھر میں استعمال ہوتا ہے جبکہ کھلی بھینسوں کو کھلائی جاتی ہے جس سے وہ زیادہ دودھ دیتی ہیں۔اُدھر کھیتوں میں پھل دار درخت اور باغات لگانے کا بھی رواج ہے۔صوبہ جموں کے ڈگر علاقے میں آم پیدا ہوتا ہے۔امرود، سنترے، لیموں اور کیلا بھی ہوتا ہے۔جبکہ پہاڑی علاقوں میں ناخ، خوبانی، بگوگوشہ جیسے پھل بھی ہوتے ہیں جو کسان کی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد آمدن کا ایک ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔گاؤں میں لوگ آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے بھینس، گائیں اور بھیڑ بکریاں بھی پالتے ہیں۔گائے بھینسوں کا دودھ گھر میں استعمال کے

بعد یا تو لوگ بیچ دیتے ہیں یا پھر گھی، مکھن، پنیر اور کھویا بنا کر فروخت کرتے ہیں۔ بھیڑوں کا اُون، گوشت اور کھالیں بیچ کر بھی گزارہ کرتے ہیں اور اکثر گاؤں کے کسب داروں کو اُون دے کر لویاں، کمبل اور پٹو تیار کروا لیتے ہیں۔ گھروں میں مُرغے اور مرغیاں پالنے کا رواج گاؤں میں عام ہے جن سے ایک تو گھر میں استعمال کے لئے انڈے اور گوشت حاصل ہوتا ہے اور ضرورت پڑنے پر انہیں بیچ کر دوسری ضروریات زندگی حاصل کی جاتی ہیں۔ اس طرح زمینداری شعبے سے جڑے ہوئے کام سے کسان نہ صرف آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ دور دور کے پسماندہ اور پچھڑے علاقوں کے بچے اپنی محنت اور تعلیمی شعور کی بنا پر مقابلوں میں بھی اپنا لوہا منواتے ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں سے جموں شہر کے علاوہ کشتواڑ اور پونچھ، راجوری جیسے علاقوں اور کنٹرول لائن کے قریب رہنے والے خاندانوں کے بچے کے۔ اے۔ ایس اور آئی۔ اے۔ ایس جیسے باوقار امتحانات میں کامیاب ہو رہے ہیں جن سے صوبۂ جموں کے عوام کے آگے آنے اور تعلیمی شعور سے سبقت حاصل کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

کسب دار

پرانے زمانے میں ہر گاؤں اپنی ضروریات کی مصنوعات کیلئے خود کفیل ہوا کرتا تھا اور ضروریات کی مختلف اشیاء مقامی طور پر تیار کی جاتی تھیں۔ صوبۂ جموں کے مکین بھی ضرورت کی زیادہ تر چیزیں گاؤں میں ہی تیار کرتے تھے جس میں گاؤں کے پیشہ ور لوگ اپنا رول نبھاتے تھے اور کسب دار لوگ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے جو گھروں میں دستکاریاں تیار کر کے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کیا کرتے تھے۔

ہر گھر میں بھیڑ پالنے کا رواج ہوتا تھا اور گھر کی عمر رسیدہ عورتیں چرخہ کاتنے میں ماہر ہوا کرتی تھیں۔ چرخے پر کتے ہوئے اونی دھاگے کو کسب دار کے پاس مصنوعات بنانے کے لئے دیا جاتا تھا جو اون کی سفید لوئی، چارخانے کمبل، کوٹ کے لئے پٹو، ٹوپ اور ٹانگوں کے گرد لپیٹنے کے لئے پتاوے تیار کرتے تھے جبکہ گھروں میں عورتیں اسی اُونی

دھاگے سے سوئیٹر، دستانے، جرابیں، گلوبند اور ٹوپیاں تیار کیا کرتی تھیں۔

گاؤں میں آٹا پیسنے کے لئے گھراٹ ہوتا تھا جہاں گھراٹی مقامی قسم کے گھراٹ پر مہین آٹا پیستا تھا جو کھانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اسی طرح چاول کوٹنے کے لئے یا تو مقامی پاٹیک (لکڑی سے بنی شالی کوٹنے کی دیسی مشین) پر لے جاتے تھے یا پھر عورتیں اوکھ میں شالی ڈال کر اُسے موہلے (چاول بنانے والا ڈنڈا) سے کوٹ کر چاول نکال لیا کرتی تھیں۔ مکان بنانے کے لئے مقامی راج مستری ہوتا تھا جو پتھر، گارے اور لکڑی سے مکان تیار کرلیا کرتا تھا۔ جبکہ گھر میں لکڑی کا کام کرنے کے لئے ترکھان اور آری کش ہوا کرتے تھے جو دروازے، کھڑکیاں اور لکڑی کا دیگر سامان بناتے تھے۔ لوہے کے اوزار تیار کرنے کے لئے گاؤں میں لوہار ہوتے تھے جو کاشت کاری کے لئے ضروری اشیاء تیار کرتے تھے جیسے کلہاڑی، درانتی، رمبا، پاٹھی، پھال وغیرہ۔ چمڑے کا کام کرنے والے موچی مقامی طور پر چمڑا کمایا کرتے تھے اور پھر اُسی چمڑے سے چپل، جوتے، کھیڑی، تلے دار جوتی وغیرہ تیار کرتے تھے۔ مٹی کے برتن بنانے والے کمہار بھی ہر گاؤں میں ہوا کرتے تھے جو چاک کو گھما کر مٹی سے برتن تیار کرتے تھے جیسے ہنڈی، پیالہ، رکابی، گھڑا، دودھ دوہنے کے لئے کوری، دودھ بلونے کے لئے چھٹلی، سالن ڈالنے کے لئے ڈولا وغیرہ تیار کیا کرتے تھے۔ سونے، چاندی اور جست کے آرائشی زیورات بنانے کے لئے سنار مقامی طور پر موجود ہوتے تھے جو ناک کے لئے لونگ، کانوں کے لئے مُرکیاں اور کانٹے، کلائی کے لئے کنگن اور مریدے، گلے کے لئے سیری اور دولڑے، انگلیوں کے لئے تھیوے دار چھاپیں بنایا کرتے تھے۔ کپڑے سینے کے لئے مقامی درزی ہوتے تھے جنہیں اپنے علاقے کے عوام کے پہناوے کا اچھی طرح پتہ ہوتا تھا اور اُسی حساب سے کپڑے سیا کرتے تھے۔ یہ کسب دار لوگ صوبۂ جموں کی عوامی زندگی کا اہم حصہ ہوتے تھے۔ ان کسب داروں کو عام طور پر نقدی کی صورت میں اُجرت نہ ملتی تھی بلکہ سال میں ایک بار جنس کی صورت میں ادا کی جاتی تھی جسے ''کھلین'' کہتے تھے۔ عام طور پر جب فصل کو کھلیانوں سے گھر لانے کا وقت

ہوتا تو کسب دار اپنا حصہ لینے کے لئے کھلیان میں پہنچ جاتے تھے اور انہیں سال بھر کی مزدوری جنس کی صورت میں ادا کردی جاتی تھی۔ پھر سال بھر اُس سے گھر کی ضرورت کو پورا کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد کی دہائیوں تک چلتا رہا لیکن وقت کے ساتھ جب زمانہ تیزی سے بدلا تو کھلین لینے کی روایت جاتی رہی اور مقامی طور پر کسب داری کا سلسلہ بھی پھیکا پڑتا گیا۔ اگرچہ اب بھی گاؤں میں کسب دار موجود ہیں لیکن انہوں نے بھی نئے دور میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا ہے جو پہلے سے مختلف ہے۔

صوبۂ جموں کے گاؤں اور کنڈی علاقوں میں عورتیں گندم کے خوشوں کی دیدہ زیب ٹوکریاں بناتی تھیں۔ پرانے زمانے میں روٹیاں تیار کرکے انہیں ان ٹوکریوں میں رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح کپڑا رکھنے کے لئے 'جیند' بنائی جاتی تھی۔ یہ سارا کام گھر کی سیانی عورتیں کیا کرتی تھیں۔ صوبہ کے پہاڑی گاؤں میں سردیوں کے دنوں شالی کے خوشوں کی رسیاں بنا کر مختلف چیزیں تیار کرتے تھے جیسے پاؤں کے لئے پاپوش جسے ''پول'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چٹائیاں بنائی جاتی تھیں، جائے نماز تیار کئے جاتے تھے اور بیٹھنے کے لئے کھیڑے بنائے جاتے تھے۔

علاقے میں سوتری کی فصل بھی اُگائی جاتی تھی جسے مقامی زبان میں 'بھدر' کہا جاتا ہے۔ بھدر بانس نما پودے کا چھلکا ہوتا ہے جس کے ریشے نکلتے ہیں۔ ان ریشوں کو پانی میں بھگو کر رکھا جاتا ہے۔ پھر 'بھیرے' پر اس کی رسی بنائی جاتی ہے اور اس رسی سے چارپائی تیار ہوتی ہے۔ پیڑیاں اور پلنگ بھی بنائے جاتے تھے اور مویشی باندھنے کے لئے رسے بھی تیار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر دستیاب سرسوں سے تیل نکالا جاتا تھا۔ روئی دھننے اور بستر بنانے والے پنجے ہوا کرتے تھے۔ لڑکیوں میں پانی کا گھڑا سر پر رکھنے کے لئے اینوں، ناڑے اور پراندے بنانے کا رواج ہوتا تھا۔ لیکن اب ان چیزوں کے رواج ختم ہوتے جارہے ہیں۔

ہتھیار اور اوزار

چونکہ صوبۂ جموں میں عوام کی اکثریت کی معیشت کا انحصار زراعت پر ہے جس کے لئے مختلف اوزاروں کی ضرورت پڑتی ہے جیسے گھاس کاٹنے کے لئے درانتیاں، زمین ہموار کرنے کے لئے رمبھا یا کہی، لکڑی کاٹنے کے لئے تبر یا کلہاڑی، لکڑی چیرنے کے لئے آری، درخت کاٹنے کے لئے پاٹھی، گوشت کاٹنے کے لئے بگدا، درانتی تیز کرنے کے لئے دندوالی، بھیڑ بکریوں کے اُون کاٹنے کے لئے کات، آبی زمینوں میں ہل لگانے کے بعد ہموار کرنے کے لئے دندال وغیرہ اہم اوزار ہیں۔

گاؤں میں حفاظت کے لئے لوگ اپنے ہاتھ میں سوٹی رکھتے تھے۔ سوٹیاں بڑی آرائش کے ساتھ مقامی لوگ بنایا کرتے تھے۔ خوبصورت رانگلی سوٹی کو کھونڈی کہا جاتا تھا۔ سوٹیوں کی ایک قسم 'گفتی' بھی ہوتی ہے۔ گفتی یعنی سوٹی کے اندر سوراخ کرکے برچھی فٹ کی جاتی تھی۔ دیکھنے والوں کو اگرچہ یہ سوٹی دکھائی دیتی تھی لیکن ضرورت کے وقت یہ ہتھیار کے طور پر بھی کام آتی تھی۔ لوگ اکثر چاقو بھی جیب میں رکھا کرتے تھے۔ اُدھر ڈوگرہ لوگ جو اکثر فوج میں بھرتی ہوتے تھے بندوق بھی رکھا کرتے تھے۔ بندوق پورے صوبے میں شکار کرنے کے لئے رکھتے تھے۔ پرانے زمانے میں نیزہ اور بھالے بھی لوگوں کے پاس ہوتے تھے جبکہ سکھ برادری کے لوگ تلوار یا کرپان اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ گاؤں میں اکثر لڑائی جھگڑوں کے موقعے پر ڈنڈوں، کلہاڑیوں اور چھروں کا استعمال بھی ہوتا ہے اور معتبر لوگ لائسنس شدہ اچھی بندوقوں کے علاوہ پستول بھی اپنی حفاظت کے لئے رکھتے ہیں۔

مقامی دوائیاں

صوبۂ جموں میں جب جدید طرز کی طبی سہولیات دستیاب نہ تھیں تو گاؤں میں لوگ دیسی دوائیوں اور مقامی جڑی بوٹیوں کا استعمال کیا کرتے تھے جو عموماً کارگر ثابت

ہوتی تھیں۔ جیسے اگر زخم آجائے اور خون بند نہ ہوتو زخم حیات پودے کے پتوں کو کوٹ کر لیپ کیا جاتا تھا جس سے خون بند ہوجاتا تھا۔ کھانسی، زکام، بلغم کے لئے بنفشہ کا قہوہ دیا جاتا تھا۔ بخار آجائے تو چِرایتا جڑی کو کُوٹ کر اس کا جوس پینے کے لئے دیا جاتا تھا۔ جوڑوں کے درد کے لئے ریچھ کی چربی کی مالش کی جاتی تھی۔ سردی ہوجائے تو گوگل (دھوپ) کی جڑوں کا کاڑا بنا کر دیا جاتا تھا۔ کمزوری دور کرنے کے لئے روسے کا نافہ یعنی (کستوری) طاقت کا سر چشمہ مانا جاتا تھا جبکہ فالج کے مریض کو کبوتر کے گوشت کا شوربا پلایا جاتا تھا۔ دمے کے مریض کے لئے شنگرف کا استعمال کرتے تھے۔ یعنی شنگرف کو پیس کر آٹے میں ملا کر گولیاں بنائی جاتی تھیں جو مرغے کو کھلاتے تھے۔ کئی ماہ بعد جب شنگرف پوری طرح مرغے کے جسم میں حائل ہوجاتا تھا تو اُسے پکا کر کئی دنوں تک کھایا جاتا تھا جس سے دمے کے مرض سے راحت ملتی تھی۔ کھانسی ہوجائے تو ملہٹی کا کاڑا بنا کر پلاتے تھے۔ پیٹ کے درد میں اکثر پیاز کوٹ کر اس کا جوس پلایا جاتا تھا۔ یرقان کی صورت میں خاص جڑی کھانے کے لئے دی جاتی تھی۔ سر میں درد ہوتو دارچینی کوٹ کر اُس کا ماتھے پر لیپ کیا جاتا تھا تو راحت ملتی تھی۔ اکثر جب پیٹ میں گیس بن جاتی تھی تو اس کا دباؤ رگوں پر ہوتا تھا جو سُست ہوجاتی اور درد کرنے لگتی تھیں۔ اس بیماری کو 'ناڑ' کہتے تھے۔ ناڑ نکالنے کے لئے ٹانگوں اور پیٹھ کو پاؤں سے دبایا جاتا تھا جسے 'لت رکھنا' کہتے تھے۔ اس عمل سے پیٹ کی گیس منتشر ہوجاتی تھی اور رگیں اصل حالت میں حرکت کرنے لگتی تھیں اور مریض بیماری سے افاقہ حاصل کرتا تھا۔

مندرجہ بالا علاج کے علاوہ سیانے لوگوں اور پیروں فقیروں سے روحانی علاج بھی کروائے جاتے تھے جیسے نفسیاتی بیماری کی حالت میں اکثر عورتیں ذہنی طور پر بکھر جاتی تھیں اور انہیں ہوش نہیں رہتا تھا۔ ایسی عورتوں کو سیانے باؤں یا پیروں کے پاس لے جایا جاتا تھا جو اُن پر منتر پھونکتے اور دم کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ نفسیاتی بیماری ہوتی ہے اس لئے دم ہونے کے بعد مریض اپنے آپ کو ٹھیک محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس طرح کے مریضوں

کے لئے علاقہ جموں میں دیالے بھی ہوتے تھے جو آسیب اور جنوں بھوتوں کو نکالنے کا دعویٰ کیا کرتے تھے اور جادوٹونے کر کے بیمار کو تسلی کرادیتے تھے اور بیمار اپنے آپ کو پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگتا تھا۔ ایسی بیماریوں کے لئے منتر اور تعویز بھی دیئے جاتے تھے۔ اس طرح گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کا علاج بھی سیدھے سادے طریقے سے ہوا کرتا تھا۔ اب جبکہ جدید طبی سہولیات گاؤں گاؤں میں دستیاب ہیں، لوگ نہ تو جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں نہ جادوٹونے پر بھروسہ کرتے ہیں بلکہ جوں ہی گھر میں کوئی بیمار ہوتا ہے تو اُسے سیدھے ہسپتال لے جاتے ہیں۔

اجتماعی کام کاج

اجتماعیت اور جمعیت بھائی چارے، میل ملاپ اور دوستی کو بڑھاوا دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ گاؤں میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا، کام آنا اور وقت پر ہاتھ بٹانا علاقہ جموں کے عوام کی تمدنی روایات رہی ہیں۔ اس طرح آدمی ایک دوسرے کو جان بھی لیتا ہے اور ایک دوسرے سے سیکھ بھی لیتا ہے۔ صوبۂ جموں میں عوام صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر رہتے چلے آئے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ گاؤں میں اگر کوئی اجتماعی کام کرنا مقصود ہو تو غریب کسان مزدوری دے کر وہ کام نہیں کرواسکتا تھا۔ اس لئے گاؤں والوں نے اجتماعی کاموں کے لئے بغیر مزدوری کے اکٹھے ہونا اور کام کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ضرورت کے موقع پر جس کو لوگوں کی ضرورت ہو وہ باقی گاؤں والوں کو طلب کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں اُسے بھی دوسرے کے کام آنا ہوتا تھا۔ اس میں صرف کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اس نظام کو ''بری چھٹرانہ'' کہتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی نے اگر دوسرے سے کام کروایا تو دوسرے کو جب ضرورت پڑے گی اُس وقت وہ آدمی کام کر کے اُس کا بدلہ چکا دے گا۔ یہ نظام صوبہ کے پہاڑی علاقوں میں بہت کارگر رہا ہے۔

اجتماعی کاموں میں جیسے کوئی مکان بنارہاہو اور چھت ڈالنے کا وقت آئے تو مکان کی چھت کو مٹی سے لادنے کے لئے بہت سے آدمی درکار ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر گاؤں کے نوجوانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آکر ہاتھ بٹائیں۔ چھت لادنے کو لادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ لادی کے موقعے پر بہت سے لوگ اکٹھے ہوجاتے ہیں اور ایک ہی دن میں چھت کو مٹی سے لاد دیتے ہیں۔ اس طرح غریب سے غریب آدمی بھی اپنا مکان بنا سکتا ہے۔

پہاڑی گاؤں میں ہر گھر کے پاس مویشی ہوتے ہیں اور سرد علاقوں میں سردیوں میں مویشیوں کے چارے کے لئے گھاس کاٹ کر اور سُکھا کر رکھنا پڑتی ہے۔ گھاس کے کاٹنے کو 'لیتری' کہتے ہیں جس میں بہت سے نوجوان درانتیاں لے کر اکٹھے ہوتے ہیں اور گھاس والے قطعے کو کاٹنا شروع کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ڈھول بجتا ہے جس سے نوجوان جوش میں آکر دوسرے سے زیادہ گھاس کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیتری بھی لادی کی مانند اجتماعی کام ہے جس میں گاؤں کے لوگ ایک دوسرے پر 'بری' چڑھا کر کام کرتے اور کرواتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر گھی، شکر اور چاولوں کی دعوت شام کو کھلائی جاتی ہے۔

اُدھر مکان کے لئے شہتیر لانے کے لئے بھی اجتماعی طور پر لوگ جنگل میں جاتے ہیں اور شہتیر رسیوں سے باندھ کر کھینچتے ہوئے مکان مالک کے گھر تک لے آتے ہیں۔ گاؤں میں جب شالی کے پودے لگتے ہیں تب بھی گاؤں کے کام کرنے والے نوجوانوں کو دعوت دی جاتی ہے اور پھر سب پانی والی زمین میں اترتے ہیں اور اکٹھے مل کر شالی کے پودے لگاتے ہیں۔ اس کام کو 'لیب' لگانا کہتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں مکی کی فصل کی گوڑی اجتماعی طور پر مل کر کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مکی کو کوٹنے کے لئے نوجوان اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کام بھی نپٹ جاتے ہیں اور آپس میں رشتے بھی تر و تازہ ہوجاتے ہیں لیکن بدلتے وقت کے ساتھ دھیرے دھیرے یہ نظام ختم ہوتا جارہا ہے۔

رواداری

صوبۂ جموں کے عوام مزاج، اطوار اور وطیروں کے لحاظ سے بڑے وضع دار، خوش اخلاق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ یہاں مختلف مذاہب، فرقوں اور نسلوں کے لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور صدیوں سے اکٹھے مل کر رہتے چلے آئے ہیں۔ یہاں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، سکھ، عیسائی اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی آباد ہیں۔ نسلی طور پر ڈوگروں کے علاوہ پہاڑی بولنے والے لوگ، گجر قبائل، بوگلی، گدی، بھدرواہی، کشتواڑی، پہھالے وغیرہ آباد ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور خیر سگالی کے جذبوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ صوبۂ جموں میں ایسے بھی علاقے ہیں جہاں لوگ ایک فیصد اقلیت اور ننانوے فیصد اکثریت میں محفوظ، بے خطر اور باعزت زندگی گزارتے ہیں۔ کبھی بھی اکثریتی فرقے کے لوگوں نے اقلیت کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ غیر یا پرائے ہیں بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ صوفی بزرگوں اور سنتوں مہنتوں کا میل ملاپ والا درس ہے جس کی بنیاد جموں میں پیر روشن شاہ ولیؒ نے آٹھویں صدی میں رکھی تھی۔ پھر جموں کے پیر مٹھا ہوں، بابا چملیال ہوں، کشتواڑ کے حضرت شاہ فریدالدین ہوں، راجوری کے حضرت سید پیر غلام شاہ بادشاہ ہوں، کالاکوٹ کا باجی خاندان ہو، جھنگر کے بیرم شاہی ہوں، پونچھ کے مہاتما دھرم دت جی ہوں اور ننگالی صاحب کے سنت بھائی میلا سنگھ جی ہوں یا پھر وانگت سے آکر موہڑا اچھائی، سورن کوٹ میں آباد حضرت بابا جی صاحب ہوں، سب نے ایک دوسرے کے عقیدوں کے احترام، خلوص اور خیر سگالی کا درس دیا ہے۔ فرقوں اور مذاہب سے اوپر اُٹھ کر محبت کو رواج دیا ہے۔ دوستی کو بڑھاوا دیا ہے اور میل جول کو تقویت دی ہے جس کے باعث صوبۂ جموں کے ہر حصے میں ایک ایسے تمدن کو تقویت ملی جو باہمی دوستی، احترام اور بھروسے پر قائم ہے۔

مہمان نوازی

صوبۂ جموں میں مہمان نوازی کا جذبہ بہت گہرا ہے۔ یہاں گاؤں میں مہمان کو اللہ کی رحمت مانا جاتا ہے اور جو بہترین کھانا ہوتا ہے مہمان کے آگے پروسا جاتا ہے۔

برادری

دیہات میں ابھی بھی زندگی سادگی، صفائی اور سلیقے کا مرکب ہوتی ہے۔ ہر چیز عام طور پر گاؤں میں ہی میسر ہو جاتی ہے۔ لوگ سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا، ایک دوسرے کے کام آنا، مدد کرنا، بزرگوں کا احترام کرنا، بڑے بوڑھوں کو چارپائی پر بٹھانا، اہم معاملوں میں اُن سے رائے حاصل کرنا، معاشرے میں عام بات ہے۔ نوجوان بزرگوں کو بوجھ نہیں بلکہ گھر کی برکت مانتے ہیں۔

صوبہ کے عوام میں برادری تمدن کا اہم ترین حصہ مانا جاتا ہے۔ جب کسی پر بُرا وقت آتا ہے تو وہ برادری کا سہارا لیتا ہے۔ برادری کے سنجیدہ افراد مل کر اُس کی امداد کے لئے اقدام اُٹھاتے ہیں۔ خاندانوں میں تضاد اور جھگڑے نپٹاتے ہیں۔ سُکھ دکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برادری میں امیر اور غریب برابر سمجھے جاتے ہیں۔ سب کا ایک مقام ہوتا ہے۔ آپس میں مضبوط اور گہرے تعلقات پیدا کرنے کے لئے برادری معاون ثابت ہوتی ہے۔ اکثر رشتے ناطے برادری میں ہوا کرتے ہیں، لیکن اگر برادری سے باہر بھی رشتہ کر لیا جائے تو اُس کو برادری کے اندر وہی مقام ملتا ہے جو دوسرے افراد کا ہوتا ہے۔

صوبۂ جموں کی آبادی بڑی مہمان نواز ہے۔ مہمان کو خدا کی رحمت سمجھا جاتا ہے اور جو بہترین کھانا میسر ہو سکتا ہے اسے پیش کیا جاتا ہے۔ گاؤں میں مسافروں کو پانی، لسی، دودھ

پیش کرنا عام روایت رہی ہے۔عوام ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونا فرض سمجھتے ہیں۔شادیوں پر بلا امتیاز مذہب وملت گاؤں کے سبھی خاندانوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔کئی پہاڑی علاقوں کے مسلمان خاندانوں میں یہ روایت رہی ہے کہ اگر کسی غریب گھرانے میں شادی ہو تو لوگ اپنے گھروں سے اچھا کھانا تیار کر کے شادی والے گھر لے جاتے ہیں۔عورتیں لوک گیت گاتی ہیں۔نوجوان سیف الملوک کا صوفیانہ کلام پیش کرتے ہیں۔ہنسی مذاق ہوتا ہے۔پھر سب مل بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔جبکہ ہندوؤں میں ایسی روایت نہیں ہے۔کھانا شادی والے گھر ہی پکتا ہے۔عورتیں گیت گاتی ہیں۔کچھ عورتیں ناچتی بھی ہیں۔مرد کھانے پینے کے شغل میں مست رہتے ہیں اور دیر تک دعوت چلتی ہے۔یہ سلسلہ ہندو اور مسلمانوں میں کئی دن پہلے شروع ہو جاتا ہے۔جبکہ شادی والے دن مسلمانوں میں گوشت اور چاول کی دعوت دی جاتی ہے لیکن دوسرے مذہب کے لوگوں کے لئے ویشنو کھانا بھی بنایا جاتا ہے اور ہندوؤں اور سکھوں میں کڑاہ، پوری، راجماش، پنیر، امبل، سبزیاں، دہی کا رائتہ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ان دعوتوں میں مسلمان بھائی بھی شرکت کرتے ہیں اور شوق سے دعوت کا مزہ لیتے ہیں۔

اعتقادات

مذاہب، فرقوں اور ذات برادریوں سے اوپر اُٹھ کر عوام کے اعتقادات ہوتے ہیں جو ہر مذہب کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں جیسے اگر چیونٹیاں بلوں سے باہر نکل آئیں تو مانا جاتا ہے کہ بارش ہوگی۔اگر کوا بولے تو مہمان کی آس لگ جاتی ہے۔خزاں میں درختوں کو پھول آ جائے تو مانا جاتا ہے کہ موسم سرما شدید ہوگا۔بارش کے دوران قوس وقزح پڑ جائے تو آثار بارش تھمنے کے ہو جاتے ہیں اور بارش کے دوران دھوپ بھی نکل آئے تو گاؤں میں کہا جاتا ہے کہ آج گیدڑوں کی شادی ہو رہی ہے۔پوہ ماہ کی آخری تاریخ کو سرد ترین دن مانا جاتا ہے۔اس دن صوبۂ جموں کے عوام ایک اہم تہوار مناتے ہیں جسے 'لوہڑی'

کہا جاتا ہے۔لوہڑی کے دن بچے چھجے نکالتے ہیں اور گھر گھر جا کر لوہڑی مانگتے ہیں اور یہ گیت گاتے ہیں ؎

ترا کون ویچارہ۔ ھو
دلھا بٹھی وارہ۔ ھو
دلھے دہی ویاہی۔ھو

پھر شام کے وقت لوگ گھروں کے باہر چوکوں اور نکڑوں پر لکڑیاں اکٹھی کر کے الاؤ جلاتے ہیں جس میں خاندان کے افراد دیر تک بیٹھ کر چوڑے، اخروٹ، مونگ پھلی، ریوڑیاں الاؤ میں ڈالتے ہیں اور خود بھی کھاتے ہیں۔الاؤ کے گرد لوگ چکر بھی لگاتے ہیں۔ لوہڑی جلانے کی رسم صوبۂ جموں میں صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔

ہاتھ کی تلی کو خارش ہونے لگے تو مانا جاتا ہے کہ کہیں سے آمدن ہوگی۔اگر کوئی اچھا کام کرنے لگیں اور چھینک آ جائے تو اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔اگر مُرغ شام کے وقت بانگ دے تو اسے منحوس مانا جاتا ہے۔بلی راستہ کاٹ دے تو اُسے بھی نحس مانا جاتا ہے۔کوئی گھر سے روانہ ہو تو جھاڑو دینے یا کپڑے دھونے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔اگر گھر میں کوئی برتن ٹوٹ جائے تو خیال کیا جاتا ہے کہ بُرا وقت ٹل گیا۔اگر دوائی کی شیشی ٹوٹ جائے تو اعتقاد ہے کہ اب مریض اچھا ہو جائے گا۔مرد کی داہنی آنکھ پھڑ کنے لگے تو اُسے اچھا سمجھا جاتا ہے اور اگر عورت کی داہنی آنکھ پھڑ کے تو اُسے بُرا مانا جاتا ہے۔ایسے بہت سے اعتقادات عوام میں مقبول ہیں جو لوگوں نے اپنی سوچوں اور تجربوں کی بنا پر وضع کئے ہیں۔یہ اعتقادات بلا لحاظ مذہب وملت، ذات وفرقہ سب میں پائے جاتے ہیں۔

صوبۂ جموں کے اہم مذہبی مقامات

شری ماتا ویشنو دیوی

شری ماتا ویشنو دیوی کا استھان ترکٹا پہاڑ پر 5300 فٹ کی بلندی پر اور قصبہ کٹرہ سے 13 رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ماتا ویشنو دیوی جی کے مقدس استھان پر ہندوستان بھر سے ہندو یاترا کے لیے آتے ہیں۔ آجکل کٹرہ تک گاڑیوں اور ریل سے سفر کیا جاتا ہے جبکہ پیدل یاترا کٹرہ قصبہ کے قریب سے شروع ہوتی ہے اور مقدس گپھا تک جاتی ہے۔ پہلے مقدس گپھا میں جانے کا ایک ہی راستہ ہوتا تھا جہاں سے یاتری اندر جاتے تھے اور پھر اُسی راستے سے باہر آتے تھے۔ اُس وقت ہر روز صرف پانچ ہزار یاتری درشن کر سکتے تھے لیکن اب تین ٹنل بنائے گئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ یاتری درشن کر سکیں۔ دو ٹنل ایسے ہیں جہاں ایک طرف سے یاتری مقدس گپھا میں داخل ہوتے ہیں اور دوسری طرف سے درشن کرنے کے بعد باہر نکلتے ہیں۔ مقدس مقام پر ماتا ویشنو دیوی شرائن بورڈ کی طرف سے جہاں یاترا کو آسان بنانے کا کام ہو رہا ہے اور صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے وہیں یاتریوں کی رہائش کے لئے انتظامات بھی کیے گئے ہیں اور نہ فائدہ نہ نقصان کی بنیاد پر کھانے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ کٹرہ سے مقدس گپھا تک یاتریوں کے پیدل چلنے والے راستوں کو آسان اور سیدھا بنایا گیا ہے۔ راستے میں بجلی، پانی اور شلٹر کے انتظامات بھی پختہ ہیں جبکہ نجی سطح پر کئی جگہوں اور مقدس گپھا پر لنگر بھی جاری ہیں۔ اس وقت ہیلی کاپٹر سروس بھی چل رہی ہے اور ہر روز تقریباً پچاس ہزار یاتری آسانی کے ساتھ مقدس گپھا میں ماتا ویشنو دیوی استھان کا درشن کر سکتے ہیں۔ اُدھر شرائن بورڈ کی جانب سے کٹریال گاؤں میں یونیورسٹی بھی قائم کی گئی

ہے تا کہ علاقے بھر کے طلباء تعلیم حاصل کر سکیں۔ کٹڑیال گاؤں میں ہی علاج ومعالجہ کے لئے سپر سپیشلٹی ہسپتال بھی کھولا گیا ہے۔ شرائن بورڈ ریاست کے گورنر کی صدارت میں کام کر رہا ہے۔ 1980ء تک ماتا ویشنو دیوی کی پوتر گپھا میں سالانہ صرف دس لاکھ یاتری آیا کرتے تھے اور مقدس استھان پر باری دار چڑھت وصول کیا کرتے تھے لیکن بعد میں گورنر جگموہن نے یاترا کو بڑھانے، یاتریوں کی سہولت کے لئے کام کرنے اور ترقی دینے کے لئے بڑے پیمانے پر اصلاحی کام کیے اور ماتا ویشنو دیوی شرائن بورڈ 30/اگست 1986ء کو تشکیل دیا جس کے صدر ریاست کے گورنر ہوتے ہیں۔ انہوں نے باری داروں والا نظام ختم کر دیا اور تمام انتظامات بورڈ کے تحت لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے 30 برسوں میں اس مقدس مقام پر بڑے پیمانے کے ترقیاتی کام ہوئے ہیں اور وہ یاترا جو ایک دن میں پانچ ہزار افراد تک محدود تھی بڑھ کر اب پچاس ہزار ہو گئی ہے۔

گپھا کے اندر ماتا ویشنو دیوی جی کا استھان تقریباً 125/فٹ کی دوری پر واقع ہے جہاں مقدس گنگا جی کا ٹھنڈا اور شفاف پانی ماتا کی پنڈیوں کے چرن کو صاف کرتا ہے۔ وہاں تین قدرتی پنڈیاں واقع ہیں جنہیں ماں سرسوتی، ماں لکشمی اور ماں کالی سے منسوب کیا جاتا ہے جو بالترتیب پیدا کرنے، قائم رکھنے اور ختم کرنے کی علامتیں مانی جاتی ہیں۔ یہ نہایت قدیم مقدس استھاپن ہے جس کا ذکر ویدوں اور دوسری مذہبی کتابوں میں آیا ہے۔

ساتویں صدی کے وسط میں جموں کے راجہ کیرتی دھر نے ترکٹا پہاڑ پر اپنی کسی غلطی کے لئے ماتا ویشنو دیوی کی گپھا میں آکر پرائشچت کیا تھا۔ ریاست باہو کے راجہ کرپال سنگھ نے اٹھارہویں صدی میں اس مقام پر ننگے پاؤں آکر پوجا کی تھی اور کٹڑہ میں درشنی دروازہ، بھونیشوری اور چرن پارکا کے مندر جو خستہ ہو چکے تھے اُن کی دوبارہ تعمیر کرائی تھی۔ بال گنگا سے ویشنو دیوی دربار تک ڈھکی بنوائی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جموں کے راجہ رنجیت دیو نے مقدس گپھا کا بیرونی دروازہ اور آرکماری کا مندر بنوایا تھا۔ علاقہ ڈوگر کے عظیم جرنیل میاں ڈیڈو ہر سال یاترا کے دنوں میں گپھا تک آنے جانے والے راستے کی

مرمت کرایا کرتا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ یہاں منت مانگنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ جب وہ مہاراجہ بنے تو سب سے پہلے ویشنو دیوی استھان کی تعمیر پر توجہ مرکوز کی۔ سونے کی ایک بڑی مورتی بنوا کر بھگوتی کو بھینٹ کی۔ یاتریوں کے قیام کے لئے دھرم شالہ بنوائی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کئی بار ماتا کے دربار میں حاضری دے کر درشن کیے۔ پھر 2 رنومبر 1884ء کو شری ویشنو دیوی پیٹھ کا اہتمام دھرم ارتھ ٹرسٹ کے اہتمام کے تحت کر دیا اور ماتا ویشنو دیوی پیٹھ میں 6 ستمبر 1876ء کو سدا برت زیر نگرانی کھڑ وشاہ جاری کیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کئی بار دربار پر حاضری دینے آئے تھے۔

بندہ بیراگی جن کا کٹڑا سے آدھا میل کے فاصلے پر ڈیرہ بابا بند کے نام سے موجود ہے ماتا ویشنو دیوی کے درشنوں کے لئے آیا کرتے تھے۔ 04-1903ء میں بندوبست کے دوران ماتا ویشنو دیوی گپھا اور کیری سے نیچے تمام جنگل جو نالہ جھجر اور پہی کے واٹر شیڈ کے درمیان ہے ماتا ویشنو دیوی استھان کی ملکیت کے طور ریکارڈ میں درج ہے۔

شومندر، بلاور

عہد رفتہ کا یہ ایک جاذب نظر تیرتھ ہے۔ یہاں شو کی تری مورتی ہے۔ پرانا مندر روز بروز خستہ ہو رہا ہے۔ یہاں عوام کا خیال تھا کہ جب بھی مندر کی چھت سے کوئی اینٹ گرتی ہے تو علاقے میں مصیبت آجاتی ہے۔ جبکہ سدھ مہادیو کے پرانے مندر کی مرمت کی گئی ہے۔

درگاہ پیر روشن شاہ ولیؒ

جموں کا راجہ سر بھا دھر ایک فراخ دل راجہ گزرا ہے۔ اُس کا زمانہ 583ء کے قریب بتایا جاتا ہے۔ اس راجہ کے عہد میں پہلا مسلمان فقیر جموں آیا۔ روایت ہے کہ اس فقیر کا نام پیر روشن شاہ ولیؒ تھا جو سیاحت کی غرض سے جموں پہنچا۔ یہ پیر صاحب کرامت بھی

تھا۔ اُس نے جموں میں گُمٹ کے اوپر ڈیرہ ڈال دیا۔ راجہ فقیر کے پاس روز جایا کرتا تھا۔ جب اُس کا آخری وقت نزدیک آیا تو اُس نے راجہ کو بُلا کر کہا کہ تمہارا راج قائم رہے گا۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کا لشکر ہندوستان فتح کرے گا لیکن جموں کی طرف کوئی نہ آئے گا۔ یہ کہہ کر فقیر رحلت فرما گیا۔ راجہ نے اُس کا مزار بنوایا جو آج بھی جموں گُمٹ گیٹ کے قریب موجود ہے۔ بلاتمیز مذہب وملت مزار پر لوگ مرادیں مانگنے آتے ہیں اور جمعرات کو چراغ روشن کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ یہ بڑا قدآور فقیر تھا اور نوگزیئے پیر کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ آج بھی اُسے نوگزیئے پیر کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ راجہ سربھادھر نے مزار پر مقبرہ بھی بنوایا تھا جہاں صدیوں تک پیر فقیر قیام کرتے رہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے دھرم ارتھ کے ذریعے پیر روشن شاہ ولیؒ کے مزار کو پختہ کروایا تھا اور اُسے مسلمان مجاوروں کے سپرد کیا تھا۔ مزار کے قریب ایک مسجد بھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ یہ مقام اب مسلم اوقاف ٹرسٹ کے تحت ہے۔ اسی طرح جموں شہر میں راجہ عجب دیو کے عہد میں پیر مٹھا مسلمان فقیر مست گڑھ کے نیچے رہائش پذیر تھا جو اپنی کرامات کے لئے جانا جاتا تھا۔ پیر مٹھا کا مزار مسلمانوں کی اہم زیارت گاہ ہے جو پیر مٹھا بازار کے قریب واقع ہے۔

جامع مسجد کے پاس گنبد والی زیارت ہے۔ پیر مٹھا کی زیارت کے بارے میں زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں لیکن جموں شہر کے عوام میں یہ ایک مقبول ترین زیارت ہے۔

درگاہ بابا غریب شاہ، سانبہ

یہ درگاہ ضلع سانبہ میں قائم ہے۔ حضرت غریب شاہ بڑے روحانی ولی تھے اور اُن کے دربار میں ہر مذہب کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ یہاں مقامی ہندو غریب شاہ زیارت کی دیکھ ریکھ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

زیارت بابا بڈھن شاہ

یہ زیارت جموں شہر سے آٹھ میل کے فاصلے پر ستواری سے تھوڑا آگے واقع ہے اور مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت مقبول ہے۔ یہاں ہر برس میلہ لگتا ہے۔

باوے والی ماتا

باوے والی ماتا کا تاریخی مندر جموں شہر کے قریب باہو قلعہ میں واقع ہے۔ یہاں مہا کالی کی مورتی نصب ہے۔ اتوار کے روز یہاں ہزاروں لوگ یاترا کے لئے آتے ہیں۔

مندر پیر کھو

یہ مندر دریا توی کے قریب مشرق کی طرف 30 فٹ گہرے غار میں قائم ہے۔ دائیں طرف غار کی اونچائی پانچ فٹ ہے۔ غار کے آخر پر کالے رنگ کا شولنگ استھاپت ہے جہاں عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

رگھوناتھ مندر، جموں

رگھوناتھ مندر شمالی ہندوستان میں ہندوؤں کی سب سے بڑی عبادت گاہ ہے جہاں ہزاروں عقیدت مند روز آتے اور پوجا پاٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ مندر جموں شہر کے عین درمیان میں واقع ہے جہاں سے رگھوناتھ بازار شروع ہوتا ہے۔ اس مندر کی تعمیر کا کام مہاراجہ گلاب سنگھ نے 1851ء میں شروع کیا تھا لیکن اس کی تکمیل مہاراجہ کی رحلت کے بعد 1854ء میں ہوئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس کا افتتاح کیا۔ یہ کمپلیکس سترہ

مندروں پر مشتمل ہے جہاں ہندو دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نصب ہیں لیکن سب سے درمیان والے مندر میں رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کی مورتیاں ہیں اور اسی وجہ سے مندر کمپلیکس کو رگھوناتھ مندر کہا جاتا ہے۔ جموں وگردونواح کے عقیدت مندوں کے علاوہ وہ یاتری جو ماتا ویشنو دیوی کے درشن کے لئے ہندوستان بھر سے آتے ہیں رگھوناتھ مندر میں بھی حاضری دیتے ہیں۔

رنبیر شو مندر

یہ بہت بڑا شو مندر ہے جسے ڈوگرہ عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مندر میں کالے پتھر کا سات فٹ اونچا شولنگ ہے جبکہ دو بڑے کمروں میں چھوٹے چھوٹے 1.25 لاکھ شولنگ نصب کئے گئے ہیں۔ اس مندر کو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تعمیر کروایا تھا جو گلاب بھون کے ساتھ شالہ مار روڑ پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ جموں شہر میں پنج بختر مندر، ناگ بنی کے قریب ناگ دیوتا کا مندر، دودھادھاری مندر، گدھادھر جی مندر اور اکھنور کا جیو پوتا مندر ہندوؤں کے اہم مذہبی مقامات ہیں۔

پُرمنڈل

جموں شہر سے چالیس کلومیٹر دور شمال مشرق میں تیرتھ استھان پرمنڈل واقع ہے جہاں دیوک ندی کے قریب مندروں کا ایک کمپلیکس موجود ہے۔ اس مقام کو چھوٹی کاشی بھی کہتے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا مندر اُماپتی کا ہے۔ اس کے اردگرد دوسرے مندر واقع ہیں۔ یہاں دور دور سے عقیدت مند آتے ہیں۔ صدیوں پرانے اس مقدس مقام پر شوراتری اور چیتر چودس کے دنوں میں میلہ لگتا ہے۔

گورودوارہ سری گورونانک دیو جی

یہ تاریخی گورو دوارہ صاحب مبارک منڈی جموں کے قریب واقع ہے جو گورونانک جی سے منسوب ہے۔ اس کے علاوہ نیا گورودوارہ گمٹ (سمادھی مہارانی چاند کے نزدیک) گورودوارہ نانک نگر، گورودوارہ آشرم ڈگیانہ سکھوں کے اہم مذہبی مقامات میں شامل ہیں۔

آستان باباچملیال

جموں کے رام گڑھ سیکٹر میں ہند پاک سرحد کے عین قریب باباچملیال کا آستان ہے جہاں سالانہ میلہ اساڑ کے مہینے میں ہوتا ہے۔ یہاں پر بابا دلیپ سنگھ کی درگاہ ہے جسے عام طور پر چملیال کہا جاتا ہے۔ یہاں زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے جس میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ میلے والے دن اس استھان کے قریب سرحد کو کھول دیا جاتا ہے اور پاکستان سے بھی عقیدت مند آتے اور چادر چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح جموں شہر میں جامع مسجد، تالاب کھٹیکاں اور ریذیڈنسی روڑ پر تاریخی چرچ، جیول چوک میں رومن چرچ اور گردھاری لعل ڈوگرہ روڑ پر سینٹ میری چرچ جموں کے قابل ذکر مقدس مقامات ہیں۔

اُدھر کٹھوعہ میں سکرالہ ماتا کا مندر بلاور سے دس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ جگہ کومل دیوی کے استھان کے طور پر بھی جانی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جوڑیاں والی ماتا، ڈھولا والی ماتا، شکتی ماتا، ماتا بالاسُندری، جسر وٹہ والی ماتا، چاموِنڈا دیوی اور درگاہ پیر فصل شاہ کٹھوعہ اہم مذہبی مقامات ہیں۔

اودھمپور میں سُدھ مہادیو اور مان تلائی کے مندر تقریباً 2800 سال پرانے ہیں۔ مندر میں کالے ماربل کا شولنگ اور ماتا پاروتی کی مورتی ہے۔ یہاں پر باباروپ ناتھ کی سمادھی بھی موجود ہے اور سینکڑوں برسوں سے یہاں اُن کی یاد میں لگاتار دھونی جل

رہی ہے۔ جیٹھ پورنما کے موقعے پر یہاں میلہ لگتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے اور مقدس دیوکا میں اشنان کرتے ہیں۔ یہاں مان تلائی آشرم بھی ہے جو اس مقام کو اور زیادہ خوبصورت بناتا ہے۔ تحصیل رام نگر میں پنگلا ماتا کا مندر واقع ہے۔ پنگلا ماتا کی گپھا میں تقریباً پانچ سو یاتری سما سکتے ہیں۔

ریاسی میں ماتا ویشنو دیوی شرائن کے علاوہ شوکھوڑی گپھا اہم مذہبی مقام ہے جہاں شو جی مہاراج کی قدرتی مورتی ہے۔ یہ مقام پونی بلاک میں پڑتا ہے۔ یہاں ہر سال شوراتری کے موقعے پر میلہ لگتا ہے۔

زیارت شاہدرہ شریف

زیارت شاہدرہ شریف صوبۂ جموں کی اہم ترین درگاہوں میں شمار ہوتی ہے جہاں تمام مذاہب کے لوگ ہر روز ہزاروں کی تعداد میں حاضری دیتے اور مُرادوں سے جھولیاں بھر کے لوٹتے ہیں۔ یہ مقام راجوری شہر سے 35 کلومیٹر شمال مشرق میں زتن پیر پہاڑی سلسلے کے دامن میں موضع شاہدرہ میں واقع ہے۔ یہ علاقہ فطرت کی آسودگی سے بھی مالا مال ہے۔ یہاں اٹھارہویں صدی کی عظیم روحانی شخصیت حضرت سید بابا غلام شاہ بادشاہؒ کا روضہ مبارک ہے۔

حضرت سید غلام شاہ بادشاہؒ کا اصل وطن راولپنڈی کے قریب گاؤں سیداں کسرواں تھا۔ صاحبِ مرحوم اپنے مرشد حضرت امام بری لطیفؒ کے حُکم پر دین کے فروغ اور دنیا کی بھلائی کے لئے آئے اور منزل بہ منزل آگے بڑھتے ہوئے 1765ء میں شاہدرہ شریف آئے (اُس وقت اس علاقے کو شہنہ درہ کہا جاتا تھا) اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ تقریباً چالیس برس یہاں قیام کے بعد آپ نے 1806ء میں رحلت فرمائی۔ صاحبِ موصوف تمام عمر لوگوں کی بھلائی اور انہیں حق و معرفت کی راہ پر چلانے میں محو رہے۔ اس

دوران حضرت موصوف کی راجوری کے راجہ کرم اللہ سے ان بن ہوگئی۔ راجہ کو سخت جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا اور پھر راجہ کی بیوی رانی بنسی ماہی راجہ کرم اللہ کو ساتھ لائی اور آپ کے حضور پیش کیا۔ حضرت موصوف نے رانی کی عاجزانہ التجاء اور راجہ کے معافی مانگنے پر انہیں معاف کر دیا۔ پھر حضرت موصوف کی دعا سے راجہ کو مصیبتوں سے نجات ملی اور اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اگر خان رکھا گیا جو کرم اللہ کے بعد راجوری کا راجہ بنا۔ راجہ اگر خان نے تکبر اور گھمنڈ میں غریبوں کو ستانا شروع کیا۔ حضرت موصوف نے پیغام بھیجا کہ ظلم بند کیا جائے ورنہ حکومت ختم ہو جائے گی۔ راجہ نے صاحبِ موصوف کے اقوال کی پرواہ نہ کی اور نہ ہی اپنا چلن بدلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1819ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اگر خان کی حکومت ختم کر دی اور اگر خان دوہرہ ڈنہ اور ناڑ فیروز الان میں آ کر چھپ گیا۔ 1822ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر جموں کا گلاب سنگھ (جو ابھی جموں کا راجہ نہ بنا تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک سردار تھا) اگر خان کی تلاش میں راجوری آیا اور لشکر کے ساتھ ڈیرہ گلی پہنچا، تو دوہرہ ڈنہ کے مقام پر زیارت شاہدرہ شریف کے سجادہ نشین سائیں خیر اللہ شاہ کا دیدار کرنے کے لئے گلاب سنگھ اُس مقام پر پہنچے جہاں وہ قیام فرما تھے۔ سجادہ نشین نے گلاب سنگھ کو بتایا کہ انہیں حضرت سید غلام شاہ بادشاہؒ نے خواب میں بشارت دی ہے کہ گلاب سنگھ جو ڈیرہ گلی میں اور خالصہ فوج کا جرنیل ہے ریاست جموں و کشمیر کا مہاراجہ بنے گا۔ چنانچہ اگر خان کو گرفتار کر کے گلاب سنگھ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچا تو مہاراجہ نے 1822ء میں گلاب سنگھ کو جموں کا مہاراجہ بنایا۔ پھر یہ بات اُس وقت حقیقت میں بدل گئی جب 1864ء میں وہ امرت سر معاہدے کے تحت جموں و کشمیر کا مہاراجہ بن گیا۔

یوں تو ہر روز یہاں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے لیکن حضرت موصوف کے عرس پر ریاست بھر سے زائرین اکٹھے ہوتے ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت کے بعد روضہ مبارک پر خاص دعا مانگی جاتی ہے۔ پھر نذر و نیاز کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں سدا بہار لنگر جاری رہتا ہے جہاں صرف ویشنو کھانا بنایا جاتا ہے اور زائرین (جن میں ہندو اور سکھ بھی شامل

ہوتے ہیں ایک ہی صف میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں)۔اس وقت شاہدرہ شریف کمپلیکس میں قیام اور طعام کے تمام انتظامات موجود ہیں اور زائرین کی سہولت کے لئے سرائیں اور ریسٹ ہاؤس بنائے گئے ہیں۔ اس زیارت کے نام پر اور معاونت سے راجوری میں غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی قائم ہوچکی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر برس تیس لاکھ زائرین جموں وکشمیر اور بیرون ملک سے آکر یہاں حاضری دیتے اور فیض حاصل کرتے ہیں۔ جب سے کنٹرول لائن پر آر پار جانے کے لئے راستے کُھلے ہیں تو اُس پار سے جو بھی مہمان ریاست آتا ہے وہ زیارت شاہدرہ شریف پر ضرور حاضری دیتا ہے۔عوام میں اعتقاد ہے کہ اس زیارت پر مانگی ہوئی مُراد پوری ہوتی ہے۔

گورودوارہ چھٹی پادشاہی، راجوری

گورودوارہ چھٹی پادشاہی، راجوری سکھوں کے چھٹے گورو ہرگو بند سنگھ مہاراج کی راجوری میں آمد کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ روایت ہے کہ سری نگر میں مائی بھاگ وتی نے گوروجی کے لئے پوشاک تیار کی تھی جسے وہ خود انہیں دینا چاہتی تھیں۔لیکن عمر زیادہ ہونے کے باعث وہ لاہور نہ جا سکتی تھیں۔ چنانچہ چھٹے گوروجی کے خواب میں آکر مائی بھاگ وتی نے انہیں کہا کہ وہ انہیں چولا (پوشاک) نذر کرنا چاہتی ہیں۔ مائی بھاگ وتی کی عقیدت سے متاثر ہوکر گورومہاراج (1646-1595) نے کشمیر آنے کا فیصلہ کیا اور پھر 1616ء میں شہنشاہ جہانگیر کے قافلے کے ساتھ لاہور سے سری نگر کے لئے روانہ ہوئے۔ جب شہنشاہ راجوری پہنچا تو اس نے سیلانی نالہ کے پار اپنا دربار لگا لیا جبکہ گورو ہرگو بند سنگھ جی مہاراج راجوری شہر میں آگئے اور کوتوالی کے سامنے اُس جگہ قیام کیا جہاں آجکل گورودوارہ صاحب قائم ہے۔آپ کی آمد کا سن کر راجوری کی سنگت نے آپ کو گھیر لیا۔ کچھ لوگوں نے شہنشاہ سے کہا کہ آپ کے دربار سے زیادہ لوگ گوروجی کی سنگت میں آرہے ہیں۔شہنشاہ

نے گورو جی کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کے دربار میں آ جائیں۔ گورو جی نے جواب دیا کہ اس صورت میں عوام مجھ سے مل نہ پائیں گے۔ اس لئے میں یہاں اپنا وقت سنگت میں گزارنا چاہتا ہوں تاکہ انہیں سچے راستے کی طرف راغب کیا جا سکے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد گورو جی شہنشاہ کے قافلے کے ساتھ سری نگر روانہ ہو گئے۔

چونکہ چھٹے گورو جی نے کچھ دن راجوری میں قیام کر کے عوام میں سکھی پرچار کیا تھا اور بہت سے لوگ آپ کے حلقہ میں آ کر سکھی ہو گئے تھے، اس لئے انہوں نے گورو جی کی آمد کی یاد میں ایک چھوٹا گورودوارہ تعمیر کرلیا۔ اُس وقت اُسے دھرم شال کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد راجوری نے زمانہ کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے لیکن یہ عبادت گاہ ہر دور میں قائم رہی۔ 32-1931ء میں راجوری تحصیل ضلع ریاسی کا حصہ ہوتی تھی جس کے وزیر وزارت سردار تیرتھ سنگھ تھے جو اکثر دورے پر راجوری آیا کرتے تھے۔ جب لوگوں نے انہیں اس گورودوارہ کی اہمیت بتائی تو انہوں نے کارسیوا کے ذریعے ایک اچھا گورودوارہ اس مقام پر بنوا دیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور اسے بنگلہ صاحب گورودوارہ بھی کہا جاتا تھا۔

1947ء کے واقعات کے بعد سردار ٹھاکر سنگھ، بھائی جگن ناتھ اور بھائی نانک چند نے مل کر گورودوارہ کمیٹی تشکیل دی اور 1960ء میں نیا گورودوارہ بنانے کا کام شروع کیا جس میں گورو دوارہ نگائی صاحب پونچھ کے مہنت بچھتر سنگھ کا تعاون اور مالی معاونت بھی شامل رہی اور پھر 2000ء میں چار منزلہ عمارت بن کر تیار ہوئی جس میں گورو دوارہ صاحب بھی شامل ہے۔ راجوری میں اگر چہ سکھ خاندانوں کے گنے چُنے گھر ہیں لیکن ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی گورودوارہ چھٹی پادشاہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یوں تو تمام گورو پورب یہاں مناتے ہیں لیکن گورو ہرگوبند سنگھ جی کا گورو پورب بڑی عقیدت و احترام اور روایتی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے جس میں مقامی ہندو بھی شامل ہوتے ہیں۔

دربار کھڑی شریف، میر پور

دربار کھڑی شریف میر پور صوبۂ جموں کی ایک اہم زیارت ہے۔ زیارت میں حضرت پیر دمڑی والی سرکار اور اُن کے مرید حضرت میاں محمد بخش کا روضہ مبارک موجود ہے۔ حضرت میاں محمد بخش جہاں عظیم روحانی شخصیت اور صوفی شاعر بھی تھے، وہیں عوام نے اُنہیں کشمیر کے رومی کے خطاب سے نوازا ہوا تھا۔ یہ درگاہ جو کنٹرول لائن کے اُس پار واقع ہے اور سرحد کے دونوں طرف روحانی اور تمدنی ورثے میں شمار ہوتی ہے۔ کنٹرول لائن کے اِس طرف جہاں اُن کے مریدوں کی بڑی تعداد قیام کرتی ہے وہیں علاقہ راجوری پونچھ میں اُن کا روحانی اور تصوف سے پُر کلام لوگوں میں اتنا مقبول ہے کہ عوام کو اُن کا کلام منہ زبانی حفظ ہے۔ یہ کلام ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کا تمدنی سرمایہ مانا جاتا ہے۔

حضرت میاں محمد بخشؒ چودہ کتابوں کے مصنف تھے لیکن اُن کی پہچان مثنوی سیف الملوک ہے جو پہاڑی زبان کی پہلی کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ایک خیالی داستان پر مبنی ہے لیکن صوفیانہ کلام، تصوف اور معرفت کی باتیں، عشق مجازی کا عشق حقیقی کی طرف سفر، روحانی رمز، دین اور دنیا کے معاملات، ذات اور ذات پاک کے رشتے عوام کی زبان میں اس طرح پیش کیے گئے کہ لوگ اپنے گھروں میں قرآن شریف کے بعد جس کتاب کو احترام کے ساتھ رکھتے ہیں حضرت میاں صاحب کی مثنوی سیف الملوک ہے۔ آپ کی زیارت کھڑی شریف میر پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ آجکل اس درگاہ شریف کو اسلامی خیالات پر تحقیق کے مرکز میں بھی بدل دیا گیا ہے اور کنٹرول لائن کے اُس پار مذہبی سیاحت کا اہم مقام ہے۔

حضرت میاں محمد بخشؒ کے والد دربار دمڑیاں والی سرکار کے سجادہ نشین تھے لیکن میاں محمد بخشؒ 16 ربرس کے تھے جب والد نے آپ کی روحانیت کی طرف رغبت دیکھ کر اپنی جگہ درگاہ شریف کا سجادہ نشین مقرر کیا۔ 19 ربرس کی عمر میں میاں صاحب نے درگاہ

میں قیام گاہ بنائی اور اپنے آپ کو روحانی کاوشوں اور صوفیانہ شاعری کے لیے اس طرح وقف کیا کہ شادی کرنے کی بھی فرصت نہ ملی۔ درگاہ شریف میں تمام عمر آپ خانقاہ کی خدمت، روحانیت کے فروغ، دین کے معاملات اور صوفی شاعری کے لیے کام کرتے رہے اور زندگی میں ہی آپ کو روحانی عظمت اور صوفی شاعری میں اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوا جو کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ وہ اتنے خود دار اور روحانی قدروں کے محافظ اور ہر وقت اللہ کی بندگی کرنے والی شخصیت تھے کہ ایک بار ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ آپ کے دربار میں حاضری دینے کے لیے کھڑی شریف آئے۔ حضرت موصوف اُس وقت عبادت میں محو تھے۔ آپ کے بھائی بہاول بخش نے آپ کو اطلاع دی کہ مہاراجہ آپ سے ملاقات چاہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ مہاراجہ سے کہہ دیں کہ اس وقت میں اپنے مہاراجہ کی بندگی میں ہوں جب فارغ ہوجاؤں گا تو دیکھ لوں گا۔ حضرت موصوف نے 1907ء میں رحلت فرمائی اور آپ کو خانقاہ دمڑیاں والی سرکار کے اندر ہی سپرد خاک کیا گیا جہاں آپ کی زیارت قائم ہے اور ہر روز ہزاروں کی تعداد میں زائرین یہاں آتے اور مُرادوں سے جھولیاں بھر کر لوٹتے ہیں۔

آستان سائیں گنجیؒ، راجوری

آستان سائیں گنجی، راجوری کی ایک جانی مانی صوفی درویش کی زیارت ہے جو وادیٔ درہال کے آخری حصے میں فتح پور گاؤں میں موجود ہے۔ یہ مقام راجوری شہر سے 11 رمیل شمال میں واقع ہے۔ ضلع راجوری اور پونچھ کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد اس زیارت سے جڑی ہوئی ہے۔

سائیں گنجیؒ کا پورا نام فتح محمد تھا۔ یہ پونچھ کے گاؤں پھاگلہ کے رہنے والے تھے اور 1920ء میں فتح پور راجوری آ گئے تھے۔ سائیں گنجی پہلی جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہوئے

اور سری لنکا بھیج دیئے گئے۔ وہاں اُن کی ملاقات ایک مسلمان روحانی شخصیت سے ہوئی جن سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ نوکری چھوڑ کر اُن کے پاس آ گئے اور مرید بن گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وطن واپس آ گئے۔ وانگت کشمیر میں حضرت بابا جی کے دربار میں چلے گئے اور وہاں سات ماہ تک چلہ کاٹا پھر فتح پور راجوری آ گئے۔ پھر تا حیات روحانیت میں محو رہے اور چلہ کشی کرتے رہے۔ آپ کئی بار رات کے وقت درہالی نالے کے ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر چلہ کاٹا کرتے تھے۔ اُن کے در پر جو بھی حاضری دیتا فیض حاصل کرتا تھا۔ اس لیے وہ روحانی طور پر عوام میں مقبول ہوتے چلے گئے۔

جب حضرت سائیں گنجی نے انتقال فرمایا تو لبھروٹ کے جاگیردار مرزا محمد حسین انہیں راجوری میں سپرد خاک کرنا چاہتے تھے لیکن دھنور راجوری کے گجر رہنما چوہدری دیوان علی فتح پور میں ہی اُن کا روضہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ بات پولیس تک پہنچی اور چوہدری دیوان علی انہیں فتح پور میں سپرد خاک کرانے میں کامیاب ہوئے جہاں آج اُن کی زیارت موجود ہے۔ سائیں گنجی کی رحلت کے بعد چوہدری لعل دین درگاہ کے سجادہ نشین مقرر ہوئے اور اس وقت اُن کے صاحبزادے چوہدری عبدالرشید زیارت کے معاملات دیکھ رہے ہیں۔

مندر و یر بھدریشور

بھدریشور مندر کی تاریخی اور تمدنی طور پر بڑی اہمیت ہے۔ یہ راجوری کا سب سے پرانا مندر ہے جو راجوری شہر سے 6 رکلومیٹر جنوب میں عین کنٹرول لائن پر ایک اونچی پہاڑی پر قائم ہے جہاں سے کنٹرول لائن کے اُس پار میرپور، کھوی رٹہ، سنہ اور کوٹلی تک کے علاقے نظر آتے ہیں۔ اس وقت یہ مندر فوج کی دیکھ ریکھ میں ہے کیونکہ یہ ہندو بستیوں سے کوسوں دور ہے۔ یہ مندر گھنٹیوں کے لئے بھی مشہور ہے اور یاتری مندر میں دوسری چیزوں کے علاوہ گھنٹیاں بھی چڑھاتے ہیں۔ اس وقت مندر میں شولنگ استھاپت ہے۔ اس مندر

کے ساتھ ایک پیر کا آستان بھی ہے جسے پیر بڈ سیر کہتے ہیں۔

اس مندر کی ایک دیوار میں ایک تختی نصب ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ مندر سمبت 141 ر میں تعمیر ہوا اور اسے شہنشاہ کنشک نے اُس وقت تعمیر کرایا تھا جب وہ شاردا یونیورسٹی میں چوتھی بُدھ کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے جو مظفر آباد کے علاقہ نیلم میں منعقد ہوئی تھی۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ کنشک بدھ مذہب کا حامی تھا۔ اُس نے کئی بدھ ویہار بنائے تھے اور اُس زمانے میں ان علاقوں کی آبادی بھی بدھ مت سے تعلق رکھتی تھی۔ اس سے لگتا ہے کہ پہلے یہ بدھ دھرم کی کوئی عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن آگے چل کر نویں صدی میں جب ایک بار پھر ہندو دھرم کو فروغ ملا اور بدھ مت کے ماننے والے علاقے میں نہ رہے تو یہ استھان مقامی ہندوؤں نے اپنی پوجا کا مقام بنا دیا ہو جہاں اب شولنگ استھاپت ہے۔

روایت ہے کہ ستی کے والد راجہ دکشا نے ہردوار میں ایک بڑا یگیہ کیا لیکن بھگوان شو کو نہیں بُلایا نہ ستی کو بُلایا اور ستی بُلائے بغیر یگیہ میں شامل ہوئی جہاں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا گیا۔ جب شو جی مہاراج کو علم ہوا تو انہوں نے غصے میں اپنے بالوں کا ایک گچھا زمین پر پھینک دیا جس کے ایک حصے سے ویر بھدر یشور کا جنم ہوا جنہوں نے ماں ستی سے نازیبا سلوک کا بدلہ لینے کا عہد کیا۔ پھر ویر بھدر یشور نے راجہ دکشا کو مار دیا اور خود کیلاش پربت کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کچھ وقت کے لیے وہ مندر ویر بھدر یشور کے مقام پر رُکے جہاں ان کی یاد میں یہ مندر بنایا گیا ہے۔

رادھا کشن مندر، راجوری

یہ مندر سیلانی نالہ کے پل کے جنوب میں ایک ریتیلی ڈھلوان پر واقع ہے اور ایک مربع چار دیواری کے احاطے میں بنا ہوا ہے۔ مندر کی چوٹی مخروطی شکل کی ہے۔ چونکہ یہ

مندر ایک اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے یہاں سے دُور دُور تک علاقہ راجوری نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر 1846ء سے 1856ء کے درمیان راجوری میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے چھشر وڑ (یعنی جو مہاراجہ کی داسی کے بطن سے تھا) میاں ہاٹھو سنگھ نے بنوایا تھا جنہیں راجوری کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔

مندر چنی پراٹ

آزادی سے پہلے آج کے قصبہ سندر بنی سے پندرہ کلومیٹر دور قصبہ چنی پراٹ ہوتا تھا جو راجوری سے ریاسی اور جموں کی پگڈنڈی پر واقع تھا۔ اُس زمانے میں یہاں رگھوناتھ جی کا مندر تعمیر ہوا تھا۔ یہ مندر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں تعمیر ہوا۔ کہتے ہیں کہ ایک سادھو وارانسی سے اس مندر کا ڈیزائن لایا تھا اور مہاراجہ کی مالی معاونت سے یہ مندر بنایا گیا تھا۔ آج چنی پراٹ قصبہ اُجڑ چکا ہے فقط مندر باقی ہے۔ اس مندر کی دیواروں پر تصویر کشی کی گئی ہیں جن میں بھگوان کرشن کی گوپیوں کے ساتھ اور دیگر تصاویر شامل ہیں۔ ان میں گرونانک دیو جی کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ یہ مندر علاقہ سندر بنی میں سب سے پرانا مانا جاتا ہے۔

دیگر آستان

ضلع راجوری کے بُدھل علاقے میں زیارت سائیں سوڑیاں، زیارت سائیں مُندریان اور زیارت سائیں پلنتر اداہم مذہبی مقامات ہیں جبکہ پرانے وقتوں کا ایک گورودوارہ بھی بدھل میں موجود ہے۔ اُدھر نوشہرہ تحصیل میں گورودوارہ چھٹی پادشاہی نوشہرہ، بھوانی ماتا کا مندر، زیارت شاہ لکھ جھنگڑ، آستان بیرم شاہ جھنگرا اہم مقامات ہیں جہاں عقیدت مند حاضری دینے آتے ہیں۔

اندرکوٹ مسجد، راجوری

یہ تاریخی مسجد راجوری قصبے کے اندر واقع ہے جس کی لمبائی 60 فٹ اور چوڑائی چالیس فٹ ہے۔شہر کے مغربی حصے میں یہ مسجد واقع ہے۔ مسجد کی اندرونی جگہ تین کمروں میں بٹی ہے۔ یہ کمرے دیواروں سے نہیں بلکہ دو محرابوں سے منقسم ہیں۔ درمیان کا ہال نما کمرہ اطراف کے حجروں سے بڑا ہے۔اس کا گنبد بھی دوسرے گنبدوں کے مقابلے میں بڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد جرال راجپوتوں کے ایک جانشین راجہ فقر اللہ نے تعمیر کرائی تھی۔

جامع مسجد، راجوری

یہ مسجد عہد مغلیہ غالباً شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت سے چلی آرہی ہے۔اس کی لمبائی اور چوڑائی بالترتیب 52 فٹ اور 43 فٹ ہے۔ گنبد نما مسجد کے آگے کھلا صحن ہے۔ مسجد تین حصوں میں منقسم ہے۔ اصلی مسجد کے اندر داخل ہونے کے لئے تین محراب دار دروازے بنے ہیں۔محرابیں سادگی کا نمونہ ہیں۔اس مسجد کو آج سے کچھ برس قبل دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔

پیر مستان شاہ غازی، بہروٹ درہال

یہ زیارت درہال میں موضع بہروٹ میں درہالی نالے کے قریب واقع ہے۔ یہاں سید خاندان کے ولی پیر مستان شاہؒ غازی کا آستان ہے۔ یہاں یوں تو ہر روز لوگ آتے ہیں لیکن عرس کے موقعے پر لوگ بڑی تعداد میں یہاں آکر حاضری دیتے ہیں۔

زیارت بابا جمعدار صاحب، ٹوپہ درہال

یہ زیارت بابا جمعدار صاحب کی ہے۔ آپ کا اصلی نام فلی خان تھا۔ فوج میں جمعدار تھے لیکن ہر وقت ریاضت میں محو رہتے تھے۔ کسی کو بھی اُن کے ولی ہونے کا علم نہ تھا البتہ درہال کے دو ملک نوجوان آپ کے ساتھ فوج میں تھے۔ انہوں نے ایک بار آدھی رات کے وقت دیکھا کہ فلی خان کمرے میں لٹکے ہوئے ہیں اور جسم کی کھال کو نیچے رکھا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ دوسرے دن فلی خان نے ملک زادوں کو کہا کہ وہ یہ راز کسی پر افشا نہ کریں۔ پھر نوکری سے سبکدوش ہوکر درہال آ گئے۔ یہاں اُس زمانے میں شالی کی فصل سفید ہوجانے کے باعث عوام کو بہت نقصان ہو رہا تھا۔ آپ نے دعا کی اور فصل ٹھیک ہوگئی۔ اس ولی کی زیارت پر ہر برس منگھر کے مہینے میں عرس ہوتا ہے۔ زیارت کے ساتھ ریّس کے درخت ہیں، جنہیں کوئی نہیں کاٹتا، ان درختوں کے درمیان یہ زیارت نہایت قابل دید ہے۔

درگاہ حضرت سید محمد شاہ فرید الدینؒ، کشتواڑ

حضرت سید محمد شاہ فرید الدین قادریؒ کا تعلق بغداد سے تھا۔ آپ سید مصطفٰے قادری کی اولاد میں سے تھے۔ وہ ایک ولی اور روحانی شخصیت تھی۔ صاحب موصوف کو خواب میں بشارت ہوئی کہ علاقہ جموں کے کشتواڑ خطے میں اسلام کے فروغ کے لئے کوچ کریں۔ آپ ہجرت کر کے شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان پہنچے۔ کچھ دیر دہلی میں رہے جہاں شاہی دربار میں آپ کا رسوخ ہوگیا۔ آپ نے کشتواڑ آنے کی خواہش ظاہر کی تو دہلی دربار کی جانب سے حافظ ابوالقاسم صدیقی حضرت موصوف کے ساتھ بغرض انتظام واہتمام آئے۔

حضرت سید شاہ محمد فرید الدینؒ اپنے چار مریدوں اور ابوالقاسم کے ہمراہ علاقہ جموں میں آئے اور کشتواڑ کا رُخ کیا۔ آپ کا قافلہ پہلے ڈینگ بٹل میں رُکا اور یہاں

دینِ اسلام کی داغ بیل ڈالی۔ ڈینگ بٹل میں حضرت موصوف کی آمد کی یادگار موجود ہے۔ پھر آپ رام بن آئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور تبلیغ کے کام میں مصروف رہے۔ یہاں بھی ایک یادگار حضرت موصوف سے منسوب ہے۔ پھر ڈوڈہ کا سفر کیا اور کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد کشتواڑ پہنچے جو منزل مقصود تھی۔

حضرت سید محمد شاہ فرید الدینؒ ایک مانے ہوئے ولی اللہ، روحانی شخصیت اور پاک سیرت بزرگ تھے۔ آپ کی بدولت کشتواڑ میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ 1664ء میں جب آپ کی آمد کشتواڑ میں ہوئی اور موصوف نے لچھی نارائن مندر کے قریب ایک مکان میں قیام کیا تو اُس زمانے میں کشتواڑ پر راجہ جے سنگھ کی حکمرانی تھی۔ حضرت موصوف نے راجہ جے سنگھ کو دین اسلام کی طرف راغب کیا اور راجہ جے سنگھ نے حضرت موصوف کے کہنے پر مذہبِ اسلام قبول کیا اور اپنا نام بختیار خان رکھا۔ حضرت موصوف کے ہمراہ جو چار مرید یعنی درویش محمد، یار محمد، سید بہاؤالدین اور سید شاہ ابدال کشتواڑ آئے تھے انہوں نے حضرت موصوف کا ہر طرح سے تعاون دیا۔ حضرت موصوف کے تین بیٹے یعنی اسرار الدین، انوار الدین اور احیا الدین تھے۔ بڑا بیٹا والد کی زندگی میں ہی فوت ہوا اور جس کا مزار میدان چوگان بازی کشتواڑ میں ہے۔ حضرت سید شاہ فرید الدین نے زندگی بھر اسلام کے فروغ کے لیے کام کیا۔ جب حضرت موصوف کا وصال ہوا تو قلعہ کے قریب مدفون ہوئے۔ حضرت موصوف کے بیٹے انوار الدین اور احیا الدین بھی اسی جگہ مدفون ہیں۔ اس زیارت کو کشتواڑ میں ہی نہیں بلکہ صوبۂ جموں کے ہر علاقے میں شہرت حاصل ہے اور عقیدت مند دور دور سے زیارت کے لیے یہاں آتے ہیں۔ آپ کے عرس میں ہر سال ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

اسیر کشتواڑی اپنے مقالہ ''حضرت شاہ فرید الدینؒ کی دینی خدمات'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت موصوف 1664ء میں کشتواڑ آئے تھے۔ آپ کی آمد سے پہلے چند مسلمان خاندان یہاں آباد تھے اور مسجدِ غریب نام کی ایک مسجد بھی موجود تھی۔ کیونکہ حضرت شیخ

نورالدین نورانیؒ (جوخود کشتواڑ سے تعلق رکھتے تھے) کے دوخلیفے حضرت شیخ زین الدین ریشیؒ اور حضرت شیخ لطیف الدین ریشی یہاں بالترتیب بھنڈارکوٹ اور انشن (مڑواہ) میں پیدا ہوئے تھے جو حضرت شیخ نورالدینؒ کے دوسرے اور تیسرے خلیفہ تھے۔ یہ دونوں نومسلم تھے لیکن عبادت، ریاضت اور محبتِ شیخ کاملؒ نے انہیں بلند مرتبے تک پہنچادیا تھا۔ اُن کے علاوہ حضرت زین الدین علی ڈار قصبہ کشتوار کے ڈار خاندان سے تھے۔ تاریخِ کشتواڑ کے مطابق اُن کے وارث سری نگر میں اُن کی زیارت عالیہ کے سجادہ نشین رہے ہیں۔ کشتواڑ کی ایک اور روحانی شخصیت حضرت بابا داور گہنی کی بھی ہے جو ہٹہ بیاری کشتواڑ کے رہنے والے حضرت نصیب الدین غازیؒ کے شاگرد عزیز اور موجودہ ضلع اننت ناگ کے بڑے حصے میں تبلیغ اسلام میں مصروف رہے تھے۔ حضرت شیخ زین الدین ریشیؒ، حضرت بابا لطیف الدینؒ، حضرت خواجہ زین الدین علی ڈارؒ اور حضرت بابا داور گہنیؒ بالترتیب عیش مقام (ضلع اننت ناگ)، پوشکر (ضلع بڈگام)، محلّہ زین ڈار صاحب اور گہن (ضلع اننت ناگ) میں مدفون ہیں۔ مگر ان تمام حقائق کے باوجود نہ صرف کشتواڑ بلکہ پورے خطہ میں مذہبی، لسانی، سماجی اور تمدنی انقلاب حضرت شاہ فریدالدینؒ کی تشریف آوری کے بعد رونما ہوا جنہیں صوبہ کی اسلامی تاریخ میں وہی درجہ دیا جاسکتا ہے جو کشمیر کی تاریخ میں حضرتِ امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کو حاصل ہے۔

حضرتِ شاہ فریدالدینؒ کا تعلق بغداد سے تھا۔ آپ بغداد سے دہلی آئے، پھر دہلی سے پنجاب، ڈینگ بٹل، گول سنگلدان، رام بن، راج گڑھ، ڈوڈہ، سدھ ون، کیشوان، ٹھاکرائی، کُڑیا اور بھنڈارکوٹ سے ہوتے ہوئے کشتواڑ پہنچے۔ آپ کے ہمراہ حضرتِ سعداللہ شاہ اور حضرتِ نادعلی شاہ بغدادیؒ جیسے علمائے حق بھی تھے جنہوں نے فروغِ اسلام میں حضرت موصوف کی معاونت کی۔ حضرت نادعلی شاہؒ کو ڈوڈہ سے ہی بھدرواہ کے راستے ڈوڈہ، بسنت گڑھ، چنینی اور رام نگر وغیرہ روانہ کیا گیا اور انہوں نے کلونتا گاؤں کو مرکز بنا کر دینِ اسلام کی شاندار خدمت کی اور رحلت کے بعد رام نگر میں سپرد خاک ہوئے جہاں اُن

کی زیارت موجود ہے۔ حضرتِ سعداللہ شاہؒ کشتواڑ سے کشمیر چلے گئے اور شاہ آباد میں مُقیم ہوئے۔

حضرتِ شاہ اسرارالدین ولیؒ جو حضرت شاہ فرید الدینؒ کے فرزندِ اوّل تھے، اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کشتواڑ میں ہی تبلیغِ اسلام میں مصروف رہے۔ جبکہ دوسرے بیٹے شاہ محمد احیاالدینؒ ولی نے کشمیر، پنجاب، چنینی، اودھمپور، گول، پوگل، پرستان وغیرہ علاقوں میں جا کر دین کی اشاعت میں اہم کام کیا اور دعوتِ دین میں مصروف رہے۔ شاہ محمد احیاالدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موصوف نے چالیس برس تک تبلیغ کا کام انجام دیا۔

خود حضرت شاہ فریدالدین بغدادیؒ کشتواڑ میں مقیم رہے اور 32 برس تک تبلیغِ دین میں سرگرم رہے۔ اسی طرح کشتواڑ جہاں سنسکرت کا دور دورہ تھا فارسی زبان سے مانوس ہو گیا اور آپ کی بدولت اس علاقے میں بڑے بڑے علماء وشعراء نے جنم لیا جن میں مولوی حمایت اللہ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جن کا علمی شہرہ پورے ملک میں تھا اور نواب بھوپال نے انہیں اپنے بیٹے کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ کشتواڑ کے راجاؤں میں سے بھی کئی طبع آزمائی کرتے تھے جن میں آخری راجہ تیغ محمد سنگھ بھی شامل تھا۔ حضرت شاہ صاحبان نے اپنی دینی کاوشوں سے کشتواڑ جیسے دور دراز اور پسماندہ علاقے کو بغداد ثانی بنا دیا۔ آپ کے باعث طالبانِ حق کی آمد بڑھتی رہی اور نئے چراغ روشن ہوتے رہے۔

حضرت شاہ محمد فرید الدین بغدادیؒ کے ساتھ اللہ والوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جن میں آپ کے چار خاص دوست حضرت درویش محمد، حضرت شاہ ابدال، حضرت سید بہاؤالدین اور حضرت یار محمد کو خاص حیثیت حاصل تھی۔ شاہ صاحب کے سندھ پہنچنے کے وقت خیر محمد وہاں کے نواب تھے جنہوں نے حکومت کو خیر باد کہہ کر کشتواڑ کا سفر اختیار کیا تھا۔ انہیں لکھنے پڑھنے اور حکومت کے کام کاج کی اچھی جانکاری تھی۔ اس لیے وہ شاہ صاحب کے تقریباً سارے دستاویز قلمبند کرتے رہے۔ شاہ ابدال صاحب (جو نام نواب خیر محمد کو اپنے مرشد پاک نے دیا تھا) ڈوگہ (کشتواڑ) گاؤں میں مدفون ہوئے جہاں 20 ہاڑ کو اُن کا عرس منایا جاتا ہے۔ یہ چاروں بزرگ ہدایت یافتہ متقی اور پرہیز گار تھے۔

حضرت سید بہاؤالدین، حضرت شاہ محمد اسرار الدین کے والد رضاعی بھی تھے جن کا مرقد زیارت گاہ اسراریہ کے صحن میں موجود ہے۔ حضرت درویش محمد اور حضرت یار محمد دربارِ فریدیہ کے صحن میں مدفون ہیں۔ ان بزرگوں نے دین اسلام کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ مستورات کو دینی تعلیم دینے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی ازواج زاہدہ بی بی، مائی روشن دل اور مائی ملاحت نے بھی بڑا کام کیا۔

حضرت شاہ محمد فریدالدین بغدادیؒ 1107ھ/ہجری مطابق 1494ء کو واصل بحق ہوئے۔ آپ کے جسد خاکی کو کشتواڑ میں اُن کی اپنی بیٹھک میں ہی آسودہ کیا گیا۔ سات ہاڑ یا 21-20 جون کو آپ کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر چناب خطے میں عام چھٹی ہوتی ہے۔ عرس کے موقعے پر آپ کی دینی خدمات کو اجاگر کیا جاتا ہے اور آپ کے تبرکات کی بھی زیارت کروائی جاتی ہے جو صدیوں سے دربار فریدیہ کی الماریوں میں محفوظ ہیں۔ حضرت موصوف کے عرس کے موقعے پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مُسلم بھائی بھی احترام کے طور پر شرکت کرتے ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ

حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ المعروف علمدارِ کشمیرؒ کشتواڑ کے ایک راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علمدار کشمیر کے خاص خلیفہ حضرت شیخ زین الدین ولیؒ کی اصل جائے پیدائش بھی کشتواڑ کا موضع بھنڈارکوٹ ہے۔ نام زیا سنگھ یا جیا سنگھ تھا اور حکمران خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے کشمیر جا کر حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور جیا سنگھ کی جگہ زین الدین نام رکھا۔ پھر حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور عبادت اور ریاضت کرتے رہے۔ حضرت بابا لطیف الدین صاحبؒ علاقہ مڑواہ واڑن سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت شیخ العالمؒ کے مقربین میں سے تھے۔

دشنامی اکھاڑہ، پونچھ

دشنامی اکھاڑہ پونچھ پرانے شہر کے جنوبی حصے میں فوہارہ باغ کے قریب واقع ہے۔ یہ استھان صدیوں سے مذہبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اور یہاں کئی اہم روحانی شخصیات نے مہنت کے طور پر کام کیا ہے جو عوام کو دھرم کا راستہ دکھانے کے علاوہ فرقوں کے درمیان محبت، دوستی اور بھائی چارے کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ اس وقت دشنامی اکھاڑہ میں ایک مانی ہوئی دھارمک اور تعلیمی شخصیت سوامی وشوآتما آنند جی کی قیادت میں فروغ پا رہا ہے۔ دشنامی اکھاڑہ پونچھ میں ہندوؤں کا اہم ترین مقدس مقام ہے جہاں آزادی سے پہلے ریاست پونچھ کے راجاؤں کو راج تلک بھی دیا جاتا تھا اور یہاں کے مہنت کو راج گورو کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اس وقت دشنامی اکھاڑہ کمپلیکس ہنومان جی کے پرانے استھان، لنگر خانہ، شومندر، سمپا والا مقام، یاتریوں کی سہولیت کے لئے مسافر خانہ، سماجی اور مذہبی کاموں کے لئے ایک وسیع ہال اور ایک بڑے خوبصورت پروچن استھل پر مشتمل ہے جہاں سماجی اور مذہبی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ پروچن استھل مقامی سماجی شخصیت لیش پال شرما، ایم۔ایل۔سی نے بنوا کر پونچھ کے عوام کو سنگت کے لیے دیا ہے۔ اکھاڑہ کمپلیکس 25 کنال اراضی کو محیط ہے۔ یوں تو ہر روز پونچھ شہر کے شردھالو اکھاڑہ مندر میں پوجا ارچنا کرنے کے لئے آتے ہیں لیکن شراون کی پورنماشی کے موقعے پر دشنامی اکھاڑہ سوامی بڈھا امرناتھ جانے والے یاتریوں کے لئے پڑاؤ کا کام کرتا ہے۔ دشنامی اکھاڑہ سے سوامی بڈھا امرناتھ یاترا پندرہ دن تک جاری رہتی ہے اور شراون پورنماشی سے دو دن پہلے یہاں سے چھڑی مبارک کا مذہبی جلوس برآمد ہوتا ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں سادھو، باہر سے آئے ہوئے یاتری اور مقامی بھگت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہ جلوس پونچھ سے مہنت اکھاڑی کی رہنمائی میں نکلتا ہے اور ہزاروں یاتریوں کے ساتھ 25 کلومیٹر سفر طے کر کے سوامی بڈھا امرنات منڈی پہنچتا ہے۔

دشنامی اکھاڑہ پونچھ ہندو مسلم بھائی چارے کی علامت بھی مانا جاتا ہے۔
تاریخِ اقوام پونچھ کے مطابق سترہویں صدی عیسوی میں پونچھ پر راٹھور مسلمان خاندان کی حکومت تھی لیکن 1747ء میں کشمیر کی طرف سے یلغار ہوئی اور اسلم یار خان نے قبضہ کر کے راٹھور حکومت کو اکھیڑ پھینکا اور راج کا حق دار علی گوہر خان جان بچانے کے لئے حاجی پیر کے دامن میں چرواہوں کے خاندانوں میں جا چھپا۔ ایک دن وہ بکریاں چرا رہا تھا کہ حاجی پیر کے راستے کشمیر سے ایک سادھو پونچھ کی طرف آیا۔ راستے میں اس کی علی گوہر سے ملاقات ہوئی۔ سادھو نے علی گوہر سے پانی مانگا۔ علی گوہر نے دودھ پیش کیا۔ سادھو دودھ پی کر خوش ہو گیا اور کہا کہ اس وقت کشمیر پر مغلوں کی حکومت ختم ہو چکی ہے اس لئے وہ کشمیر جائے اور افغانوں کی مدد لے کر پونچھ پر اپنی حکومت قائم کرے۔ چنانچہ علی گوہر کشمیر گیا۔ افغانوں سے مدد حاصل کر کے پونچھ کے مغل گورنر اسلم یار خان کو بھگا دیا اور پھر سے 1860ء میں راٹھوروں کی حکومت قائم کی۔ پھر علی گوہر کو پتہ چلا کہ وہ سادھو جو اسے حاجی پیر کے دامن میں ملا تھا پونچھ میں موجودہ دشنامی اکھاڑہ والی جگہ دھونی لگائے بیٹھا ہے تو راجہ اُس سادھو کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے راجہ کو کہا کہ وہ رستم خان کے لقب سے تخت پر بیٹھے۔ علی گوہر نے ایسا ہی کیا۔ پھر راجہ نے سادھو کو ہنومان جی کا مندر بنا کر دیا۔ رہنے کے لئے جھونپڑا تیار کروایا اور ایک جاگیر مندر کے ساتھ لگا دی۔ اس طرح دشنامی اکھاڑہ پونچھ وجود میں آیا۔ پونچھ پر مسلمان دورِ حکومت میں تیار ہونے والا یہ پہلا ہندو استھان تھا۔

ڈیرہ سنت پورہ، نگائی صاحب

ڈیرہ سنت پورہ نگائی صاحب جموں و کشمیر میں سکھوں کا سب سے اہم اور قدیم گورودوارہ ہے۔ ریاست میں سکھ مذہب کے فروغ میں اس گورودوارہ کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہ گورودوارہ پونچھ شہر سے چار کلومیٹر دور شمال میں درونگلی نالہ (دُرگا ندی) کے کنارے

پر نگائی گاؤں میں واقع ہے۔ تقریباً 218 برس قبل 1802ء میں ایک عظیم روحانی شخصیت ٹھاکر بھائی میلا سنگھ جی راولاکوٹ سے یہاں تشریف لائے اور علاقے میں سکھ دھرم کے فروغ کے لئے کام شروع کیا اور گورودوارہ قائم کیا۔ اُس زمانے میں اس گاؤں کو باولی کہا جاتا تھا لیکن ڈیرہ سنت پورہ نگائی صاحب کے وجود میں آنے کے بعد اس گاؤں کو بھی نگائی صاحب کہا جانے لگا۔

آج کل ڈیرہ سنت پور نگائی صاحب گورودوارہ کمپلیکس، ٹھاکر بھائی میلا سنگھ جی کی سمادھی، تپواستاھن (غار) تین منزلہ گورودوارہ عمارت جس میں قیام کے لئے پچیس کمرے بنائے گئے ہیں، لنگر ہال اور مہنت بچھتر سنگھ جی کی یاد میں بنے گورودوارہ صاحب کی عمارت، دواخانہ، لائبریری، مہمان خانہ اور اچھی خاصی کھلی جگہ پر مشتمل ہے۔ یہاں سنگتوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جس میں پونچھ کے علاوہ جموں وکشمیر، پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں سے یاتری یہاں آتے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ بیساکھی کے موقعے پر یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ملک بھر سے عقیدت مند شرکت کرتے ہیں۔ اُس روز یہاں اکھنڈ پاٹ کی سماپتی ہوتی ہے۔ شبد کیرتن اور ارداس اور بھوگ کے بعد لنگر تقسیم ہوتا ہے۔ پھر یہ مذہبی تہوار تمدنی میلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر سکھ نوجوانوں پر مشتمل بہت سی پارٹیاں گتکا کھیلتی ہیں اور تلوار چلانے کے فن کے نئے نئے کرتب دکھاتی ہیں۔ یہاں سدا بہار لنگر ہر روز جاری رہتا ہے۔

محمد دین فوق کی تاریخِ اقوام پونچھ کے مطابق دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی مہاراج نے خالصہ پنتھ کی بنیاد رکھنے کے بعد سنت بھائی پھیرو سنگھ، سنت بھائی پنجاب سنگھ اور سنت بھائی روچا سنگھ جی کو سکھ دھرم کے فروغ کے لئے پوٹھوہار اور علاقہ جموں وکشمیر میں روانہ کیا تھا۔ سنت بھائی پھیرو سنگھ جی (91-1640ء) پہلے ہزارہ علاقہ میں کام کرتے رہے۔ بھائی پنجاب سنگھ جی نے چھتر کھلاس مظفر آباد میں ڈیرہ قائم کیا اور سنت بھائی پھیرو سنگھ جی نے اپنے عقیدت مند سنت بھائی روچا سنگھ جی کو علاقہ پونچھ میں بھیجا۔ انہوں نے راولاکوٹ میں

گدی قائم کی جو کہ اب کنٹرول لائن کے اُس پار واقع ہے۔ سنت بھائی روچا سنگھ جی نے 1803ء میں وفات پائی لیکن اُس سے پہلے انہوں نے ٹھاکر بھائی میلا سنگھ جی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور بیساکھ 1803ء میں آپ راولاکوٹ ڈیرہ کے گدی نشین بنے تھے۔ پروفیسر نیتر سنگھ اپنی ڈیرہ ننگائی صاحب میں لکھتے ہیں کہ ٹھاکر بھائی میلا سنگھ بیس برس کی عمر میں گدی نشین ہوئے اور سنت بھائی روچا سنگھ جی کی سمادھی بنانے کے بعد اُسی برس راولاکوٹ سے پانچ سو سکھوں کے ہمراہ پونچھ آ گئے۔ اُس زمانہ میں پونچھ میں گُجر وزیر روح اللہ خان سانگو کی حکمرانی تھی لیکن گجروں اور راٹھوروں میں اقتدار کی کشمکش جاری تھی۔ اگر چہ روح اللہ نے ٹھاکر بھائی میلا سنگھ جی کو پونچھ اپنا ڈیرہ قائم کرنے کی دعوت دی لیکن سنت جی تنہائی میں سکون کے ساتھ ریاضت کرنے کے خواہاں تھے اور پونچھ میں حالات سازگار نہیں تھے۔ چنانچہ سنت جی نے چار کلومیٹر دور گاؤں بوئی میں قیام کیا جو ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ پھر آپ نے گاؤں ہی میں موجودہ گوردوارہ کے مقام پر ننگالوں کا جنگل صاف کروا کر گوردوارہ تعمیر کروایا، اپنا ڈیرہ قائم کیا اور ریاضت میں محو ہو گئے۔ 1814ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کشمیر پر حملے کے وقت پونچھ آئے۔ باولی گاؤں میں کیمپ لگا تھا اور ٹھاکر بھائی میلا سنگھ جی کے ڈیرہ پر حاضری دی تھی۔ بعد میں 1836ء میں جموں کے راجہ گلاب سنگھ پونچھ بغاوت کو دبانے کے لئے یہاں آئے تو آپ بھی سنت جی کے ڈیرہ پر ننگائی صاحب گئے اور جاگیر وغیرہ دی۔ 1854ء میں ٹھاکر بھائی میلا سنگھ نے اکال چلانا کیا۔ ان کے بعد سنت بھائی منا سنگھ جی، سنت بھائی اوتار سنگھ جی، سنت بھائی منگل سنگھ جی، سنت بھائی رتن سنگھ جی، سنت بھائی موہر سنگھ جی، سنت بھائی منگل سنگھ جی، سنت بھائی بچھتر سنگھ جی ڈیرہ کے گدی نشین رہے۔ سنت بھائی بچھتر سنگھ جی کے اکال چالانہ کرنے پر 2/نومبر 1991ء کو بھائی منجیت سنگھ جی ڈیرہ کے مہنت چُنے گئے جو اس وقت بھی لگن کے ساتھ سکھ دھرم کے فروغ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ آپ نے تعلیم کی طرف بہت توجہ دی اور ڈگیانہ جموں میں بی۔ایڈ کالج اور انجینئرنگ کالج کھول کر اہم کام سرانجام دیا ہے۔

مسجد میاں نظام الدین، پونچھ

یہ مسجد علاقہ پونچھ کے پہلے اور آخری وزیر اعظم میاں نظام الدین نے 1291 ہجری بمطابق 1872ء میں اپنے والدین کے لئے ثواب پانے کی خاطر تعمیر کرائی تھی جس کے قریب ہی حویلی میاں نظام الدین ہوا کرتی تھی۔ یہ مسجد شہر کے عین درمیان میں واقع ہے۔ اس مسجد میں مرکزی محراب کی بیرونی نقش نگاری کے اوپر تین گنبد ہیں۔ ان گنبدوں کے سامنے چھت کا محراب نما چھجا ہے۔ اس پر عربی حروف میں کلمہ مبارک کندہ ہے۔ وسطی محراب کے تین گنبدوں کی جانب دو چھوٹے چھوٹے مینار بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی خاص عمارت کے اوپر ایک ہی گنبد ہے۔ مغربی دیوار کے بیچ میں ایک گہرا محراب دار طاق ہے جس کا رُخ کعبہ کی جانب ہے۔ وقتِ نماز عبادت گزار اسی جانب سجدہ کرتے ہیں۔

آزادی سے پہلے مسجد نظام الدین کی بڑی مرکزی حیثیت ہوا کرتی تھی۔ اسے جامع مسجد کہا جاتا تھا۔ ساتھ میں میاں نظام الدین کی حویلی ہوا کرتی تھی جہاں مقامی لوگ نماز ادا کرنے آتے تھے، وہیں ریاست پونچھ کے علاقہ باغ سدھنتی اور مینڈھر کے لوگ جو کام کرنے کی غرض سے پونچھ آتے تو اسی مسجد میں نماز بھی ادا کرتے اور مسافر خانے میں پناہ لیتے تھے۔ اپنے فنِ تعمیر کے لحاظ سے گنبدوں والی یہ مسجد ریاست کی گنی چُنی مساجد میں شمار ہوتی تھی کیونکہ اُس زمانہ میں مقامی فنِ تعمیر سے مساجد بنائی جاتی تھیں۔ 1947ء کے واقعات کے بعد اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور اس مسجد کے قریب ہی شہر کے چوک کے پاس جامع مسجد بنائی گئی۔ 2010ء میں جامع مسجد کو ازسرِ نو ضرورتوں کے مطابق کشادہ کر کے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت اپنے فنِ تعمیر کے لحاظ سے ضلع کی بہترین مساجد میں شمار ہوتی ہے جہاں ہزاروں لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔

اللہ پیر، پونچھ

پونچھ شہر کے شمال مغرب میں موتی محل کے قریب حضرت اللہ پیر کا تاریخی آستانہ ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی سے قبل سکھ عہد کی یادگار مانی جاتی ہے۔ آزادی سے قبل اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور یہاں عقیدت مندوں کی ریل پیل رہا کرتی تھی لیکن آزادی کے بعد اس مذہبی مقام کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور زائرین کی آمد کا سلسلہ بھی کم ہوتا چلا گیا، کیونکہ اس آستان کے عقیدت مندوں کا بڑا حصہ 1947ء میں سرحد کے اُس پار رہ گیا تھا۔ اس طرح اللہ پیر کا مقام دھیرے دھیرے وقت کی آندھی کی نذر ہونے لگا لیکن ابھی کچھ برس پہلے یہاں اللہ پیر کی درگاہ اور مسجد شریف کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے اور زائرین کی آمد میں پھر سے اضافہ دیکھنے کو ملنے لگا ہے۔

مسجد بغیالاں، پونچھ

مسجد بغیالاں، پونچھ شہر کے شمال مشرق میں ہسپتال روڈ پر واقع ہے۔ یہ مسجد اپنے جدید فنِ تعمیر اور عمارت سازی کے لحاظ سے ضلع پونچھ کا اہم ترین مذہبی مقام ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ مسجد صدیوں پہلے جب یہاں مسلمان کی حکومت تھی، بفگیال خاندان کی ایک بزرگ شخصیت نے تعمیر کرائی تھی۔ 1947ء کے واقعات کے بعد ایک عرصے تک یہ مسجد غیر آباد رہی لیکن 2005ء میں پونچھ کی اہم دینی اور تعلیمی شخصیت مولانا غلام قادر نے اس مسجد کی دیکھ ریکھ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے آباد کیا۔ حضرت موصوف نے پھر یہاں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی لیکن 2005ء کے زلزلے میں یہ مسجد شہید ہوگئی۔ اُس کے بعد حضرت مولانا غلام قادر نے اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا ہے۔ چار منزلہ مسجد کی یہ عمارت اب پونچھ شہر کی نہایت قابلِ دید مسجد ہے جہاں چار ہزار کے قریب نمازی ایک وقت نماز ادا کرسکتے ہیں۔ یہاں دور دور گاؤں سے لوگ عید اور دوسرے تہواروں کے موقعے پر نماز میں

حصہ لیتے ہیں۔ حضرت مولانا غلام قادر مسجد کی دیکھ ریکھ کے علاوہ جامعہ ضیاالعلوم نام کے ایک ادارے کو بھی چلا رہے ہیں جہاں بچوں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ دورِ جدید کی تعلیم سے بھی نوازا جارہا ہے۔ مولانا موصوف چونکہ اب بزرگ ہو چکے ہیں اس لئے موصوف کی جگہ اُن کے صاحبزادے مولانا سعد صاحب یہ کام سنبھالتے ہیں جو بڑے پُرخلوص، منجھے ہوئے دانشور، دینی مبلغ ہیں اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور تمام مذہب میں اپنی رواداری کے باعث مشہور ہیں۔

سوامی بُڈھا امرناتھ، منڈی

سوامی بُڈھا امرناتھ، منڈی پونچھ میں ایک تاریخی مندر ہے جو صدیوں سے قائم ہے۔ روایت ہے کہ چکماک پتھر کے شولنگ والا یہ مندر جسے بابا چٹانی بھی کہا جاتا ہے بابا برفانی یعنی سوامی امرناتھ کشمیر سے بھی پرانا ہے اور شومہاراج نے پاروتی جی کو امر کتھا بابا چٹانی کے مقام سے سُنانی شروع کی تھی جو بابا برفانی کے مقام پر ختم ہوئی تھی۔ اصلی مندر ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے جس کے چار دروازے ہیں۔ یہاں چار مقدس چشمے بھی ہوتے تھے جن کے پانی کو کشید کر کے اب ایک جگہ سے جاری کیا گیا ہے۔ یاتری پہلے اس پانی میں اشنان کرتے ہیں پھر درشن کے لئے جاتے ہیں۔

سوامی بُڈھا امرناتھ، منڈی پونچھ شہر سے 25 کلومیٹر شمال اور منڈی قصبہ سے دو کلومیٹر شمال میں گاؤں راج پورہ میں گاگری ندی اور پلست ندی کے اتصال پر واقع ہے۔ یہ مقدس مقام چاروں جانب سے سربلند پہاڑی سلسلوں، پیر پنچال کی برف پوش چوٹیوں، ہرے بھرے کھیتوں، گھر، کوٹھوں اور روادار مکینوں کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے میں اگرچہ ہندوؤں کا ایک بھی گھر نہیں اس کے باوجود یہاں کے روادار مسلمان خاندان نہ صرف اس مقام کا احترام کرتے ہیں بلکہ ضرورت کے وقت ہر طرح کا تعاون بھی کرتے ہیں۔ یہ

مقام کشمیر جانے والے پرانے راستہ درہ توسہ میدان کے عین پونچھ کی طرف پڑتا ہے۔

پتھر کے قدیم مندر کے پاس 1990ء کی دہائی میں ایک بڑا مندر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ شرائن ٹرسٹ کی طرف سے یاتری سرائے بنائی گئی ہے جہاں ایک ہزار کے قریب یاتری ٹھہر سکتے ہیں۔ لنگر کی عمارت شمال کی طرف سے یاتریوں کو ہر وقت کھانا دستیاب رہتا ہے۔ اُدھر محکمہ سیاحت کی جانب سے یاتری نواس اور مہمان خانہ بھی یاتریوں کی سہولت کے لئے بنایا گیا ہے۔

یوں تو ہر روز یہاں یاتری آتے ہیں لیکن شراون پورنما کے موقعے پر سوامی بڈھا امرناتھ کے مقام پر بہت بڑا میلا لگتا ہے جس میں جموں و کشمیر کے علاوہ ملک بھر سے یاتری آتے اور پوجا میں حصہ لیتے ہیں۔ سوامی بڈھا امرناتھ کی یاترا شراون پورنما سے پندرہ دن پہلے شروع ہوتی ہے اور دو دن پہلے دشنامی اکھاڑہ پونچھ سے چھڑی مبارک جلوس 25 کلومیٹر پیدل سفر کر کے یہاں پہنچتا ہے جس میں ہزاروں یاتری حصہ لیتے ہیں۔

یہ مقدس مقام جو ہزاروں برس پرانا ہے کسی وقت زلزلے یا پسیاں گر آنے کے باعث زمین میں دھنس گیا تھا۔ پھر ہمالیہ میں شو جی مہاراج کی تپسیا کرنے والے ایک سادھو کو خواب میں شو مہاراج نے درشن دیئے اور کہا کہ فلاں جگہ میرا مندر زمین میں دھنسا ہوا ہے اُسے برآمد کرو۔ چنانچہ سادھو قدرتی اشاروں پر منڈی آ گیا اور کھدائی شروع کر دی۔ اُس وقت کشمیر پر سلطان زین العابدین کی حکومت تھی۔ انہیں علم ہوا تو اپنی فوج بھیج کر کھدائی میں تیزی لائی اور مندر برآمد کر کے ہندوؤں کے حوالے کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مندر کا علاقہ کشمیر اور بیرونی ملک کے درمیان تجارتی مرکز تھا جہاں کشمیر اور پنجاب سے آنے والے تاجر اپنا سامان بیچتے اور خریدتے تھے اور مندر کے قریب قیام کیا کرتے تھے۔ اس لیے بڈھا امرناتھ مندر کو بڑی اہمیت رہی ہے۔ 1947ء میں یہ مندر کچھ عرصہ کے لئے پاکستانی فوج کے قبضے میں رہا پھر بعد میں واپس لیا گیا اور عوام کے سپرد کر دیا گیا۔ اُس کے بعد آج تک سوامی بڈھا امرناتھ کا مندر عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے۔

زیارت سائیں بابا میرا بخشؒ، گونتریاں

گونتریاں گاؤں عین کنٹرول لائن پر واقع ہے جو کہ تحصیل حویلی میں ڈوڈہ پہاڑی سلسلے میں واقع ہے اور پونچھ شہر سے تقریباً 26 کلومیٹر شمال میں پڑتا ہے جہاں حضرت بابا میراں بخشؒ کی درگاہ قائم ہے۔ یہ مقام پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔

درگاہ شریف کے ایڈمنسٹریٹر مرزا محمد امین نے بتایا کہ درگاہ کمپلیکس حضرت بابا میراں بخش کے روضہ شریف جو سنگ مرمر سے تعمیر ہوا ہے، دومنزلہ مسجد، لنگر خانہ، ہال اور مہمان خانے پر مشتمل ہے اور یہ زیارت 40 کنال اراضی پر پھیلی ہوئی ہے۔ یوں تو ہر روز حضرت موصوف کی درگاہ پر زائرین کا میلا لگا رہتا ہے لیکن آپ کے عرسِ مبارک پر ہزاروں زائرین یہاں آتے ہیں۔ روضہ شریف پر حاضری دیتے اور فیض یاب ہوتے ہیں۔ زائرین میں ہندو اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہوتی ہے۔ آپ کا عرس 27 ذی القعدہ کو ہوتا ہے جو چاند کی تاریخ کے حساب سے بدلتا رہتا ہے۔

حضرت سائیں بابا میراں بخشؒ سرکار بہت بڑی روحانی شخصیت تھی۔ آپ کی زندگی میں عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو وصال کے بعد بھی جاری ہے۔ آپ کے قریب جو آتا پہلے اُسے سوٹی سے پٹائی کرتے، گالیاں سُناتے پھر اُن سے آنے کی وجہ پوچھتے، دعا کرتے اور اس طرح لوگ مرادوں سے جھولیاں بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ حضرت موصوف لمبا نیلا کُرتہ پہنتے تھے۔ گھاس کی چپل (پولی) استعمال کرتے تھے اور چائے کے بہت شوقین تھے۔ وہ صوفی بزرگ تھے اور مانے ہوئے ولی تھے۔

آپ کا پورا نام سائیں میراں بخش اعوان تھا۔ آپ کے والد محمد عزیز عام طور پر متو کے نام سے جانے جاتے تھے اور رینکڑی گاؤں میں رہتے تھے جو اب کنٹرول لائن کے اُس پار واقع ہے۔ جب حضرت موصوف سات برس کے تھے تو علاقہ سدھروں کے جاگیردار راجہ غلام محمد کے ہاں نوکر ہو گئے اور پھر پیر نور الدین کے مرید ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد موصوف

نے راجہ غلام محمد کی ملازمت چھوڑی اور رینکڑی آ گئے اور پیر نور الدین کے پاس رہائش اختیار کی۔ 1943ء میں پیر نور الدین مریدوں کے ساتھ گونتریاں آئے تو حضرت موصوف سے فرمایا کہ وہ یہاں قیام کریں۔

1947ء کے واقعات کے بعد حضرت موصوف کنٹرول لائن کے اُس پار رینکڑی میں تھے لیکن آپ گونتریاں آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سرحد پار کی اور یہاں آ گئے مگر انہیں گرفتار کر کے واپس بھیج دیا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ پونچھ شہر میں آ گئے اور اس بار برگیڈئر پریتم سنگھ کے پاس حاضر ہوئے جنہوں نے انہیں سرحد پار بھیج دیا۔ کہتے ہیں کہ دوسرے ہی روز برگیڈئر پریتم سنگھ کو واپس بلایا گیا تھا۔ 1954ء میں حضرت موصوف نے تیسری بار کنٹرول لائن پار کی اور پونچھ آ گئے۔ آپ کو سپرانٹنڈنٹ پولیس کے روبرو پیش کیا گیا جنہوں نے انہیں اس طرف رہنے کی اجازت دلانے میں مدد کی۔ پھر آپ کچھ دن منڈی میں غلام رسول گریشتا کے گھر رہے۔ پھر پونچھ شہر میں 1960ء میں آ گئے اور الطاف حسین شاہ کے پاس رہے لیکن آپ کے عقیدت مندوں نے آپ کے ہاں حاضری دینے اور مرادیں مانگنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ آپ پونچھ سے تکیہ شریف چھچیاں آئے پھر وہاں سے گونتر چلے گئے۔ وہاں اکبر دین نامی شخص نے جب حضرت موصوف کی روحانی طاقت کے بارے میں سُنا تو تین کنال زمین دی اور کچا مکان دیا جو آپ کی قیام گاہ بنی اور پھر یہاں ہی 26/اگست 1986ء کو حضرت موصوف کا وصال ہو گیا۔ روایت ہے کہ 1971ء کی جنگ میں جب سرحد پار سے فوج اندر آ گئی تو سرحد کے قریب رہنے والے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ ان نامساعد حالات میں وہ کیا کریں۔ حضرت موصوف نے لوگوں سے کہا کہ سرحد پار سے آنے والی یہ فوج ٹک نہ پائے گی اور جلد واپس چلی جائے گی۔ چنانچہ تیسرے دن دراندازوں کو واپس جانا پڑا۔ چونکہ یہ گاؤں عین سرحد پر واقع ہے اس لیے 1971ء کی جنگ کے دوران حضرت موصوف نے اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ ایک لمبی دیوار بنائیں پھر سرحد پار سے کوئی اس طرف نہ آ سکے گا اور ایسا ہی ہوا۔

زیارت سائیں الٰہی بخشؒ، بٹل کوٹ لورن

زیارت سائیں الٰہی بخشؒ پونچھ شہر سے 39 کلومیٹر مشرق میں تحصیل منڈی کے موضع بٹل کوٹ میں واقع ہے جولورن سے چار کلومیٹر کی دوری پر ہے۔اس جگہ کے آسودہ ماحول، چاروں جانب پہاڑی سلسلوں، گھنے جنگلوں اور شفاف ندی کو مدنظر رکھتے ہوئے سائیں الٰہی بخشؒ نے ریاضت اور چلہ کشی کے لئے اس مقام کو چُنا اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔آپ مانے ہوئے درویش، ولی اللہ اور صوفی ازم کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔آپ 1948ء میں یہاں تشریف لائے تھے اور اپنے روحانی کارناموں کے باعث سارے علاقے میں مشہور تھے اور دور دور سے لوگ مراد مانگنے کے لئے یہاں آیا کرتے تھے اور آپ کے وصال کے بعد جہاں آپ مدفون ہوئے وہاں ایک بڑی زیارت تعمیر کی گئی اور زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔

آپ نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔قہوہ اور ستو عام طور پر آپ کی خوراک تھی۔موصوف شام پانچ بجے تک زائرین سے ملتے تھے اور پھر کسی کو اُن کے کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔وہ باقی کا وقت چلہ کشی اور عبادت میں گزارتے تھے۔گاؤں والے بتاتے ہیں کہ رات کے وقت ایک قریبی پہاڑ پر بیٹھتے تھے اور ''تو ہی تو'' کا ورد کرتے رہتے تھے۔

سائیں صاحب کا آبائی گاؤں پٹھانہ پیر مینڈھر تھا۔ والد پونچھ آئے اور راجہ صاحب کی ملازمت اختیار کی۔آپ کا گھر ضلع ہسپتال کے قریب واقع تھا۔ بنیادی تعلیم کے بعد سائیں صاحب دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہوگئے۔ جب وہ بصرہ میں تھے تو انہیں کچھ روحانی اشارات ملے۔موصوف نے ملازمت ترک کی اور درویشی اختیار کرلی اور گھربار کو خیرباد کہہ دیا۔ایک بار والدہ محترمہ نے آپ کو گھر آنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا کہ درویشوں کا گھر نہیں ہوتا۔ پھر موصوف بٹل کوٹ کے علاقے میں چلے گئے اور وہیں جھونپڑی بنا کر رہائش کی۔ اسی دوران آپ حضرت شیخ نور الدین نورانیؒ کی زیارت

چرار شریف جاتے رہے اور علمدار کشمیر کی تعلیمات سے متاثر رہے۔ آپ کا وصال 13 مئی 1976ء کو بٹل کوٹ میں ہوا۔ وصال سے قبل انہوں نے آخری مقام کی نشاندہی کر دی تھی جہاں وہ دفن کیے گئے اور زائرین کے قافلے آپ کی درگاہ پر آنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے آپ کا عرس مقامی رہنما غلام محمد جان نے منانا شروع کیا۔ پھر 92-1991ء میں اسسٹنٹ کمشنر پونچھ غلام قادر مغل نے اس درگاہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور دیکھ ریکھ کے لیے انتظامیہ کمیٹی تشکیل دی۔ آگے چل کر غلام محمد جان نے جو ایم۔ ایل۔ اے بن گئے تھے، اس مقام کے ساتھ زبردست دلچسپی دکھائی اور روضہ شریف، مسجد، کمیٹی ہال، لنگر وغیرہ کی عمارتیں بنوائیں۔ اب یہ درگاہ ضلع پونچھ میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے جہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی شرکت کرتے ہیں۔ پریتم سپر یچول ٹرسٹ پونچھ کی جانب سے ہر سال عرس کے موقعے پر لنگر لگایا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

زیارت خانقاہ معلیٰ، پونچھ

زیارت خانقاہ معلیٰ پرانی پونچھ کو 1947ء سے قبل زبردست اہمیت اور فروغ حاصل تھا اور تحصیل باغ، سدھنتی کے زائرین دور دور سے چل کر یہاں مرادیں مانگنے آتے تھے۔ یہ سادات قادریہ گیلانیہ کا آستان ہے جو دہلی سے یہاں آئے تھے۔ پونچھ میں اس شاخ کے حضرت سید عبدالقادرؒ نے سب سے پہلے رہائش اختیار کی۔ موصوف بڑے مشہور ولی اللہ اور روحانی شخصیت تھے اور اسلامی تعلیمات سے مریدوں کو نوازتے تھے۔ ایک بار وہ محمد شاہ غازی کے عہد میں کشمیر آئے جب امیر خان (36-1728ء) کشمیر کے گورنر تھے۔ پھر وہ پونچھ آ گئے۔ یہاں آپ کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں اور انہیں آستان کے قریب دفن کیا گیا۔ چنانچہ سید عبدالقادر گیلانی نے یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ موصوف نے یہاں مسجد تعمیر کی، گھر بنایا اور رہنے لگے۔ دھیرے دھیرے مریدوں کا حلقہ بڑھنے لگا اور پھر اپنی روحانی

کاوشوں سے اس قدر مقبول ہوئے کہ عوام نے پرانے پونچھ علاقہ کو خانقاہ معلیٰ کہنا شروع کیا۔
شاہ محمد غازی نے عبدالقادر گیلانی کو جاگیر سے نوازا اور آپ اسلامی تعلیمات کے مطابق عوام کی خدمت کرنے لگے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد صاحبزادہ شاہ محمد ابراہیم 1739ء میں سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ وہ بھی معمر روحانی شخصیت تھے اور میرپور کوٹلی، باغ سدھنتی، ریاسی اور کشمیر سے مرید فیضان حاصل کرنے کے لئے آپ کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے۔ موصوف نے 1743ء میں رحلت فرمائی اور سید شاہ شمس سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ اُس وقت کشمیر پر افغان گورنر نورالدین خان دُرانی کی حکومت تھی جنہوں نے شاہ شمس کو ایک اور جاگیر سے نوازا۔ سید شاہ شمس نے 1766ء میں انتقال کیا تو اُن کے بیٹے سید شاہ تاج الدین سجادہ نشین بنے۔ پونچھ میں راجہ امیر خان سانگو کی حکومت تھی۔ اس دور میں سید شاہ تاج الدین پونچھ سے کوٹلی چلے گئے جہاں کوٹلی کے زمینداروں نے آپ کو جاگیر سے نوازا۔ سید تاج الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی وفات کے بعد شاہ سراج الدین سجادہ نشین بنے۔ اُس زمانے میں پونچھ میں سکھوں کا دورِ حکومت تھا اور 1820ء میں پونچھ کے گورنر دھن پت رائے نے درگاہ کے ساتھ جاگیر کا سلسلہ جاری رکھا۔
1852ء میں ڈوگرہ راجہ موتی سنگھ پونچھ کے راجہ بنے تو آپ نے خانقاہ معلیٰ پونچھ کا نہ صرف احترام کیا بلکہ جاگیر اور پٹے بھی منظور کیے۔ آپ سجادہ سید فقر شاہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اسی دور میں سید فقر شاہ رحلت فرما گئے اور اُن کے بیٹے سید شہاب الدین سجادہ نشین بنے۔ 1905ء میں جب پونچھ کے راجہ بلدیو سنگھ لاہور میں تھے تو مقامی افسران نے خانقاہ کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور جاگیر ضبط کی۔ جاگیر تو راجہ نے بعد میں واگزار کر دی لیکن تب تک سید شہاب الدین 1907ء میں انتقال کر چکے تھے۔
سید شہاب الدین کے وصال کے بعد پیر حسام الدین خانقاہ کے سجادہ نشین بنے تو 14 راگست 1907ء کو پونچھ کے راجہ بلدیو سنگھ نے آپ کے سجادہ نشین ہونے کی تصدیق

کی اور جاگیریں اور پٹے بھی واگزار کیے۔ حسام الدین ایک روحانی شخصیت ہی نہ تھے بلکہ اسلامی دانشور، سوشل ریفارمر اور سیاسی شخصیت بھی تھے۔ آپ نے انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور بچوں کی تعلیم کے لئے سکول کھولا جنہیں راجہ پونچھ کی پذیرائی بھی حاصل رہی۔ آپ نے بھی 1915ء کے فسادات کو قابو کرنے کے لئے راجہ صاحب پونچھ کی معاونت کی۔ راجہ بلدیو سنگھ کے بعد راجہ سُکھ دیو سنگھ 1921ء میں پونچھ کا راجہ بنا تو کشمیر دربار کی طرف سے پونچھ ریاست کا درجہ کم کر کے جاگیر کر دیا اور یہاں سے اسپیشل ریذیڈنٹ کو واپس بلا لیا، جس کی وجہ سے علاقہ بھر میں کشمیر دربار کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ پیر حسام الدین نے پونچھ کے راجہ کو بھی اپنے ساتھ کر لیا اور مزاحمت جاری رکھی۔ چنانچہ کشمیر دربار نے فوج بھیج کر جہاں حالات پر قابو پایا راجہ پونچھ کو علاقہ سے باہر بھیج دیا وہیں پیر حسام الدین کو بھی ملک بدر کر دیا۔ پھر دو برس کے بعد پیر حسام الدین کو وطن لوٹنے کی اجازت ملی۔

پیر حسام الدین نے نئی مسجد تعمیر کی اور سید شاہ عبدالقادر کا دومنزلہ روضہ شریف بنایا اور زیارت سے لنگر جاری کیا۔ وہ اسلامیات پر عبور رکھتے تھے اور عوام میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ اُن کا بیٹا سید شاہ محمد تھا اور ایک بیٹی زینب النساء تھی۔ 1947ء کے واقعات کے بعد سید شاہ محمد کنٹرول لائن کے اُس پار کوٹلی چلے گئے اور یہ خانقاہ ایک عرصے تک غیر آباد رہی۔ زینب النساء جو کشمیر چلی گئی تھی پونچھ آئیں اور خانقاہ کی دیکھ ریکھ کرتی رہیں۔ آپ کی وفات کے بعد اوقاف ٹرسٹ نے خانقاہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب یہ زیارت ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا تشخص حاصل کر رہی ہے۔

زیارت حضرت پیر مقبول شاہ، پمروٹ سورن کوٹ

حضرت سید پیر مقبول شاہ جو عوامی طور پر حضرت پیر متُو کے نام سے مقبول تھے، ایک روحانی شخصیت، سماجی ریفارمر اور خدا دوست ہستی تھے۔ آپ کی زیارت پمروٹ شریف میں اپنے والد حضرت سید پیر حبیب اللہ شاہ بُخاری کی زیارت کے قریب واقع ہے۔ یہ درگاہ

قصبہ سورن کوٹ سے چار کلومیٹر مشرق کی طرف پمروٹ گاؤں میں واقع ہے۔ جہاں روضۂ شریف کے علاوہ زائرین کے لیے کمیٹی ہال، مدرسہ اور لنگر بھی ہے۔ یہاں ہر روز زائرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن آپ کے عرس کے موقعے پر ریاست بھر سے ہزاروں لوگ یہاں آتے ہیں۔ حضرت سید پیر مقبول شاہ کی پیدائش 1915ء میں پمروٹ میں ہوئی۔ جب آپ کی عمر چار برس کی تھی تو والد محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ کو سات برس کی عمر میں اسلامی تعلیم کے لئے ضلع ہزاراں بھیجا گیا جہاں وہ چودہ برس رہے۔ پھر پیر مہر علی شاہ سے متاثر ہوئے جنہوں نے ضلع ہزاراں میں ختم نبوت کی تحریک چلائی تھی۔ 1936ء میں پمروٹ آگئے اور شادی کے بعد علاقے بھر میں اسلامی اصولوں اور روایات کے فروغ میں جُٹ گئے اور چلہ کشی بھی کرتے رہے۔ روحانیت کی طرف مائل ہوگئے۔ گاؤں گاؤں جا کر عوام میں دین کی تبلیغ، اسلامی اقدار پر چلنے کی تلقین اور عوام کی روحانی نشو ونما میں محو رہے۔ اس طرح آپ نہ صرف ضلع پونچھ بلکہ ریاست بھر میں مقبول ہوتے چلے گئے اور آپ کے مریدوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ چونکہ حضرت موصوف پڑھے لکھے اور لیاقت رکھنے والی شخصیت تھے، اس لیے آپ کی روحانیت بھی اسلامی دائرے کے اندر تھی۔ آپ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ اور عُشر جیسے اسلام کے بنیادی اصولوں کا مریدوں کو پابند کرتے رہے۔

صاحبِ موصوف دسمبر 2001ء میں بیمار ہوئے تو اپنے صاحبزادے پیر مشتاق حسین شاہ بخاری کو بتایا کہ وہ 13 رجنوری 2002ء کو عمرہ پر جائیں گے اس لئے اُن کا سامان تیار کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد وہ زیادہ علیل ہوگئے اور 13 رجنوری 2002ء کو رحلت فرما گئے۔ آپ کے جسد خاکی کو پمروٹ میں والد صاحب کے روضہ مبارک کے قریب مدفون کیا گیا جہاں اب ایک شاندار درگاہ تعمیر ہوئی ہے۔ مریدوں کا سلسلہ جاری ہے اور صبح وشام لنگر تقسیم ہوتا ہے۔

رام کُنڈ مندر، مینڈھر

رام کُنڈ مندر عہد رفتہ کی تمدنی میراث کی علامت مانا جاتا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ خوبصورت مندر شاہ ستار پہاڑ کے دامن میں علاقہ مینڈھر میں راجہ للتا دتیہ نے 742-61ء میں تعمیر کروایا تھا کیونکہ اس کا طرزِ تعمیر اور اس کی عمر وہی ہے جو راجہ للتا دتیہ کے کشمیر میں تعمیر کردہ مندروں کی ہے۔ اس مندر میں مذہبی طور پر ایک تاریخ پنہاں ہے۔ چونکہ یہ مندر اُس علاقے میں واقع ہے جہاں ہندو آبادی نہ ہونے کے برابر رہی ہے، اس لئے اس تاریخی مقام کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن اب اس کی پرانی شان دھیرے دھیرے بحال ہو رہی ہے۔

رام کنڈ مندر نرول گاؤں کی گھاٹی میں واقع ہے جو قصبہ مینڈھر سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت یہاں مندر کے علاوہ پانی کے تین کُنڈ یعنی رام کنڈ، لچھمن کنڈ اور سیتا کنڈ جن میں مندر کے قریب سے شفاف پانی کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔ ان کنڈوں کے ساتھ رام کنڈ کا قدیم مندر واقع ہے۔ اس وقت مندر میں ہنومان جی کی مورتی نصب ہے جو حال ہی میں یہاں رکھی گئی ہے۔ مندر کے شمال میں پجاری کی رہائش گاہ ہے جبکہ حال ہی میں رامائن بھون اور کچھ دوسری عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ یہاں ہر برس چیت ماہ کی چودہ تاریخ کو میلہ لگتا ہے جسے میلہ چتر چودس کہا جاتا ہے۔ اس دن دور دور سے یاتری آتے ہیں۔ بھجن کیرتن ہوتا ہے، پروچن ہوتے ہیں اور لنگر لگایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ مندر ایسی جگہ واقع ہے جہاں ایک بھی ہندو کا گھر نہیں، اس لئے مندر کی دیکھ ریکھ پجاری کے علاوہ مسلمان ہمسائے بھی کرتے ہیں۔

کلہن کی راج ترنگنی کے مطابق کشمیر کا مشہور جنگ جو راجہ للتا دتیہ نے علاقہ پونچھ کو فوج کی چھاونی میں تبدیل کر کے اس کا نام پورنستو رکھا تھا جو بعد میں پونچھ ہو گیا۔ اس سے راجہ کی اس علاقے سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دن جب راجہ پونچھ میں تھا تو شکار

کی غرض سے ایک گھاٹی میں آیا جہاں اُس نے ویران جگہ پر دولڑکیوں کو ناچتے اور گاتے دیکھا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا تو راجہ نے لڑکیوں سے یہاں ناچنے کی وجہ دریافت کی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ وہ دیوداسیاں ہیں اور بزرگ عورتوں کے کہنے پر یہاں ناچتی اور گاتی ہیں۔ راجہ کو گُمان ہوا کہ یہاں کوئی استھان ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کھدائی شروع کردی تو ایک پرانا مندر برآمد ہوا۔ راجہ نے مندر کے کیواڑ کھولے تو وہاں سے تین مورتیاں یعنی بھگوان رام، لچھمن جی اور سیتا جی کی برآمد ہوئیں جن کی پیٹھ پر درج تھا کہ یہ مندر راجہ رام چندر جی نے اُس وقت تعمیر کرایا تھا جب وہ کشمیر کے دورے پر آئے تھے۔ راجہ للتا دتیہ یہ مورتیاں کشمیر لے گیا اور رام چندر جی کی مورتی کو ویشنو پر ہارس کے مندر میں نصب کیا جبکہ سیتا جی کی مورتی ان کی رانی نے چکریشوری مندر میں نصب کرائی۔ لگتا ہے کہ راجہ للتا دتیہ نے اس پرانے مندر کو کھدائی کے بعد دوبارہ تعمیر کرایا تھا یا مرمت کی تھی۔ اس میں دورائے نہیں کہ راجہ للتا دتیہ نے پونچھ کا شہر چھاونی میں تبدیل کیا تھا لیکن پونچھ میں اس مندر کے علاوہ راجہ للتا دتیہ کے زمانے کی کوئی تعمیر موجود نہیں ہے۔

راج ترنگنی کے محققین ایم۔ اے۔ سٹین 1892ء میں پونچھ آئے تھے لیکن وہ اس مندر تک نہ پہنچ پائے کیونکہ یہ مقام دور پہاڑوں میں واقع تھا اور یہاں ہندو آبادی بھی نہ تھی۔ لیکن بعد میں راقم نے اس مندر پر تفصیل سے تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ وہی مندر ہے جسے راجہ للتا دتیہ نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

گورودوارہ، کھڑی دھرم سال

پونچھ میں گورودوارہ کھڑی دھرم سال سکھوں کا ایک اہم مذہبی مقام ہے اور مشہور سنت بھائی بہادر سنگھ جی نے اس کی بنیاد رکھی تھی جو گوردوارہ ریری صاحب راولاکوٹ کے مہان سنت بھائی روچا سنگھ کے بھتیجے تھے۔ یہ گورودوارہ پونچھ شہر سے نوکلومیٹر جنوب میں عین

کنٹرول لائن پر کھڑی دھرم سال گاؤں میں واقع ہےاور کنٹرول لائن کے آر پار جانے والی پونچھ راولاکوٹ سڑک کے کنارے پڑتا ہے جہاں سے آر پار ٹریڈ سینٹر کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ یہاں پہلے پہل سنت بھائی بہادر سنگھ جی نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں سکھ دھرم کے پرچار کے لئے دھرم سال بنائی جس سے گاؤں کا نام جو پہلے کھڑی ہوتا تھا کھڑی دھرم سال ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مذہبی مقام گورودوارہ بن گیا۔ 1947ء کے واقعات کے بعد چونکہ یہ علاقہ سرحد پر واقع تھا اس لئے بہت کم سنگت وہاں جاسکتی تھی لیکن 2005ء کے بعد راستے کُھلے اور سرحد پر امن قائم ہوا تو اس گورودوارہ میں سنگت کی آمد و رفت پھر سے شروع ہوگئی اور اب جبکہ یہ گورودوارہ صاحب اُس مقام پر واقع ہے جہاں سے آر پار سڑک گزرتی ہے۔ قریب ہی ٹریڈ سینٹر واقع ہے جہاں تاجروں، ٹرک ڈرائیوروں اور دوسرے لوگوں اور عقیدت مندوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ یہ تمام لوگ دوسری سنگت کے علاوہ گورودوارے میں آتے ہیں، لنگر حاصل کرتے ہیں، رات کو آرام کرتے ہیں۔ اس طرح یہاں ہر وقت عقیدت مندوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ اس وقت گورودوارہ کمپلیکس تیرہ کنال اراضی پر پھیلا ہوا ہےاور گورودوارہ صاحب کی عمارت کے علاوہ دیری صاحب، دس کمروں کا مسافر خانہ، جدید مہمان خانے، لنگر کی عمارت اور سٹور کی عمارت پر مشتمل ہے۔ ہر برس یہاں 5 جون سے 20 جولائی تک گورمت سماگم ہوتا ہے۔ ان دنوں میں گورو گرنتھ صاحب جی کا پاٹھ جاری رہتا ہے جس میں پونچھ شہر، جموں اور ملک کے دوسرے حصوں سے سنگت آکر حصہ لیتی ہے۔ راگی جتھے اور سکھی پرچار کے لیے امرت سر سے گیانی بُلائے جاتے ہیں۔ بچوں کو شبد کیرتن کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور سنت بھائی بہادر سنگھ جی کے خاندان کے لوگ خصوصی طور پر حصہ لینے کے لیے راجستھان سے آتے ہیں۔

1947ء سے پہلے یہاں کچا گورودوارہ صاحب ہوتے تھے۔ 1947ء کے واقعات کے بعد یہ جگہ سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک عرصہ تک فروغ نہ پاسکی۔ 1957ء میں گاؤں کھڑی دھرم سال کے کچھ خاندان واپس آئے تو انہوں نے نگائی صاحب

کے سنت بھائی بچھتر سنگھ جی کو گورودوارہ کھڑی دھرم سال دوبارہ تعمیر کروانے کی استدعا کی۔ چنانچہ کچا گورودوارہ صاحب تعمیر کیا گیا۔ 1995ء میں سردار ہرچرن سنگھ کی قیادت میں ایک گورودوارہ تعمیر کمیٹی بنائی گئی اور پھر سردار ہرچرن سنگھ کی محنت اور کوششوں سے نہ صرف پکا گورودوارہ صاحب کی بڑی عمارت تعمیر ہوئی بلکہ دوسری عمارتیں بھی وجود میں آئیں جہاں سنگت کی رہائش اور کھانے پینے کا اہتمام ہوتا ہے۔

آستان پیر چھوٹے شاہ، مینڈھر

تحصیل مینڈھر کی سب سے اہم زیارت حضرت پیر چھوٹے شاہ سخی میدان گاؤں میں واقع ہے۔ یہ مقام مینڈھر قصبے سے چار کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس وقت یہاں حضرت پیر چھوٹے شاہ کی زیارت کے علاوہ اُن کی بہن کا مزار اور ایک پرانا درخت بھی ہے۔ 1979ء میں اس خانقاہ کو اوقاف ٹرسٹ کے تحت لیا گیا۔ اس وقت درگاہ شریف کے علاوہ مدرسہ کی عمارت، لنگر خانہ اور مہمان خانہ پر مشتمل ہے جو پانچ کنال اراضی پر پھیلی ہوئی ہے۔ محکمہ سیاحت کی جانب سے ایک مہمان خانہ بنانے کی منظوری بھی ہو چکی ہے۔ یہاں ہر روز بڑی تعداد میں زائرین آتے، مرادیں مانگتے اور جھولیاں بھر کے واپس لوٹتے ہیں۔ جبکہ جمعرات کو یہاں زائرین کی بھیڑ ہوتی ہے۔ زائرین ریاست اور ریاست کے باہر سے بھی آتے ہیں۔ یہاں مکی کی روٹی جسے 'ٹھوڈا' کہا جاتا ہے، لنگر سے زائرین میں تبرک کے طور پر بانٹی جاتی ہے۔ اُدھر کنٹرول لائن پار سے بھی جو لوگ پونچھ راولاکوٹ سڑک کے ذریعے آتے ہیں یہاں ضرور حاضری دیتے ہیں کیونکہ اس درگاہ سے وابستہ عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد کنٹرول لائن کے پار کوٹلی اور تھکیالہ میں آباد ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تقریباً 350 برس قبل گاؤں چھجلہ کے سنگی ڈاب علاقے میں ایک سید خاندان رہائش کرتا تھا۔ خاندان کا بزرگ ہر وقت محوِ عبادت رہتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے اور

ایک بیٹی تھی اور زندگی کا انحصار زمین کے ایک چھوٹے سے قطعہ سے مکی کی پیداوار پر تھا۔ ان کے بیٹوں کا نام سید نذیر حسین شاہ اور سید معصوم شاہ تھا اور ایک بیٹی بھی تھی۔ سید نذیر حسین شاہ بھی روحانیت کی طرف مائل اور چھوٹے شاہ کے نام سے جانے جاتے تھے۔

بچپن کے دور میں جب چھوٹے شاہ کے تمام ساتھی بھینس چرانے کے لیے آتے تو چھوٹے شاہ، اُن کے بھائی اور بہن اُداس ہو جاتے تھے کیونکہ اُن کے گھر کوئی مویشی نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن جب وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ سنگی ڈاب کے قریب آئے اور دیکھا کہ سب کی بھینس ڈاب میں نہا رہی ہیں اور کچھ لڑکے بھینسوں کی سواری کر رہے ہیں تو آپ نے ریت کی بھینس بنا کر ڈاب میں اُتار دیں اور دعا کی کہ یہ بھینس بن جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اُن کی بھینس بھی ڈاب میں نہانے لگیں۔ یہ دیکھ کر دوسرے لڑکوں نے حضرت چھوٹے شاہ کے والد کو اطلاع دی۔ وہ سمجھ گئے کہ چھوٹے شاہ نے کرامت دکھائی ہے۔ وہ کرامت کے سخت خلاف تھے۔ طیش میں آ گئے اور مارنے کے لئے چھوٹے شاہ کی طرف دوڑے۔ چھوٹے بھائی تو گھر کی طرف آ گئے مگر چھوٹے شاہ اور ان کی بہن ڈر کے مارے دوڑتے ہوئے موجودہ مقام سخی میدان آ گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ والد پیچھا کر رہے ہیں تو دعا کی کہ انہیں مائی زمین پناہ میں لے لے۔ چنانچہ زمین پھٹ گئی اور پیر چھوٹے شاہ اور اُن کی بہن زمین میں دھنس گئے۔ جب والد آئے اور دیکھا کہ دونوں بھائی بہن زمین میں سما گئے ہیں۔ اُس وقت والد محترم کو حضرت پیر چھوٹے شاہ کی روحانیت کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے وہاں ایک چھوٹا چھپر تیار کر کے زیارت بنائی جہاں لوگوں نے عقیدت سے آنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے یہ مقام فروغ پا کر آج ایک درگاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

علاقہ مینڈھر میں سخی میدان گاؤں میں ہی حضرت پیر سخی سرور کی بیٹھک موجود ہے۔ اُدھر اسی گاؤں میں پانڈو محل کے آثار بھی موجود ہیں جہاں بن باس کے زمانے میں پانڈو آئے تھے اور اپنی ماں کُنتی کو یہاں ایک بڑا مینار تعمیر کر کے اپنا وطن دکھایا تھا۔ بعد میں یہ مقام ایک عرصے تک بدھ مت کی عبادت گاہ کے طور پر بھی قائم رہا۔ اس طرح مینڈھر کے

گاؤں گانی کی پہاڑی چوٹی پرلوہر دیوتا کا پرانا مندر قائم ہےاوراس سے ایک میل اوپر یونانی تہذیب کے ایک قصبے کے آثار بھی ملتے ہیں۔

ہرنی میں عظیم جرنیل بندہ بہادر کی باولی بھی موجود ہے جہاں انہوں نے ہرنی کا شکار کیا تھااور ہرنی کے بطن سے بچے باہر آ گئے تھے،جنہیں دیکھ کرانہوں نے سنیاس لے لیا اور بعد میں دسویں گورو ہر گو بند سنگھ جی نے انہیں اپنا جرنیل بنا کر پنجاب بھیجا تھا۔اسی طرح علاقہ چھجلہ میں ایک خانقاہ موجود ہے جہاں عقیدت مندوں کی ریل پیل رہتی ہے۔علاقہ منڈی میں زیارت پیر پستونی شاہ، دیگوار پونچھ میں زیارت سائیں فخر الدین، دھندک میں دیوی مندر، بہرام گلہ میں حضرت پیر سمنانی کی زیارت اور شومندر اہم مذہبی مقامات میں شامل ہوتے ہیں۔

واسکی ناگ مندر، بھدرواہ اور کیلاش یاترا

بھدرواہ کے ہندوؤں کے لیے واسکی ناگ مندر اہم ترین مذہبی مقام ہے کیونکہ واسکی ناگ کو وہ کل دیوتا بھی مانتے ہیں۔ریاست میں ناگ پوجا کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔چونکہ ناگ کا تعلق شومہاراج (جن کے گلے میں ناگ ہوتا ہے) اور ویشنو جی سے بھی ہے،اس لیے لوگ سانپ کو مارنا پاپ سمجھتے ہیں۔دراصل انسان جن چیزوں کو بس میں نہیں کرسکتا تھا انہیں پوجتا تھا جیسے آگ، ہوا،سیلاب وغیرہ۔اسی طرح سانپ جس کے ڈسنے سے انسان بچتا نہیں تھا اُس کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ بھدرواہ میں سات سروں والے واسکی ناگ کا مندر ہے اور وہاں اُن کی پوجا ہوتی ہے۔یہاں سے ہر برس کرش پکش اگست ستمبر میں کیلاش یاترا بھی شروع ہوتی ہے۔

کیلاش کُنڈ جو کہ بھدرواہ میں واقع ہے،اُسے واسکی ناگ کُنڈ بھی کہا جاتا ہے جو 14500 رفٹ کی بلندی پر واقع ہے۔کیلاش کنڈ ٹھنڈی اور شفاف پانی کی ایک جھیل ہے

جوڈیرھ میل کے دائرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں چمبہ، ڈوڈہ، کٹھوعہ، اودھم پور اور جموں سے ہزاروں یاتری یاترا کے دنوں میں آتے ہیں۔ یہ یاترا شراون مہینے کی چودہ تاریخ کو شروع ہوتی ہے۔ لوگ جلوس کی شکل میں واسکی ناگ مندر میں آتے ہیں۔ رات بھر بھجن کیرتن ہوتا ہے اور پھر یاترا اگا ٹھا بھدرواہ سے شروع ہوتی ہے اور سیوج درے کو عبور کر کے کیلاش کُنڈ پہنچتے ہیں جس سے عقیدت مندوں کو روحانی سکون ملتا ہے۔

سُکرالہ ماتا، بلاور

یہ مندر بلاور سے نو کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور ضلع کٹھوعہ میں پڑتا ہے۔ سکرالہ ماتا کا مندر 3500 فٹ کی بلندی پر قائم ہے۔ عقیدت مندوں کو کچھ پیدل چل کر ماتا کے مندر تک پہنچنا پڑتا ہے۔ یہ متبرک استھان ماتا مل دیوی کا ہے جو شاردا دیوی کا دوسرا روپ ہے۔ دیوی یہاں اپنے آپ کو شلہ (پتھر کی سل) کی صورت میں پریکٹ ہوئی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ متبرک استھان چمبہ کے پرنس مادھوسنگھ نے بنوایا تھا۔ نوراترا کے دنو ں میں یہاں درشن کرنے والوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ اسی طرح جوریاں والی ماتا، دھولا والی ماتا، شکتی ماتا سندر بنی، ماتا بالا سندری کٹھوعہ، حروٹہ والی ماتا حروٹہ، چمونڈا دیوی مندر بسوہلی علاقہ کٹھوعہ اہم ہندو استھان ہیں۔ جبکہ زیارت پیر فضل شاہ مسلمانوں کا اہم مذہبی مقام ہے جو پارلی بنڈ کٹھوعہ شہر میں واقع ہے۔ 24 کارتک کو یہاں بڑا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے لوگ شرکت کے لئے آتے ہیں۔ اسی طرح پیر چھتر شاہ کی زیارت کٹھوعہ شہر سے تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس زیارت کے قریب واقع چشمے میں غسل کرنے سے چمڑے کی بیماریوں سے راحت حاصل ہوتی ہے۔ بسوہلی کے قریب چودلا وہ گاؤں میں پیر خانہ اور ایک مسجد موجود ہے۔ اسی طرح بنی چوگان میں پیر بابا لکھ داتا کی زیارت واقع ہے جہاں دور دور سے زائرین آکر حاضری دیتے ہیں۔

سُدھ مہادیو یاترا

مذہبی کتابوں میں دیوکا ندی کو گنگا کی بہن بتایا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عوام کو بھگتی، شکتی اور مُکتی کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمام مقدس علامتیں یہاں کے شو مندروں اور استھانوں میں موجود ہیں جو کہ گوری کنڈ، کورکرن، سدھی سول بنیشور مندر اور مان تلائی میں ہیں۔ چنینی کے شاہی حکمرانوں نے ان مندروں کو تعمیر کیا اور برقرار رکھنے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔

سُدھ مہادیو اُن میں سے ایک استھان ہے جہاں جون کے مہینے میں تین دنوں تک میلہ لگتا ہے جس میں خاص کر صوبۂ جموں کے تمام ڈوگرہ علاقوں سے لوگ آ کر شرکت کرتے ہیں۔ پہلے دن یاتری گوری کنڈ پہنچتے ہیں، مقدس کنڈ میں غسل کرتے ہیں اور پاربتی جی کے مندر میں پوجا میں حصہ لیتے ہیں۔ پھر دن ڈھلے سدھ مہادیو کے مندر کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ مندر میں پہنچ کر یاتری مندر کمپلیکس، ہوٹلوں، مسافر خانوں اور مقامی لوگوں کے گھروں میں قیام کرتے ہیں اور گاؤں کے لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر بانسری بجاتے یا ڈوگری گیت گا کر یاتریوں کا استقبال کرتے ہیں۔ میلہ کے دنوں میں یہاں بڑی گہما گہمی، رونق اور مذہبی ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔

دوسرے دن صبح چار بجے پورنماشی کے موقعے پر نادھا آبشار تلے اشنان کرنے چلے جاتے ہیں جو مندر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دیوکا ندرنا دھار سے ہی نکلی ہے۔ یہاں سے یاتری سُدھ مہادیو کے درشن کے لیے چلے جاتے ہیں۔ مندر ایک اونچے چبوترے پر بنایا گیا ہے جس کے سامنے چنینی کے راجہ کی حویلی ہے جسے عوام کی رہائش کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ مندر کے سامنے جل رہی دھونی یاتریوں کے لئے کشش کا باعث ہے کیونکہ یہ دھونی صدیوں سے اسی طرح جل رہی ہے۔ پھر یاتری پاپ ناشتی چشمے کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ اعتقاد ہے کہ یہاں اشنان کرنے سے پاپ دُھل جاتے ہیں۔

مان تلائی یاترا کا اگلا پڑاؤ ہوتا ہے جہاں پاربتی جی کے مندر میں لوگ پوجا میں حصہ لیتے ہیں۔ پھر سُدھ مہادیو کا میلہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ میلہ ڈوگری خطے کے لوگوں کی تمدنی میراث مانا جاتا ہے۔

سرتھل دیوی

عشرت کاشمیری نے تاریخِ کشتواڑ میں لکھا ہے کہ کشتواڑ قصبے سے سرتھل بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہاں دیوی اٹھارہ بھوجہ کا مندر ہے جہاں سال بھر یاتریوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ جانکی ناتھ گنہار سرتھل دیو استھان کو متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کی شاریکا اشٹٹھ بھوجہ والی (اٹھارہ بازوؤں والی دیوی) ہے جو سرتھل پہاڑ پر واقع ہے۔اس لیے اسے عام طور پر سرتھل دیوی ہی کہتے ہیں۔ بٹوٹ کشتواڑ روڑ پر واقع کاندانی نامی سٹیشن سے اوپر جانا پڑتا ہے جہاں اب سڑک جاتی ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے یہ تیرتھ استھان ایک مندر پر مشتمل ہے جس میں کالے رنگ کی اٹھارہ بازوؤں والی دیوی کی مورتی نصب ہے۔ یہ مجسمہ سازی کا شاندار نمونہ ہے جو عقیدت مندوں پر اثر ڈالتی ہے۔ یہ مورتی کشمیر سے ساڑھے پانچ سو برس قبل یہاں لائی گئی۔ سلطان سکندر اُس زمانے میں کشمیر کا بادشاہ تھا۔ شاریکا بھگوتی نے جو سری نگر میں ہاری پربت پہاڑی پر رہتی تھی اُس وقت ایک کمسن لڑکی کی شکل اختیار کی اور گڈریئے کو اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے جانے کے لیے کہا۔ گڈریا بڑا پریشان ہوگیا مگر دیوی جی کے حُکم کی تعمیل کی۔ جوں ہی اُس نے دیوی جی کو پیٹھ پر اُٹھایا تو وہ ہوا میں اُڑنے لگا اور سرتھل کشتواڑ میں اجال آ پہنچا اور آرام کرنے کے لیے رُکا۔ جب اُس نے دیوی کو زمین پر رکھا تو وہ دوبارہ پتھر میں تبدیل ہوگئی اور اُس جگہ صاف وشفاف پانی کا چشمہ بھی پھوٹ پڑا۔ مقامی سردار اگر دیو نے یہ عجیب وغریب حال سُنا تو صبح سویرے درشن کے لئے وہاں آیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دیوی راجہ کے خواب میں آئی۔ جب دوسرے روز راجہ شکار کرنے نکلا اور ایک خاص جگہ اُس نے خوبصورت مورتی دیکھی جو خواب میں آئی تھی۔ راجہ نے حکم دیا کہ مورتی کو اُس کے محل میں پہنچا دیا جائے۔ جب وہ اسے لے کر آگر سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچے تو کہاروں نے آرام کی غرض سے مورتی کو زمین پر رکھ دیا لیکن دوبارہ اُٹھانے لگے تو مورتی اتنی بھاری ہو چکی تھی کہ اُٹھا نہ سکے۔ انہوں نے سوچا کہ دیوی چاہتی ہے کہ اُسے یہاں ہی استھاپت کیا جائے۔ اس لیے راجہ نے اُس جگہ مندر تعمیر کرایا۔ ان کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرتھل دیوی کی مورتی کچھ پجاریوں نے کشمیر سے لائی تھی۔ بعد میں زور آور سنگھ کلہوریہ نے اپنے آقا گلاب سنگھ سے پٹہ حاصل کیا تھا، جس سے آس پاس کے جنگلوں کی آمدنی کو مندروں کے اخراجات پر صرف کیا جاسکتا تھا۔

رنگین کپڑوں میں ملبوس دیہاتی لوگ ٹولیوں میں ڈھول، بگل، بینڈ باجے اور بانسری بجاتے ہوئے سرتھل دیوی کے مندر جاتے ہیں۔ راستے میں وہ دیوی جی کی تعریف میں نعرے لگاتے ناچتے گاتے ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ سرتھل دیوی کے مندر میں جانور بھی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ یاتری ایک رات کے لیے سرتھل میں قیام کرتے ہیں۔

سرتھل دیوی مندر کے بارے میں پنڈت ہری لعل کشتواڑی نے ہندی میں ایک کتاب 78-1977ء میں مرتب کی تھی جس کے مطابق کشتواڑ کے راجہ اگر دیو شکار کی غرض سے کالی گدھ گئے تو انہوں نے جنگل میں دیوی جی کی مورتی دیکھی، تو وہیں ایک مندر بنا کر مورت استھاپت کی گئی۔ پھر ایک عرصے کے بعد مغلوں نے کشتواڑ پر حملہ کیا۔ اس حملے کے باعث پجاری نے مورتی کو اس مندر سے نکال کر جنگل میں کسی غار میں چھپا دیا۔ پھر ایک روز کوئی گڈریا مویشی چراتا ہوا وہاں آیا تو اُس کی ایک لڑکی سے ملاقات ہوگئی، جس نے اسے بتایا کہ غار میں دیوی جی کی مورتی موجود ہے۔ چرواہا وہاں گیا اور غار سے مورتی پیٹھ پر اُٹھا لایا اور وہ اُسے اگرال لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن تھکان دور کرنے کی غرض سے اُس نے مورتی کو زمین پر رکھا لیکن دوبارہ اُٹھانے لگا تو مورتی اتنی بھاری ہو چکی تھی کہ وہ اُسے اُٹھا نہ

سکا۔ چنانچہ لوگوں نے وہیں اس کا مندر بنادیا جہاں وہ آج موجود ہے۔ ابتداء میں راجہ اگر دیو کے گھرانے سے تعلق رکھنے والے راجپوت اس مندر کی دیکھ ریکھ کرتے تھے لیکن گزشتہ کچھ برسوں سے انتظامیہ کمیٹی کے ممبران اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کرن سنگھ انتظامیہ کونسل کے ممبران کی تقرری کرتے ہیں۔

سرتھل دیوی کا مندر دور دور تک مشہور ہے۔ ہزاروں یاتری بڑی عقیدت کے ساتھ مرادیں مانگنے یہاں آتے ہیں۔ مندر ایک پُرفضا مقام میں فطرت کی آسودگی سے گِھرا ہوا ہے۔ سرتھل دیوی مندر کی سالانہ یاترا ماہ ستمبر کی چھ تاریخ کو سرکوٹ مندر سے شروع ہوتی ہے اور سات تاریخ کو واپس کشتواڑ آتی ہے۔ اس موقعے پر تحصیل کشتواڑ میں عام تعطیل ہوتی ہے۔

......☆......

محل، قلعے اور سرائیں

مبارک منڈی کمپلیکس

کسی زمانے میں مبارک منڈی کمپلیکس کو ڈوگرہ مہاراجاوں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا۔ یہ کمپلیکس 165 برس قبل تعمیر ہونا شروع ہوا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا یہ کمپلیکس ڈوگرہ عہد کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ پہلے پہل یہ خوبصورت محل اور اضافی عمارات پر مشتمل تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اتنے بڑے کمپلیکس کی ضروری دیکھ ریکھ نہ ہو سکی، جس کے باعث کمپلیکس میں بہت سی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئیں۔ آزادی سے قبل یہ ڈوگرہ حکمرانوں کی رہائش گاہ، دربار لگانے اور حکومت کے دیگر انتظامات چلانے کے لیے عملے کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس مقام کو بڑی کھوج کے بعد منتخب کیا گیا تھا جہاں سے توی دریا۔ باہو قلعہ اور شہر کا بڑا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ کمپلیکس کو عمارت کے گروپوں کی صورت میں تعمیر کیا گیا ہے جو دریا کے اردگرد تعمیر کی گئیں ہیں۔ ہر ڈوگرہ حکمران نے اس کمپلیکس میں ضرورت کے مطابق اضافہ کیا ہے۔ یہاں سے ہی ڈوگرہ حکمران ساری ریاست پر حکومت کرتے تھے۔ کچھ عمارتیں ڈوگرہ شاہی خاندان کی رہائش کے لیے وقف تھیں جب کہ بڑے ہال اور گیلریاں سرکاری کام کاج کے لیے تھیں۔ ابھی کچھ برس قبل مبارک منڈ کمپلیکس کو ہیریٹیج بلڈنگ قرار دیا گیا ہے اور اس کی ضروری مرمت اور بہتری پر کام جاری ہے۔

باہوقلعہ

یہ جموں کا پرانہ قلعہ ہے جس کو راجہ وینسا وسا کے بیٹے اور راجہ کے بھائی باہولوچن نے تعمیر کرایا اور اپنے نام پر قلعے کا نام باہوقلعہ رکھا جو باہو قصبے کا حکمران ہوا کرتا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس قلعے کی خستہ عمارت کو دوبارہ تعمیر کروایا تھا اور اس کو ڈوگرہ فوج کی چھاونی میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ قلعہ مہا کالی یا باہو والی ماتا کے مندر کے لیے بھی جانا جاتا تھا۔ اس قلعے سے توی دریا سے لے کر پورے جموں شہر پر نظر رکھی جا سکتی ہے جس کا اس مقام سے نظارہ قابلِ دید ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ قلعہ تب وجود میں آیا جب کچھ تنازعات کے باعث ڈوگرہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ یعنی باہو ریاست اور جموں ریاست۔ ان دونوں ریاستوں کو دریا توی ایک دوسرے سے جُدا کرتا تھا۔

ریاسی کا پرانا محل اور اُس کی دیواری تصاویر

راجہ رنجیت دیو کی حکمرانی سے قبل ریاسی ایک خودمختار ریاست ہوا کرتی تھی جہاں سیال راجپوت حکومت کرتے تھے۔ یہ علاقہ پانچ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ ریاسی قصبے میں راجہ کا محل ہوتا تھا۔ 1926ء میں ودیا رتن کھجوریہ کو ریاسی کے پرانے محل کی دیواروں پر منقش تصاویر کا ایک شاندار مجموعہ ملا تھا۔ ان تصاویر کا موضوع آدھا مذہبی اور آدھا آرائشی تھا۔ کچھ مذہبی تصاویر واقعی شاہکار ہیں۔ اُن میں ایک راجہ کے دربار کا منظر بھی ہے۔ اس کے علاوہ شو، پاربتی، گنیش جی اور سورج دیوتا کی تصوریں بھی ملی تھیں۔ موٹے طور پر اس محل کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ یعنی مردوں کے لیے رہائشی کمرے اور عورتوں کے لیے کمرے، جبکہ بائیں جانب کے حجرے حکمرانوں کے خاندان کے لیے ہوا کرتے تھے۔

امیر محل میوزیم

لال پتھروں اور ریت کی یہ خوبصورت ترین عمارت ہے جہاں سے پورا جموں علاقہ نظر آتا ہے۔شمال کی طرف شوالک کے سرسبز پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔سامنے دریائے توی بہہ رہا ہے اورتوی کے اُس پار باہو کا منظر قابلِ دید ہے۔کسی زمانہ میں محل مہاراجہ ہری سنگھ کے والد راجہ امرسنگھ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کو میوزیم میں بدل دیا گیا ہے۔ڈوگرہ عہد اور ثقافت کی نایاب چیزیں یہاں ملتی ہیں۔اس وقت اس محل کو ہری تارا چیرٹیبل ٹرسٹ دیکھ رہا ہے۔میوزیم میں مہاراجہ کا سونے کا تخت بھی موجود ہے جس پر ڈوگرہ حکمران تخت نشین ہوا کرتے تھے۔یہاں ڈوگرہ پینٹنگز کی گیلری بھی ہے جسے 'نل دھیم ینتی' کہا جاتا ہے۔25 ہزار کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری بھی یہاں موجود ہے۔اس محل کے ساتھ خوبصورت باغ ہے جہاں سیاح سستاتے ہیں۔یہ جموں کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک ہے۔

قلعۂ راجوری

یہ قلعہ گاؤں دھنور کی اونچی پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے چاروں جانب راجوری کے علاقے نظر آتے ہیں۔یہ قلعہ میاں ہاٹھو نے 56-1946ء کے درمیاں بنوایا تھا۔جب وہ راجوری کا مختار ہوا کرتا تھا۔قلعے کا تہہ خانہ اور برج بھُر بھرے پتھر کی سلوں سے بنائے گئے ہیں۔ جب کہ اندرونی عمارتوں میں اینٹوں کا استعمال ہوا ہے۔قلعے کا خاص دروازہ فصیل کی طرف غیر عمودی سمت پر تعمیر کیا گیا ہے اوراس کا رُخ جنوب کی جانب ہے۔قلعے کے برجوں میں بڑی بڑی توپیں نصب کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔کسی دور میں قلعے کی چھتیں مسمار کر دی گئیں تھیں۔ آج بھی قلعے کی دیواریں پختہ اور مضبوط ہیں۔یہ قلعہ علاقے میں لگان کی صورت میں وصول کی گئی جنس کو رکھنے،قیدیوں کو رکھنے اور فوج کی پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔

قلعۂ بھیم گڑھ، ریاسی

قصبہ ریاسی کے قریب جنوب کی جانب بھیم گڑھ قلعہ واقع ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد تب رکھی گئی تھی جب مہاراجہ رنجیت دیو سے قبل اس علاقے کے حکمران سیال راجپوت ہوا کرتے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں اس قلعے کے سامنے والے حصے کی اونچائی تقریباً آٹھ فٹ بلند کی گئی تھی اور عقبی حصے میں بھی تعمیرات ہوئیں تھیں۔ بعد میں میاں موٹا کے پوتے میاں بھوپ سنگھ نے گلاب سنگھ کے خلاف بغاوت کی تو زورآور سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور پھر دھاوا بول کر قبضہ کیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں وزیراعظم ویکفیلڈ کے حکم پر قلعے کے اندر اور باہر بہت سی عمارتیں منہدم کر دی گئی تھیں۔ لیکن آج بھی قلعۂ بھیم گڑھ وقت کے وار سہتا ہوا کسی نہ کسی حالت میں قائم ہے۔

چنگس سرائے

چنگس سرائے صوبۂ جموں میں مغل دور کی ایک اہم ترین عمارت ہے جو آج بھی اصلی حالت میں ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر جن کا کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے 1429ء میں بہرام گلہ میں انتقال ہو گیا تھا، اُن کے جسدِ خاکی کے ایک حصے کو اس سرائے میں دفن کیا گیا تھا۔ مغل سرائے چنگس ضلع راجوری میں جموں پونچھ شاہرہ پر واقع ہے یہ مقام جموں سے 131 کلومیٹر کی دوری پر نوشہرہ اور راجوری کے درمیان پڑتا ہے اور پرانے مغل روڑ پر پانچواں پڑاؤ تھا جہاں مغل کاروان کشمیر جاتے اور آتے ہوئے قیام کیا کرتے تھے۔ سرائے کمپلیکس آج بھی چیڑ کے جنگل سے گھری ہوئی ہے۔ اس علاقے کا اصلی نام خان پور تھا۔ جب چنگس سرائے تعمیر ہوئی تو علاقے کا نام بھی چنگس ہو گیا۔ یہ سرائے 365 سال پرانی ہے جسے ایرانی انجینئر علی خان نے تعمیر کیا تھا۔ 1995ء میں مغل سرائے کی حالت نہایت خستہ تھی تو اُس وقت کے مقامی ایم۔ ایل۔ اے اور وزیر محمد شریف طارق نے اس عمارت کی ترقی کے لیے خود بھی مالی

معاونت کی اور آثار قدیمہ کے محکمہ سے بھی رقومات حاصل کر کے اِسے اصلی حالت میں لایا ہے۔ یہ سرائے 44 چھوٹے حجروں، تین دالانوں، مسجد شریف اور وہ مقام جہاں شہنشاہ کی آنتیں دفن ہیں، پر مشتمل ہے۔ بڑا دروازہ مغرب کی طرف ہے جبکہ ایک دروازہ دریا کی جانب بھی کھُلتا ہے۔ 2010ء کے بعد جب سے وادیٔ کشمیر کو ملانے والی مُتبادل سڑک مغل روڑ کھُلی ہے، چنگس سرائے کے قریب پھر سے رونقیں لگنے لگی ہیں کیونکہ کشمیر سے آنے جانے والے سیاح اور مسافر یہاں رُکتے اور سرائے کا نظارہ کر کے آگے جاتے ہیں۔

نوشہرہ قلعہ

یہ قلعہ راجوری کی سُکھ توی ندی کے کنارے ایسی اونچی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے جو شمال سے جنوب کی جانب ڈھلوان پر واقع ہے۔ اس وقت قلعہ کی فصیل اور اندر کی عمارتیں خستہ حالت میں ہیں۔ صرف مستطیل نما سرائے جس کے تین اطراف حجروں کی قطاریں ہیں، وہ اچھی حالت میں ہے۔ قلعہ ڈیڑھ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ قلعے کے شمالی نصف حصے میں تین عمارتیں ہیں جو خزانہ، تھانہ اور بارود خانہ کے لیے وقف تھیں۔ قلعے کی ڈیوڑھی عمارت سازی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں قلعے کی مرمت اور وسعت کا کام ہوا تھا۔ قلعے کے قریب مغلیہ دور کی مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ جب کہ ایک کمرہ جو شیشوں سے بنایا گیا تھا اُسے نور محل کہتے ہیں، جہاں شہنشاہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے اپنی بیگم نور جہاں کے ساتھ قیام کیا کرتا تھا۔ پہلے پہل یہ قلعہ شہنشاہ اکبر کے حکم پر راجوری کے راجہ تاج الدین نے تعمیر کرایا تھا بعد میں ایرانی انجینئر علی مردان خان نے اسے وسعت اور خوبصورتی عطا کی تھی۔

تھنہ منڈی سرائے

راجوری شہر سے 24 کلومیٹر کی دوری پر تھنہ منڈی میں ایک اور مغل سرائے واقع ہے جو قصبہ تھنہ کے قریب سڑک کے ساتھ ہے۔ یہ کشمیر جانے والے مغل کاروانوں کے لیے ایک بڑا پڑاؤ تھا جہاں کاروان کچھ دن آرام کے بعد آگے روانہ ہوتا تھا۔ سرائے میں 36 حجرے ہیں اور دو دالان ہیں، ایک حمام ہے۔ سرائے میں مشرق کی طرف داخلہ ہے۔

نادپور سرائے

یہ مغل سرائے نوشہرہ سے دس کلومیٹر دُور جموں پونچھ شاہراہ پر واقع ہے۔

قلعہ منگل دیہی

ضلع راجوری کا قلعہ منگل دیہی ڈوگرہ عہد کی ایک اہم یادگار ہے۔ اس قلعے کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہاں سے سندر بنی نوشہرہ بیجا بائیں لگیوٹ لمبیڑی بیری پن وغیرہ تمام علاقے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں قلعہ تعمیر کیا گیا ہے اُس کی اونچی چوٹی پر پرانے زمانے کا منگلا دیوی کا مندر بھی قائم ہے۔ قلعہ 40 کنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور قلعے کی دیواریں 30 فٹ سے 85 فٹ اونچی ہیں۔ قلعے میں دو کنوے ہوا کرتے تھے جو اب بند کر دیئے گئے ہیں۔

یہ قلعہ جو نوشہرہ سیری روڈ کے ساتھ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے، راجہ گلاب سنگھ کے بھائی راجہ دھیان سنگھ نے اپنی پونچھ چبال جاگیر میں 40-1827ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا جہاں ڈوگرہ فوج اور جنگی مجرموں کے علاوہ انتظامیہ کے کارکن بھی رہائش کیا کرتے تھے اور عوام سے جنس کی صورت میں وصول ہونے والے مالیے کا غلہ بھی رکھا جاتا تھا۔

1977ء کے واقعات میں علاقے کے تمام لوگوں نے عرصے تک قلعہ منگل

دیہی میں پناہ لی تھی۔ آجکل نو راترا کے دِنوں میں یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں سندر بنی، نوشہرہ لمبڑی، بیری ین وغیرہ کے ہزاروں یاتری حصہ لیتے ہیں۔

قلعہ کھمبہ

قلعہ کھمبہ نوشہرہ سے چالیس کلومیٹر دور اور جھنگڑ بارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر عین کنٹرول لائن پر واقع ہے اور پہاڑی ٹیلے پر تعمیر کیا گیا یہ قلعہ 250 میٹر لمبا اور 60 میٹر چوڑا ہے۔ قلعے میں داخلے کی ڈیوڑھی جنوب کی طرف ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اُن کے وزیر اعظم راجہ دھیان سنگھ نے اپنی جاگیر پونچھ چبال کے تحفظ کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کھمبہ سے تھوڑا دُور راستے میں پانچ پرانے مندروں کے آثار بھی ملتے ہیں جو کشمیر کے پاندریٹھن مندروں سے مشابہ ہیں، جن کی بناوٹ سے کشمیری طرز کی جھلک ملتی ہے۔ علاقہ راجوری میں اسی طرح کا ایک اور قلعہ لام دریا کے کنارے پر بھی واقع ہے۔

پنج ناڑہ مندر

پنج ناڑہ کے مقام پر پانڈو مندر اور پانڈو کُند کے آثار ملتے ہیں جن سے کشمیری فن تعمیر کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ مندر کشمیر میں اوڑی کے علاقہ بونیار اور ڈیلٹار مندروں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں پانڈو مندر کے علاوہ آس پاس 55 سل بنے ہیں۔ اس مندر کو وقت کی آندھی نے بُری طرح متاثر کیا ہے اور دُور دراز علاقے میں واقع ہونے کے باعث یہاں بہت کم توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے مطابق یہ مندر نویں یا دسویں صدی عیسوی کا ہے اور راجہ جے پادہ کے عہد کے چاندی کے سکے بھی یہاں سے دریافت ہوئے ہیں۔

موتی محل، پونچھ

موتی محل پونچھ کی ایک خوبصورت ترین عمارت ہے جسے مقامی ڈوگرہ سکھ دیو سنگھ اور راجہ جگت دیو سنگھ نے 36-1926ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔ محل کا نام پونچھ کے پہلے ڈوگرہ راجہ موتی سنگھ کے نام پر موتی محل رکھا گیا تھا۔ یہ محل 125 رکنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور اُس زمانہ میں نو لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا تھا جسے سکاٹ لینڈ کے انجینئروں نے سکاٹس فنِ تعمیر کے تحت بنایا تھا۔ یہ محل شہر کے شمال مغرب کی طرف شینہ چُنگاں پہاڑ کے دامن میں ایسی جگہ بنایا گیا ہے جہاں سے پونچھ شہر کے علاوہ پیر پنچال اور توئی پیر کے پہاڑوں تک نظر جاتی ہے۔

2005ء کے زلزلے میں اس محل کو زبردست نقصان پہنچا تھا لیکن فوج نے بروقت اس کی بحالی کے اقدام اُٹھائے اور اب یہ محل نہ صرف قابلِ رہائش ہے بلکہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہے۔

موتی محل تین منزلہ عمارت ہے۔ گراؤنڈ فلور میں داخلے والا ہال، دربار ہال، بلیرڑ روم، لائبریری کا کمرہ، باتھ روم، کچن، بٹلرس کے کمرے، ایک بڑا ہال اور رہائش کے کمروں پر مشتمل ہے۔ چھت کو کشمیری ختم بند لکڑی کے کام سے دلکش بنایا گیا ہے۔ پہلی منزل میں راجہ صاحب کا بیڈ روم ہے جس کے ساتھ آرام کے لیے کمرہ اور بڑا ٹیرس ہے جہاں سے دُور دُور تک پونچھ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ راجہ صاحب کے کمرے کے دائیں اور بائیں جانب کمروں کے دو سیٹ ہیں جو رانیوں اور بچوں کے لیے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ جبکہ راجہ صاحب کے بیڈ روم کے پیچھے کمروں کے دو سیٹ ہیں جو کشمیر ہاوس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہاں سے شینہ چوگاں پہاڑ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسری منزل پر بھی چار کمروں کا سیٹ بنا ہے۔ موتی محل کے پیچھے رانی محل ہے جو تقریباً ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ رانی محل کا دروازہ دربار ہال کی طرف کھلتا ہے، جہاں رانی صاحبہ اپنا دربار لگایا کرتی تھیں۔

بلدیو محل

بیسویں صدی کے آغاز میں بلدیو محل پونچھ کی سب سے دلکش عمارت مانی جاتی تھی۔ محل کو اُس وقت کے مقامی ڈوگرہ راجہ بلدیو سنگھ کے نام پر بلدیو محل نام دیا گیا تھا، جس نے 1892ء سے 1918ء تک پونچھ پر حکومت کی۔ یہ محل دریاے بیتار کے کنارے وسیع میدان میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ دومنزلہ عمارت کشمیری اور انگلش فنِ عمارت سازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا گراؤنڈ فلور 21 کمروں پر مشتمل ہے جن میں کانفرنس ہال، دربار ہال، آرام کے لیے کمرے، راجہ صاحب کا نجی دفتر، سٹاف روم اور سیکورٹی روم شامل ہیں۔ جبکہ پہلی منزل پر دس کھلے اور ہوا دار کمرے ہیں جو غلام گردش کے ساتھ ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ یہاں راجہ صاحب اور اُن کے خاندان کے لوگ قیام کرتے تھے۔ اس محل کے ساتھ ایک اور محل بھی ہے جسے پدم محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جسے راجہ بلدیو سنگھ کے تیسرے بیٹے پدم دیو سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔

2005ء کے زلزلے میں یہ عمارت بُری طرح متاثر ہوگئی تھی اور اسے رہنے کے لئے ناقابل قرار دے دیا گیا۔

قلعہ مبارک، پونچھ

پونچھ قلعہ کو عہد رفتہ کی ریاست پونچھ کے تشخص کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تقریباً ڈھائی سو سال پرانا یہ قلعہ آج بھی قائم ہے جس نے زمانہ کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ لیکن 2005ء کے زلزلے میں اس کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا تھا اور دیواروں میں دراڑیں آ گئیں تھیں لیکن اُس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام نبی آزاد نے موقع پر جائزہ لینے کے بعد 2007ء میں اس کی بحالی کے لیے 796 لاکھ روپے کا پروجیکٹ منظور کیا جس پر اب کام

چل رہا ہے۔

قلعہ مبارک پونچھ شہر کے جنوب میں ایک ٹیلے پر 21 کنال رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ایسی جگہ تعمیر ہوا ہے جہاں سے پورے پونچھ علاقہ پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ قلعہ 49 کمروں، چار بڑے ہال، وارنڈا، توشہ خانہ، گول گھر یا راجے کا نجی دربار، مندر، مسجد اور گوردوارے پر مشتمل ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لیے شمال اور جنوب سے تین راستے ہیں۔

اس قلعے کی بنیادیں مسلمان عہد میں راجہ عبدالرزاق راٹھور (47-1701ء) میں رکھی گئیں تھیں جس کے پہلے اور جنوبی حصے کو 83-1760ء کے درمیان راجہ رستم خان راٹھور نے تعمیر کرایا تھا۔ دوسرا حصہ شمال کی جانب (46-1819ء) میں سکھ عہد میں تعمیر ہوا جبکہ تیسرا اور سامنے والا حصہ ڈوگرہ عہد میں بنایا گیا تھا۔ چونکہ بلدیو محل فوج کے استعمال میں تھا اور 2015ء جب ایک نیا کمانڈر مسٹر گوتم یہاں تعینات ہوا تو اُس نے محل کا جائزہ لے کر حکامِ بالا کو رپورٹ بھیجی کہ وہ اس کو مرمت کر کے بحال کرنا چاہتے ہیں جو ممکن ہے۔ کمانڈر کو اجازت دی گئی اور انھوں نے 2017ء تک بلدیو محل میں ضروری مرمت کر کے اسے قابلِ رہائش بنا دیا اور یہ محل ایک بار پھر اپنی دلکشی کے باعث پونچھ شہر کی اہم عمارتوں میں شامل ہو گیا جو یہاں کے تمدنی ورثے کی علامت مانا جاتا ہے۔

شیش محل، پونچھ

شیش محل پونچھ کے آخری راجہ جگت دیو سنگھ نے اپنے بھائی مرحوم راجہ سُکھ دیو سنگھ کی بیوہ رانی اٹلیا کے لیے تعمیر کرایا تھا جنھوں نے 1936ء میں یہاں شفٹ کیا تھا اور اسے رانی اٹلیا محل کا نام دیا تھا جو بعد میں شیش محل کر دیا گیا۔ یہ محل پونچھ شہر کے مغربی حصے میں وزیرِ وزرات ڈی سی آفس کے قریب واقع ہے۔ یہ نو کنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور 18 بڑے چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے جس میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، میٹنگ ہال،

ڈریسنگ روم، غلام گردش اور دیگر کمرے شامل ہیں۔ عمارت تراشے ہوے پتھروں، سُرخی، چونا، لکڑی کے کام، سفید اور کالی ٹائلوں اور مختلف رنگوں کے شیشوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ 2005ء کے زلزلے میں اس عمارت کو بھی زبردست نقصان پہنچا تھا، جس کی بحالی کا کام جاری ہے۔ اس وقت شیش محل کمپلیکس میں لڑکیوں کے لئے ہائر سیکنڈری سکول قائم ہے۔

مندرجہ بالا عمارتوں کے علاوہ سنی میداں مینڈھر پونچھ میں پرانے زمانہ کی کسی بڑی عمارت کے آثار ملتے ہیں جسے مینڈھر کے عوام پانڈو محل بتاتے ہیں جہاں بن باس کے زمانہ میں پانڈو آئے تھے اور بھیم سین نے اپنی ماں کُنتی کے استفسار پر یہاں ایک اتنا اونچا برج تعمیر کیا تھا کہ جہاں سے کُنتی نے اپنا شہر ہستنا پور دیکھا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ عمارت پانڈوؤں کے دور میں تعمیر ہوئی ہو لیکن سینکڑوں برس بعد جب اس علاقے میں بدھ دھرم کے لوگ آباد تھے، تو پنجاب کے ایک یونانی راجہ میندر یہاں آئے تھے اور اس مقام پر ایک بدھ عالم کے ساتھ مذاکرہ کر کے بدھ دھرم اختیار کیا تھا۔ میندر نے اس واقعے کی یاد میں یہاں میندر و بہار بھی تعمیر کرایا تھا جس کے باعث علاقے کا نام بھی میندر ہو گیا جو آگے چل کر مینڈر رہوا۔

اسی طرح علاقہ مینڈر میں گانی کے مقام پر ایک ایسے قصبے کے آثار موجود ہیں جن سے یونانی اور بدھ تہذیب و تمدن کے سراغ ملتے ہیں۔ یہاں تراشے ہوئے بڑے پتھر کا ایک تیر نما حصہ ملا ہے جس پر مہاتما بدھ کا چہرہ بنا ہوا ہے جو قریب ہی واقع لوہر دیونا مندر میں نصب کیا گیا ہے۔

اُدھر علاقہ سورن کوٹ میں اُجالی باولی ایک ایسا مقام ہے جہاں باولی کے اردگرد کشمیری فنِ سنگ تراشی کے بُت ملتے ہیں اور شاردا لپی میں لکھے ہوئے کچھ الفاظ بھی محفوظ ہیں جہاں بندہ سنگھ بہادر نے ہرنی کا شکار کیا تھا اور ہرنی کے پیٹ سے بچے باہر آگئے تھے جنھیں دیکھ کر بندہ بہادر جوگی بن گئے اور بعد میں دسویں گورو گوبند سنگھ نے انہیں بندہ بیراگی یا بندہ سنگھ بہار کا خطاب دیا۔

قلعہ گنج پت

ضلع رام بن میں دریائے چناب کے اُس پار چندر کوٹ کے سامنے ایک اہم قلعہ گنج پت واقع ہے جو علاقہ سراج میں پڑتا ہے۔اس قلعے کو سب سے پہلے مقامی راجپوت سرداروں نے تعمیر کرایا تھا۔قلعہ ایک ایسے اونچے پہاڑ پر واقع ہے جہاں سے سارے علاقہ پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔عہدِ رفتہ میں راجپوت سردار یہاں سے ہی اپنی حکومت چلایا کرتے تھے۔یہاں خطرناک مجرموں اور باغیوں کو قید کیا جاتا تھا کیونکہ اس قلعے سے فرار ممکن نہ تھا۔ قلعے میں مہا کالی کا مندر بھی ہے جہاں رام بن کے عقیدت مند یاترا کے لیے آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں قلعہ گنج پت کے مندر کی مرمت کی گئی ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے قلعے کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں وسعت دی تھی۔اُنھوں نے ریاست بمبھر کے آخری راجہ سلطان خان کو گرفتار کر کے اسی قلعے میں قید کیا تھا جو یہاں ہی فوت ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ ڈوگرہ عہد میں کچھ دیر کے لیے شیخ محمد عبداللہ کو بھی یہاں رکھا گیا تھا۔ 1858ء میں راجوری کے گورنر میاں ہاٹھو سنگھ (جو مہاراجہ گلاب سنگھ کی خادمہ کے بطن سے تھے) نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے قتل کی سازش کی تھی۔لیکن اس سازش کو عمل میں لانے سے قبل ہی انہیں گرفتار کرلیا گیا اور قلعہ گنج پت میں قید کیا گیا تھا۔

قلعہ بھدرواہ

معروف یورپی سیاح جی۔ٹی۔واین اپنے سفر نامہ بھدرواہ 1839ء میں لکھتے ہیں کہ بھدرواہ کے بازار کا رخ جنوب کی جانب ہے اور قلعہ شمال کی طرف واقع ہے۔یہ ایک وسیع اور مربع نما قلعہ ہے جو زیادہ تر سلیٹی پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے اور دوسرے پہاڑی

قلعوں کے مقابلہ میں عجیب وغریب مقام پر بنایا گیا ہے۔اس کے پیچھے جنگلات والے پہاڑ ہیں۔ جنگلات کے پسِ منظر میں کوہ کیلاش کے دامن میں اونچے مقام پر ہونے کے باعث یہ قلعہ وادی بھدرواہ کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔اس قلعہ کا نام رتن گڑھ ہے جس میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک فوج رہائش پذیر ہوتی تھی۔ یہ قلعہ صدر بازار، بھدرواہ سے ایک میل مغرب کی جانب رُتنہ گاؤں میں واقع ہے۔ بازار سے قلعہ کی طرف جاتے ہوئے چڑھائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روایت ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر راجہ سمپت پال والی بھدرواہ کے دورِحکومت میں ہوئی تھی۔اس راجہ نے قلعہ کو اپنے والد میدنی پال کے نام پر میدنی پور رکھا۔اس قلعہ کی پرانی تاریخ کے بارے میں کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن بھوشن کول ساکنہ بھدرواہ کے مطابق مسٹر جگن ناتھ کوتوال کے پاس قلعے کے بارے میں ایک پٹہ موجود ہے جس کے مطابق یہ قلعہ چمبہ کے راجہ نے 1731 بکرمی (1675ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ جی۔ ٹی۔ وائن نے 1722ء میں بھدرواہ کا دورہ کیا تھا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ قصبہ کے مغرب میں تین سوفٹ کی بلندی پر ایک قلعہ ہے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے جس کے ہر کونے میں بُرجیاں ہیں۔نشانہ بازی کے لیے دیواروں میں سوراخ رکھے گئے ہیں۔ یہاں چار توپیں گاڑھی جاتی ہیں اور پچاس فوجی قیام کرتے ہیں۔ وائن لکھتے ہیں کہ لنگر اندازی کا عمل قلعہ کے شمالی میدانی حصہ میں ہوتا ہے۔سفر کرنے والوں کو رہائش کی سہولیات میسر ہیں۔اس قلعہ کے قریب ایک مسجد اور زیارت سعد صاحب واقع ہیں۔ یہ قلعہ رتن گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں فوجی محافظوں کے پاس تھا۔قلعہ کی عمارت مغلیہ طرزِ تعمیر پر مبنی ہے۔1783ء میں چمبہ کی فوجوں نے بھدرواہ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور بھوپ چند آلہ کار بنا اور مقامی راجہ فتح پال اور اُس کے بیٹے دیا پال نے مزاحمت نہ کی۔1773ء میں چمبہ کے راجہ نے قلعہ کی مرمت کر کے اسے نئے انداز میں استوار کیا۔

1782ء کے ایک خط میں بھدرواہ کے راجہ فتح پال نے چمبہ کے راجہ راج سنگھ

کی فرمان روائی قبول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر بھوپ چند نے نومبر 1872ء میں بھدرواہ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ 1783ء میں ایک معاہدہ کے تحت بھدرواہ کا راجواڑہ مکمل طور پر چمبہ کے دائرہ اثر میں آ گیا۔ لیکن 1805ء میں کشتواڑ کے راجہ محمد تیغ سنگھ نے بھدرواہ پر فوج کشی کر کے اسے فتح کیا تھا۔ بقول عشرت کشتواڑی:

''لوگ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے اور قلعہ بھدرواہ کو نذر آتش کر دیا گیا، جس سے قلعہ کو بہت نقصان پہنچا۔ بعد میں وزیر رتنو نے اُس کی مرمت کی اور قلعہ کو قابلِ استعمال بنا دیا۔ 1821ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر دلیہ سنگھ نے بھدرواہ پر چڑھائی کی اور بھدرواہ کا قلعہ وزیر رتنو سے حاصل کیا جو کافی عرصہ سے سکھوں کی تحویل میں تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے بھدرواہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تحت رہا بعد میں چمبہ کے حکمران نے رہیلو کا قلعہ سکھوں کو دیا جس کے بدلے میں بھدرواہ کی حکمرانی چمبہ والوں کے ہاتھ آئی اور پھر ایک سند کے ذریعے بھدرواہ والی چمبہ کی تحویل میں آ گیا۔ آگے چل کر 20/اکتوبر 1827ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے بھدرواہ کو اپنی ریاست جموں میں شامل کرلیا۔ 1846ء کے بعد بھدرواہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ بن گیا اور بھدرواہ کی انفرادی حیثیت ختم کر کے اُسے صوبہ جموں میں ملا دیا اور قلعہ بھدرواہ ڈوگرہ فوج کی چھاونی اور جیل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ قلعہ کے اندر مہا کالی کا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ مغربی حصہ میں ایک بڑا تالاب ہوا کرتا تھا۔ غلام نبی آزاد سابق وزیر اعلیٰ جموں کشمیر نے قلعہ بھدرواہ کو محکمہ آثار قدیمہ کے تحت لانے کا فیصلہ کیا تھا اور قلعہ میں واقع ڈسٹرکٹ جیل کو کہیں منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ بھدرواہ ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے قلعہ کی بحالی کے لیے تین کروڑ روپے مختص کیے ہیں اور اسے ثقافتی وراثت کے طور پر محفوظ کرنے کے لیے انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچرل ہیری ٹیج دہلی کے ماہرین کی خدمات طلب کی گئی ہیں تاکہ یہ قلعہ پہاڑی کلچر کا ایک اہم ثقافتی مرکز بن کر اُبھر سکے۔''

بھدرواہ بسوہلی روڑ پر قلعہ کے بالائی حصے سے ایک کشادہ سڑک تعمیر کی گئی ہے۔

جس کے باعث اب قلعہ کے علاوہ وادی بھدرواہ کے قدرتی مناظر دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔

قلعہ بھدرواہ کے علاوہ قلعہ مرمت گلیاں، قلعہ بھیلا، قلعہ جنگواڑ وغیرہ اہم پرانے قلعے ہیں جو اس علاقے کے عہدِ رفتہ کے تاریخی پس منظر اور ثقافت کی علامت مانے جاتے ہیں۔

رام بن میں کُل دیوتاؤں کی یاترا

ضلع رام بن کے علاقے میں تقریباً ہر گاؤں میں لوگوں کا اپنا کُل دیوتا ہوتا ہے، جس کی وہ پوجا کرتے ہیں۔ سال میں ایک بار عقیدت مند جولائی کے مہینے میں ہر گاؤں سے اپنے دیوتاؤں کی یاترا نکالتے ہیں۔ اس یاترا کو راجہ سنگھ پال کے مندر سردھار میں لے جاتے ہیں جو بٹوت کے مشرق میں چناب کی دوسری جانب واقع ہے۔ راجہ سنگھ پال کے مندر میں ان تمام دیوتاؤں کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ عقیدت مندوں کا ماننا ہے کہ گاؤں کے یہ دیوتا راجہ سنگھ پال کے مندر میں آپس میں ملتے ہیں اور عقیدت مندوں پر خوش ہو کر اُن کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔

جہاں رام بن شہر میں کھوناتھ مندر اور جامع مسجد قائم ہیں وہیں بٹوت میں جامع مسجد اور مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد کے دو مندر موجود ہیں۔ اُدھر 1947ء کے واقعات کے بعد کچھ سکھ رفیوجی خاندان بٹوت میں آباد ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے دو خوبصورت ترین گورودوارے یعنی گورودوارہ سنگھ سبھا اور گورودوارہ بھائی روچا سنگھ تعمیر کیے ہیں۔ اسی طرح ضلع ڈوڈہ میں بڑی جامع مسجد اور حضرت شاہ فریدالدین کی یادگار کے علاوہ علاقہ بھر میں مساجد اور آستانوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیبی ورثہ ہماری پہچان اور شناخت ہے۔

......☆......

آثارِ قدیمہ

آثارِقدیمہ

امبراں

تقریباً ستر برس قبل اکھنور کے قریب گاؤں انباراں کے کسانوں نے اپنے کھیتوں میں پکائی ہوئی مٹی کی کچھ مورتیاں برآمد کی۔ مقامی لوگ انہیں بچوں کو کھیلنے کے لیے دینے لگے۔ اس طرح بہت سی مورتیاں ضائع ہوگئیں۔ جو نمونے بچ گئے انہیں بعد میں لاہور میوزیم میں بھیجا گیا۔ مرحوم ڈاکٹر فابری نے مارچ 1955ء کے ''مارگ'' رسالہ میں انباراں کے ہسٹری کوٹا مٹی کی مورتیوں پر ایک مقالہ لکھا تھا اور اِن مورتیوں کی خوب داد دی تھی اور اُن کی تاریخ 700ء سے 730ء کے درمیاں متعین کی۔ اُنھوں نے بگڑی ہوئی مورتیوں کی کچھ تصویریں بھی لیں جس سے اُس عہد کے فنِ بت تراشی کے حسن و جمال کی تصویر سامنے آتی ہے۔ فابری نے انباراں کے نمونوں کا موازنہ ہاروَن کے فنی نمونوں کے ساتھ کیا ہے۔

دریائے چناب کے کنارے انباراں اور اکھنور میں یونانی اثر واضح طور سے ملتا ہے۔ یہ گاندھارا طرز کی مورتی کلا ہے۔ 1949ء میں جب فوج یہاں خندقیں کھود رہی تھی تو انہیں فنِ بت تراشی کے کچھ اور نمونے ہاتھ لگے۔ یہ نمونے ڈوگرہ سنتھا کی طرف سے لگائی گئی نمائش میں رکھے گئے تھے۔ شوتری کی مورتی اور تری مورتی سورج دیوتا کی ملی ہے اور شو اور پاروتی کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں بھی ملی ہیں۔ ایک مورتی میں برہما کے چہرے کے بیچ شو کی مورتی بھی بنائی گئی ہے۔

بھُوتی

بھُوتی اُودہمپور سے چھ میل میں شمال میں دھار لدھا کے دامن میں واقع ہے۔ بھُوتی ریاست کی راج دھانی کرمچی ہوتی تھی جہاں عہدِ قدیم میں ایک خوبصورت مندروں والا شہر آباد تھا۔ اس شہر کا اصلی نام کیچک تھا جو آگے چل کر کرمچی ہوگیا۔ آج کل کرمچی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ دیوی ندی کے کنارے پر آباد اس گاؤں میں عہدِ قدیم کے چار مندروں اور دوسری عمارات کے کھنڈر اس بات کے غماز ہیں کہ عہدِ رفتہ میں کرمچی اعلیٰ تہذیب وتمدن کا مرکز تھا۔ آج بھی یہاں کے پرانے مندر قابلِ دید ہیں۔ یہاں ایک قلعہ کے آثار بھی موجود ہیں۔

اُودہم پور

اُودہم پور اُسی علاقے کا نام ہے جسے عہدِ قدیم میں ریاست بھوتی کہا جاتا تھا۔ معاہدہ امرت سر کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ جب جموں کشمیر کے مہاراجہ بنے تو اُس زمانہ میں اُودہم پور قصبے والی جگہ وسیع جھاڑی دار جنگلات پر مشتمل تھی اور مہاراجہ کے بڑے بیٹے اودہم سنگھ اکثر شکار کھیلنے یہاں آیا کرتے تھے۔ پھر اودہم سنگھ کو اس علاقے سے اتنا لگاؤ ہوا کہ انھوں نے یہاں اودہم پور قصبہ آباد کرایا۔ آگے چل کر جموں سری نگر سڑک تعمیر ہوئی تو اودہم قصبہ اس سڑک پر واقع ہوگیا۔ لوگ بھوتی قصبے اور علاقے کو بھول گئے اور روزی روٹی کی تلاش میں یہاں آ گئے۔ بعد میں بھوتی قصبہ کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا اور اُودہم شہر بن کر ابھرنے لگا۔ آج کل یہ قصبہ جموں شہر کے بعد سب سے اہم ہے اور ڈوگرہ تہذیب وتمدن کا مرکز بھی ہے۔

کرمچی

اُودہم پور کے شمال مغرب میں چار میل کے فاصلہ پر کرمچی واقع ہے۔ یہ علاقہ پہاڑوں کی آغوش میں پڑتا ہے۔اس کے قریب ہی ایک ٹیلہ ہے جس کی چوٹی پر قلعے کے کھنڈرات ملتے ہیں اور یہاں تین قدیم مندر بھی واقع ہیں۔ایک مندر کھنڈر بن چکا ہے جو اڑیسہ کے کونارک مندروں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔مرکزی مندر دائیں اور بائیں والے مندروں سے تھوڑا مختلف ہے اور بھونیشور کی فن عمارت سازی سے ملتا ہے۔جبکہ تیسرا مندر پہلے مندر جیسا ہی ہے جہاں بت تراشی کے نمونے رکھے گئی ہیں جن میں گنیش شوا اور شوتری کی مورتیاں قابلِ ذکر ہیں۔

اودہم پور سے پہلے کرمچی ایک ریاست ہوتی تھی اور کرمچی ایک قصبہ ہوتا تھا جو جموں سے سری نگر جانے والے قدیم راستے پر پڑتا تھا۔ یہاں کشمیر جانے اور آنے والے لوگ پڑاؤ ڈالتے تھے اور خوب رونق ہوا کرتی تھی۔

1826ء میں گلاب سنگھ جب جموں کشمیر کے مہاراجہ بنے تو اُن کے بیٹے میاں اودہم سنگھ موجودہ اودہم پور کے مقام پر شکار کھیلنے آتے تھے۔ پھر اُنھوں نے یہاں ایک قصبہ آباد کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام میاں اُودہم سنگھ کے نام اُودہم پور تھا۔آگے چل کر جب جموں اور سری نگر کے درمیاں گاڑیوں کے لیے سڑک تعمیر ہوئی تو اُودہم پور نے کرمچی کی جگہ لے لی۔ پھر دھیرے دھیرے کرمچی قصبہ کے مکین دوکاندار اور کسب دار روزی روٹی کی تلاش میں اُودہم پور آگے اور کرمچی قصبہ عہدِ رفتہ کی یادگار بن گیا۔

جسروٹہ

آج کل کٹھوعہ شہر جس جگہ قائم ہے اُسے پرانے زمانہ میں کتھوئی Kathaoi کہا جاتا تھا، جس کا ذکر سکندر کے ساتھ آنے والے تاریخ دانوں نے اپنے سفرناموں میں

کیا ہے۔ راوی کے کنارے کٹھوئی شہر اور بسوہلی کے عوام نے اپنے جنگی معرکوں سے سکندر اعظم کی مہم کو روک دیا تھا وہیں سکندر کو یہاں سے واپس یونان جانے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ عوام کی رائے ہے کہ راوی کے کنارے کٹھوعہ اور بسوہلی کے ہی وہ علاقے تھے جنھیں کٹھوئی کہا جاتا تھا جو وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے کٹھوعہ ہو گیا۔ عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ اندوترا راجپوت خاندان کے سرکردہ جودھ سنگھ آج سے دو ہزار برس قبل کٹھوعہ آ کر آباد ہوئے اور اُنھوں نے یہاں محلات بنوائے تھے۔

جسروٹہ کے کھنڈر

تاریخِ ڈوگرہ دیس کے مطابق جموں کے راجہ جس دیو نے 1019ء میں جموں سے 25 میل مشرق میں دریائے اوجھ کے کنارے اپنے نام پر ایک لنگر آباد کیا تھا جس کا نام جسروٹہ رکھا تھا، جس کی سرحد دریائے راوی تک تھی (یعنی جس میں موجودہ کٹھوعہ قصبہ بھی شامل تھا) پھر جسروٹہ علاقے میں رہنے والے لوگ اپنی شناخت کے لیے جسروٹیہ کہلانے لگے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں مہاراجہ نے جسروٹہ علاقہ کو جاگیر کے طور پر اپنے وزیر اعظم دھان سنگھ کے بیٹے راجہ ہیرا سنگھ کو دیا تھا۔ یہ 1834ء کا واقعہ ہے۔ راجہ ہیرا سنگھ نے مقامی جاگیردار بھوری مل کو کچھ نقد رقم دے کر فارغ کر دیا اور خود جسروٹہ کا حکمران بن گیا۔ راجہ ہیرا سنگھ نے جسروٹہ کے مقام پر محلات اور دفاتر تعمیر کرائے اور وزیر بچنا کو تھانے دار تعینات کیا لیکن بعد میں راجہ ہیرا سنگھ پنجاب میں قتل ہو گیا اور یہ علاقہ گلاب سنگھ کے تصرف میں آیا۔ 1846ء میں جب گلاب سنگھ ریاست جموں و کشمیر کا مہاراجہ بنا، تو اُنھوں نے جسروٹہ ریاست کو ختم کر کے موجودہ کٹھوعہ کو فروغ دیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جسروٹہ سے دربار کو کٹھوعہ منتقل کر دیا اور جسروٹہ کا شہر بربادی کی طرف گامزن ہو گیا۔
جسروٹہ، جہاں کشمیری شال بافوں کے سینکڑوں گھرانے تھے، کام بند ہونے کے

باعث دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ قصبہ جو تجارت کا مرکز تھا، جہاں ڈوگرہ فوج کا برگیڈ قیام کرتا تھا، جہاں بازار میں چار سو رونق ہوا کرتی تھی سب ختم ہوگئی اور لوگوں نے نئے قصبہ کٹھوعہ میں منتقل ہونا شروع کر دیا۔ پھر دھیرے دھیرے وقت کی آندھی نے جسر وٹہ کو پوری طرح پامال کر دیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں جب جسر وٹہ ویران ہو چکا تھا اور شاہی قافلے کی تمام بہاریں کٹھوعہ منتقل ہوگئی تھیں اور جسر وٹہ کے محل، قلعے، شہر، بازار سب ویران ہو چکے تھے تو جو باقی کسر تھی مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے پوری کر دی جب 1932ء میں اُنھوں نے ایک حکم صادر فرمایا جس کے تحت جسر وٹہ کے محلات حویلیوں اور بازاروں میں لگی لکڑی کے دروازے اور دوسرا سامان نیلام کرا دیا۔ تمام عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں۔ جسر وٹہ کے کھنڈر کھٹوعہ سے 15 ر کلومیٹر کے فاصلے پر آج بھی موجود ہیں اور عہدِ رفتہ کی ایک خوشحال تہذیب وتمدن کی نشاندہی کرتے ہیں۔

......☆......

صوبۂ جموں میں
بدھ تہذیب وتمدن کی علامات

گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا ہے کہ 517 قبل مسیح میں یونان کے بادشاہ دارا اوّل نے یونانی جرنیل سکالیکس کی زیرِ سرکردگی ایک مہم ہندوستان بھیجی تھی جو جموں کے دریائے چندر بھگا کے ساتھ والی آبادیوں میں بھی آئی تھی۔ 326 ق م میں سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ابھیسار پونچھ کے راجہ نے سکندر سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن سکندر کی فوجیں جب راوی کے کنارے پہنچیں تو اُس کا مقابلہ کیتھی اولی (کٹھوعہ) کے قبائل سے ہوا، جنہوں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ بالآخر اسی علاقے سے سکندر کو اپنی مہم ختم کرنا پڑی تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں پنجاب کے یونانی بادشاہ میندر کا مناظرہ جموں کے علاقے میں بدھ عالم ناگ سین سے ہوا تھا جس کے بعد اُس نے بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ 141 ق م میں شہنشاہ کنشک چوتھی بُدھ کانفرنس میں شرکت کے لیے ''شاردا'' جاتے ہوئے علاقہ راجوری سے گزرا تھا اور یہاں اُس نے اپنی یادگار کے طور پر ایک مذہبی درگاہ تعمیر کی تھی جسے آج کل ویر بھدر یشور کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ استھان راجوری شہر سے 55 کلومیٹر جنوب میں پیر بڈیسر پہاڑ پر قائم ہے۔ ہیون سانگ ساتویں صدی عیسوی میں علاقہ پونچھ سے گزرا تھا، وہ اپنی کتاب ''ٹریولوگ آف یانگ سو'' میں لکھتا ہے کہ پونچھ شہر کے شمال میں پانچ بدھ ویہار تھے جو اپنے معجزوں کے لیے مشہور تھے۔ جموں کے نزدیک اکھنور سے تیس میل شمال میں امبھاراں کے بدھ آثار، راجوری علاقہ میں بدھل شہر، بدھل پیر پہاڑ، بدھ گنگاری گاؤں پونچھ میں لوہر دیوتا کے مقام پر یونانی اثرات والی بدھ کی مورتیوں کا دستیاب ہونا اور آج بھی اس مقام پر بدھ پورنما کے دن میلہ لگنا اس بات کا غماز ہے کہ یہاں یونانی اور بدھ تہذیب وتمدن کے اثرات آج بھی موجود ہیں جس کے لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔

جموں کے ایک محقق جیوتیشور پتھک اپنے ایک مضمون ''جموں کی پہاڑی تہذیب

اور یونانی بدھ اثرات'' میں لکھتے ہیں کہ سکندر کے ساتھ آنے والے مورخین دیوڈرس اور سٹریبو کے سفر ناموں میں راجوری، پونچھ اور چناب وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ مکرنڈل نے اپنی کتاب Alexandar The Great میں جموں کی پہاڑی ریاستوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ سکندر کے عہد میں پنجاب کے گرد و پیش میں دو ریاستوں یعنی ہزارہ اور ابھیسارہ کا ذکر ملتا ہے۔ ''ہزارہ'' جس کی حدیں ابھیسار کی مملکت سے ملتی تھیں اور جہاں کا راجہ پورس تھا جبکہ ابھیسار کے راجہ کا نام ابھیساری ہی لکھا ہے جس کا علاقہ دریائے جہلم اور پنجاب کے پہاڑی خطے پر مشتمل ہے جو آج کے پونچھ، راجوری، کوٹلی میر پور اور دان گلے بمبھر تک پھیلا ہوا ہے۔ یونانی مورخوں نے اس علاقہ کو گلا سائی لکھا ہے۔ یونانی مورخوں نے یہاں کے دریاؤں کے نام بھی الگ الگ رکھے ہیں۔ جیسے جہلم کو (Hydespes) اور چناب کو Askini لکھا ہے۔ اسی طرح راوی اور ستلج کے نام بھی مختلف لکھے ہیں۔ ان سفر ناموں کے مطابق سکندر نے دریائے جہلم کو جلال آباد کے قریب عبور کیا تھا۔ جہاں اُس کا اپنا گھوڑا مارا گیا تھا اور جس کی یاد میں سکندر نے ایک یادگار تعمیر کرائی تھی۔ پورس کی مملکت جہلم اور چناب کے درمیان میدانی علاقوں پر مشتمل تھی جبکہ ابھیساریوں کی حکومت پہاڑی علاقوں پر قائم تھی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ کوکری کا میدان جہاں سکندر اور پورس کا مقابلہ ہوا علاقہ بمبھر تھا۔ مکرنڈل اپنی کتاب ''انویژن آف انڈیا'' میں ابھیسار کو گلا سائی مملکت لکھتے ہیں جو ایک خوشحال ریاست تھی جہاں چھوٹے بڑے 37 قصبے آباد تھے اور چھوٹے سے چھوٹے قصبے کی آبادی پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔

دریائے چناب کو عبور کرنے کے بعد سکندر کی فوجیں راوی کے کنارے جا پہنچیں جہاں سانگل (سیال کوٹ) ایک بڑا شہر آباد تھا۔ سکندر کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد سیالکوٹ اور گرد و نواح کے علاقوں پر یونانی راجے حکومت کرتے رہے۔ یہ لوگ کچھ عرصہ یونانی رہے بعد میں ان کا رابطہ مرکز سے ٹوٹ گیا چونکہ اُس زمانہ میں اس سارے علاقہ میں بدھ مت کو عروج حاصل تھا، اس لیے ان یونانی راجاؤں نے دھیرے دھیرے

بدھ مت قبول کرلیا۔

مرکزی محکمہ اطلاعات ونشریات کی جانب سے ایک کتاب ''بدھ مت کے 2500 سال'' انگریزی میں شایع ہوئی۔اس کتاب میں ایک یونانی راجے منیندر کا ذکر ہے جس کی حکومت پنجاب میں تھی۔ یہ راجہ یونانی تھا لیکن اسے مقامی مذہب یعنی بدھ مت کے بارے میں بڑا تجسس تھا لیکن کوئی بھی بدھ عالم اِسے دلیل اور دعویٰ سے قائل نہیں کر پا رہا تھا۔ایک دن اُس راجہ کی ملاقات بدھ بھکشو ناگ سین سے ہوئی۔ دونوں کا بدھ مت کے بارے میں مناظرہ ہوا جس میں ناگ سین نے منیندر کو قائل کر دیا اور وہ بدھ مت کا پیرو کار ہوگیا۔ ناگ سین کشتواڑ کا رہنے والا تھا۔ پروفیسر محی الدین حاجنی اور عشرتؔ کاشمیری کی رائے ہے کہ اس مناظرے کو بنیاد بنا کر کتاب ملیند ہ پنہا لکھی گئی تھی اور یہ کتاب کشتواڑی زبان میں تھی لیکن اس کتاب کا اصل نسخہ اب دستیاب نہیں البتہ اس کے پالی اور پراکرت میں تراجم ملتے ہیں۔

ریاست کے کچھ تاریخ دان یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ منیندر اور ناگ سین کے درمیان مناظرہ ضلع پونچھ کے علاقہ مینڈر میں ہوا تھا اور بدھ مذہب قبول کرنے کے بعد مینندر نے مناظرہ والی جگہ ایک ویہار قائم کیا تھا جس کا نام مینندر ویہار تھا جو بعد میں پورے علاقے کا نام ہوگیا جو وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے منیندر سے مینڈر ہوگیا۔

علاقہ مینڈر اور وادی پونچھ کے درمیان واقع کرشنا گھاٹی پہاڑ پر علاقہ مینڈر کی طرف لوہر دیوتا کا استھان ہے۔اس مقام کے 100 رفٹ اوپر ٹیلے پر یونانی فنِ تعمیر کے آثار ملتے ہیں جہاں بڑے بڑے تراشیدہ پتھر موجود ہیں جن پر یونانی فن اور آرٹ کی جھلک ملتی ہے۔لوہر دیوتا کے استھان پر ایک بڑی باولی ہے البتہ پرانی مورتی کوئی نہیں ملتی۔ لوہر دیوتا استھان پر ایک کتبہ نما لمبا تراشیدہ ستون مِلتا ہے جس پر مہاتما بدھ کا چہرہ بڑی خوبصوتی کے ساتھ تراشا گیا ہے۔ ہندومت میں لوہر نام کا کوئی دیوتا نہیں ہے۔ البتہ سارے علاقے میں یہ مشہور ہے کہ یہ آثار سکندر کے حملہ کے زمانہ کے ہیں، جب یہاں

ایک مذہبی زیارت گاہ ہوتی تھی۔ مزے دار بات یہ ہے کہ لوہر دیوتا کو صدیوں سے یہاں کی مقامی ہندو آبادی اپنے دیوتا کی طرح پوجتی اور مانتی چلی آرہی ہے۔ یہاں سال میں ایک بار بدھ پورنما کے دن میلہ لگتا ہے جس میں شرکت کے لیے دُور دُور سے عقیدت مند یہاں آتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پہاڑ کے اوپر بنی ہوئی زیارت گاہ یونانی فنِ تعمیر کے آثار، پتھر کے ستون پر بدھ کی مورتی اور بدھ پورنما کے روز میلے کا انعقاد اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ مقام یونانی راجاؤں نے بدھ مت اختیار کرنے کے بعد تعمیر کرایا تھا۔ کیونکہ تراشیدہ پتھروں سے یونانی فنِ تعمیر واضح ہے۔ عین ممکن ہے کہ منیندر نے ناگ سین سے مناظرہ کے بعد جہاں علاقے کا نام میندر رکھا وہیں وادی مینڈر کی شمال مغربی پہاڑی چوٹی پر کوئی متبرک استھان اور قلعہ قائم کیا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ کوئی یونانی جرنیل تھا جس نے لوہر دیوتا کا استھان مینڈر اور منڈی علاقے میں لوہر کوٹ کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ ادھر علاقہ پونچھ کے اجوٹ گاؤں میں بھی پرانے کھنڈرات، آثار اور پرانے وقت کی اینٹیں اور تراشیدہ ستون نما پتھروں پر نقش اور بُت ملتے ہیں جن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈیودرس اور سٹریبو نے جن 37 شہروں کا ابھیسار میں ذکر کیا تھا اُن میں پونچھ کے یہ پرانے کھنڈروں والا شہر بھی شامل ہو۔

اکھنور کے قریب انباراں کے مقام پر 1930ء کے آس پاس محکمۂ آثار قدیمہ کو کچھ مورتیاں دستیاب ہوئی تھیں۔ مٹی کی بنی ہوئی ان مورتیوں کی بنیاد پر چارلیس فری نے رسالہ مارگ (مارچ 1955) میں ایک مقالہ تصنیف کیا تھا جس میں ٹراکوٹاز کی مورتیوں کی تاریخی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فری کے مطابق یہ نمونے 700 سے لے کر 730 عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مورتیوں پر یونانی اثرات کی گہری چھاپ ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ کشمیر سے ہوتے ہوئے علاقہ پونچھ راجوری سے گزرا تھا۔ وہ پونچھ کے بارے میں اپنے سفرنامہ ٹریولز آف یانگ سُو میں لکھتا ہے کہ یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ گندم اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے اور گنے کی

پیداوار ہوتی ہے۔ یہ علاقہ مملکت کشمیر کا حصہ ہے اور یہاں پانچ بدھ ویہار ہیں جن میں سے ایک ویہار اپنے معجزوں سے سارے علاقے میں مشہور ہے۔ سی۔ پی باپٹ کی کتاب ''بدھ مت کے 2500 برس'' میں درج ہے کہ منیندر نے ناگ سین کے ساتھ مناظرہ کی یاد میں ایک بدھ ویہار تعمیر کرایا تھا۔

لیکن اس کا محل وقوع درج نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ منیندر ویہار موجودہ لوہر دیوتا سے سوگز اوپر پہاڑی چوٹی پر تعمیر کرایا ہو۔ کیونکہ ویہار اور گنپے پہاڑی چوٹیوں پر ہی تعمیر ہوتے تھے اور ہیون سانگ نے علاقہ پونچھ میں جن ویہاروں کا ذکر کیا ہے بلند چوٹی پر قائم قدیم زیارت گاہ اُن میں سے ایک ہوسکتی ہے۔

بدھ مت کے تمدنی اثرات آج بھی کسی نہ کسی صورت میں سانس لے رہے ہیں۔ بدھ پورنما کے دن لوہر دیوتا کے مقام پر میلہ، گانی چوٹی سے بدھ مورتی کا دستیاب ہونا۔ درگاہوں اور زیارتوں کے قریب درختوں پر اُس طرح جھنڈے لگنا جیسے لداخ میں ویہاروں کے قریب درختوں پر لہرائے جاتے ہیں عہدِ رفتہ کی تمدنی وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

......☆......

انگریزی مآخذ:

1. A Comphrehensive History of India, by: K. A. Neelkanth
2. Alexander, by: Arjun Dav Malik
3. Antiquites of Bhimber and Rajouri, by R. C. Kak
4. Cultural History of Doda, by: M. L. Aash
5. Focus on J&K, by: Aseer Kishtwari
6. Gujjar of Jammu & Kashmir, by K. Warikoo
7. Gujjar Tribe of Jammu & Kashmir, by Dr. Javid Rahi
8. History of Jammu & Kashmir, by M. L. Kapoor
9. Astadhyayi by Panini
10. Jammu Muslims, by Zaffar Chowdhary
11. Jammu & Kashmir, by Som Nath Dhar
12. Jammu Raj, by Sukhdav Sing Charak
13. Jammu & Kashmir Territotries, by Fredrick Drew
14. Jammu and Kashmir 2001, Edited by K. D. Jamywal
15. Jammu Shrines and Piligramges, by Janki Nath Ganhar
16. Kashmir : Cultural Heritage, by Kaumudi
17. Kashmir : Heritage Tourism, by Iqbal Ahmad
18. Poonch-The Battle Field of Kashmir, by K. D. Maini
19. Pir Panchal Region, History and Culture, by K. D. Maini
20. The Northern Barrier of India, by Fredrick Drew
21. The Gazatter of Kashmir, by C. E. Bats.
22. The Beautiful India, by Sukh Dev Singh Chib.
23. Travelogne of Youngh Sn, by Huien Tsang.
24. 2500 Years of Budhism, by P.V. Bapath.

اردو ماخذات

۱۔ بھدرواہ......تاریخ وثقافت: بشیر بھدرواہی

۲۔ پہاڑی قبائل: کے۔ڈی۔مینی

۳۔ پونچھ کی تہذیب وثقافت: ڈاکٹر صغیر خان

۴۔ پونچھ......تاریخ وثقافت کے آئینے میں: کے۔ڈی۔مینی

۵۔ تصویرِ ضلع ڈوڈہ: اسیر کشتواڑی

۶۔ تاریخِ کشتواڑ: عشرت کشمیری

۷۔ تاریخ اولیا جموں وکشمیر۔ اسیر کشتواڑی

۸۔ تاریخ ڈوگرہ دیس: نرسنگھ داس نرگس

۹۔ تاریخ کشمیر: محمدالدین فوق

۱۰۔ تاریخِ چبال: اومکار سنگھ چپ

۱۱۔ تاریخ لکھڑاں: محمد یعقوب خان

۱۲۔ تاریخ راجوار: مرزا ظفراللہ خان

۱۳۔ تاریخ اقوامِ پونچھ: محمدالدین فوق

۱۴۔ تاریخ گوجری ادب: رام پرساد کھٹانہ

۱۵۔ تاریخ راجوری: کے۔ڈی۔ مینی

۱۶۔ تاریخ راجگانِ جموں وکشمیر: ٹھاکر کاہن سنگھ بلوریہ

۱۷۔ جموں وکشمیر کے قبائل اوران کی زبانیں: ڈاکٹر جاوید راہی

۱۸۔ تاریخ گجر: علی حسن چوہان

۱۹۔ ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ۔ لکشمی نارائین/سنسار چند، مرتب نیلامبر دیو شرما

۲۰۔ سیف الملوک: میاں محمد بخش

۲۱۔ راج ترنگنی۔ مترجم: ٹھاکر اچھر چند

۲۲۔ گوجری لوک گیت: پروفیسر رام ناتھ شاستری

......☆......